



سوسائٹی

OCTOBER
2012

سوسائٹی

ماڈل: مہوش آفتاب
سٹائل: اپ: روز چوٹی پار
فوتو گرافی: موسیٰ رضا

www.paksociety.com

ملاقات

نگہت اکرم ۲۶

زینب ارشد

سلسلے وار ناول

رگ جاں سے جو قریب تھے صالحہ محمود ۳۲
کبھی عشق ہو تو پتہ چلے شازیہ مصطفیٰ عمران ۹۰
بند قبا کھلنے لگی سعدیہ عابد ۱۲۸

سانس، سُرک اور سکوت نائلہ طارق ۱۶۸

مکمل ناول

طلسمی چاندنی راتیں لبنی عبید ۷۰
محبت ساتھ ہوتی ہے تبسم فیاض ۱۳۰

افسانے

اس دل میں بے ہوشم انعم خان ۱۹۲ آگہی
تمہارے بن نہیں رہنا عابدہ سین ۱۰۶
دلوں کے ملن قمرش شہک ۴۶
اسے کہنا
تم ہی تک فاصلے فرح ناز رفیق ۱۶۳
عائشہ ذوالفقار ۱۸۲
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم سحر انجم ۲۰۶
ذمے دار کون ریمانا نور رضوان ۳۰

اکتوبر 2012ء

جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 1۰

قیمت 50 روپے

ذریعہ سالانہ بذریعہ رجسٹری

600 روپے



34535726

پبلشر و ایڈیٹر صالحہ محمود نے ٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ ڈی بلاک 2- پی-ای-سی-ایچ-سوسائٹی، کراچی

انتباہ:-

ماہ نامہ ”رودا“ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل یا ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلے وار کسی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف آئی آر درج کراوے گا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ ”رودا“ پبلیکیشن۔

مستقل سلسلے

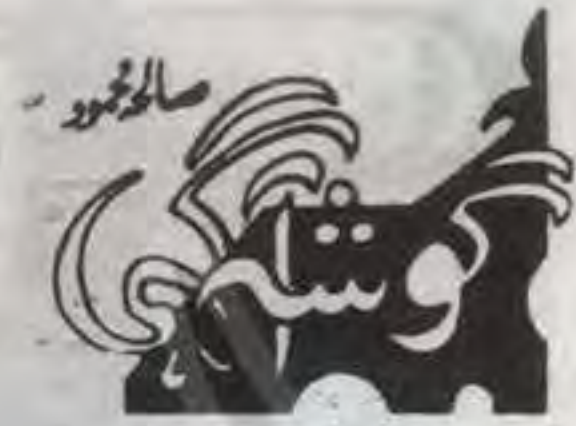
روائے جنت
روا کی ڈائری
ذرا پھر سے کہنا
خوشبو
اس ماہ میں

صالحہ محمود ۲۳ سندیلے
صدف سعد ۲۱۵ کچن
شہلا مشائق ۲۲۵ سنگھار
نورین ملک ۲۲۱ اشعار
نورین ملک ۲۱۸ گوشہ چشم

صالحہ محمود ۲۳۱
ثریا اقبال ۲۳۸
شہلا مشائق ۲۴۰
ادارہ ۲۱۷
ادارہ ۲۳۵
ادارہ ۲۳۶

دوستوں کے نام





چشم گریاں سے کبھی لہو پڑکا تو وہیں کہیں رب نے انسان کے دامن کو پھولوں سے بھر دیا، پھول اور شجر کی آبیاری سے انسان اپنی تخلیق کے بارے میں بہتر جان سکتا ہے۔ لال و گوہر بننے کے عمل میں بڑی جانکنی کے عذاب سے بھی گزرنا پڑتا ہے، تبھی جا کر سرسبز و شاداب مٹی سے خوشبودار پھولوں کی خوشبو آتی ہے، خوشبو کے رنگ پیراہن میں ہواؤں کی سرسراہٹ نجانے کتنی بارشوں کا خمار ہوتا ہے، دیئے آنکھوں میں جلتے ہیں، کہکشاں ماتھے پر اتر آتی ہے، جب زندگی کی تخلیق ہوتی ہے، محبتوں کے سفر میں در سفر ہوتا ہے، یہی ایک سلسلہ ازل سے ابد تک ہے اور یہی سلسلہ ابد تک پھیلتا جاتا ہے، انسان کی تخلیق کا مقصد اپنے رب کے رنگ میں رنگ جانا ہے، مگر انسانی تخلیق میں روشنیوں کا سفر بھی ہے۔ وہ روشنی جو محبت کی لو، ہونٹوں کی مٹھاس اور آنکھوں کی نمی میں محسوس ہوتی ہے۔ ماں کی محبتوں میں اترنے والا پھولوں کا رنگ پھولوں کی آبیاری میں خوشبوؤں کا بھر جانا، کسی بھی آنگن کو آباد کرتا ہے۔ زندگی پلٹ کر ہر موسم میں آواز دیتی ہے، یہ آواز پھیلے ہوئے سمندر کی طرح ایک ماں کا عکس ہوتا ہے، وہ عکس جس کو ہونٹوں نے چھوا ہو، وہ عکس جو بانہوں میں چھپا ہو، یا تلی کی طرح ہواؤں میں اڑتا ہو عکس ماں کی آنکھوں میں بیٹی کا عکس ہوتا ہے۔ خوشبو اور چاہتوں میں پھر ایک ماں آنکھوں کے آنسو پونچھ کر اپنی بیٹی کو رخصت کر دیتی ہے، یہ روشنیوں کا سفر ہے، سفر در سفر پھیلنے والا سلسلہ۔ کل میری ماں نے مجھے اپنے ہونٹوں سے چوما ہوگا، آج میں اس کی جگہ کل کوئی اور ہوگا، یہ محبتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سفر ہے، چاہتوں بھرا سفر، ایک بیٹی کا سائبان جس کے تلے وہ پرورش پاتی ہے، تعریف اُس رب العالمین کی جو کھلاتا ہے پھول کلیوں سے اور بناتا ہے جوڑے آسمانوں پر، وہ ذات اس بندھن کو سلامت رکھے (آمین)۔ جب آپ لوگوں کے ہاتھوں میں اکتوبر کا پرچہ ہوگا تو انشاء اللہ میری بیٹی ڈاکٹر عائشہ محمود اپنے گھر کی ہو جائے گی، بس یوں سمجھ لیں کہ پھولوں کی آبیاری میں، میں نے اپنی محبتوں کا رنگ بھر دیا ہے، خوشیوں سے وہ ہمکنار ہے، یہ محبتوں کا سفر یونہی جاری رہے۔

قارئین! رد اپڑھ کر سند یہ ضرور لکھیے گا کہ رد آپ کو کیسا لگا؟ نئے لکھنے والے رد آپ کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھیں، ہم انہیں موقع ضرور دیتے ہیں، تو آپ اپنا خیال رکھیے گا، ڈھیروں محبت کے ساتھ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔



حضرت عائشہ کا مشورہ

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ میں اپنا مال تجارت شام اور مصر لے جایا کرتا تھا ایک مرتبہ عراق لے جانے کا ارادہ کیا اور حضرت عائشہ سے مشورہ لینے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کو رزق کا کوئی سبب کسی طریقے پر بنادے تو اس کو نہ چھوڑے جب تک کہ وہ خود ہی نہ بدل جائے۔ مطلب یہ کہ جس سبب سے روزی ملتی ہے اسے مت چھوڑو۔ ہاں! اگر وہ خود ہی بدل جائے مثلاً حالات سازگار نہ رہیں مال میں نقصان ہونے لگے یا کوئی مجبوری پیش آئے تو اور بات ہے۔ (تبلیغی اور اصلاحی مضامین ص 246)

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا خاص واقعہ

حضرت عمر بن خطابؓ اپنے اسلام لانے سے پہلے کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کے پاس گیا۔ دیکھا کہ آپ مسجد حرام میں پہنچ گئے ہیں میں بھی گیا اور آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ آپ نے سورہ حاقہ شروع کی جسے سن کر مجھے اس کی پیاری نشست الفاظ اور بندش مضامین اور فصاحت و بلاغت پر تعجب آنے لگا۔ آخر میں میرے دل میں خیال آیا کہ قریش ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے۔ ابھی میں اسی خیال میں تھا کہ آپ نے یہ آیتیں تلاوت کیں۔

ترجمہ۔ یہ قول رسول کریم ﷺ کا ہے شاعر کا

نہیں تم میں ایمان ہی کم ہے۔ تو میں نے خیال کیا کہ اچھا! شاعر نہ سہی کاہن تو ضرور ہے ادھر آپ ﷺ کی تلاوت میں یہ آیت آئی..... ترجمہ یہ کاہن کا قول بھی نہیں ہے تم نے نصیحت ہی کم لی ہے اب آپ پڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ پوری سورت ختم کر لی۔ فرماتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے دل میں اسلام پوری طرح گھر کر گیا، اور روکھٹے روکھٹے میں اسلام کی سچائی گھس گئی۔ پس یہ بھی منجملہ اسباب تھے جو حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا باعث ہوئے۔ (تفسیر ابن کثیر 425/5)۔

امام بخاریؒ کا غصہ پی جانا

عبداللہ بن محمد صیادقؒ ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں امام بخاریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اندر سے آپ کی کنیز آئی اور تیزی سے نکل گئی، باؤں کی ٹھوکر سے راستے میں رکھی ہوئی روشنائی کی شیشی الٹ گئی، امام صاحب نے ذرا غصے سے فرمایا کیسے چلتی ہے؟ کنیز بولی۔ جب راستہ نہ ہو تو کیسے چلیں۔ امام صاحب یہ جواب سن کر انتہائی تحمل اور بردباری سے فرماتے ہیں۔ جائیں نے تجھے آزاد کیا۔

صیادق کہتے ہیں میں نے کہا اس نے تو آپ کو غصہ دلانے والی بات کہی تھی آپ نے اسے آزاد کر دیا؟ فرمایا اس نے جو کچھ کہا اور کیا میں نے اپنی طبیعت کو اسی پر آمادہ کر لیا۔ (ترجمہ صحیح بخاری از علامہ وحید الزماں صاحب ص 13)۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ ”اے ابن آدم! تجھے غصہ آئے تو اسے پی جا۔ مجھے تجھ پر غصہ آئے گا تو میں پی جاؤں گا۔“

بعض روایتوں میں ہے اے ابن آدم! اگر غصے کے وقت تو مجھے یاد رکھے گا، یعنی میرا حکم مان کر غصہ پی جائے گا تو میں بھی اپنے غصے کے وقت تجھے یاد رکھوں گا یعنی ہلاکت کے وقت تجھے ہلاکت سے بچاؤں گا۔ (تفسیر ابن کثیر اردو 457/1)

اللہ تعالیٰ کی مومن بندے سے عجیب سرگوشی
حضرت صفوان فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے مومن کی جو سرگوشی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے ہوگی اس کے بارے میں سنا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ رسالت مآب ﷺ سے میں نے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن کو اپنے قریب بلائے گا اور اپنا بازو اس پر رکھ دے گا اور لوگوں سے اسے پردے میں کر لے گا اور اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا اور پوچھے گا یاد ہے! فلاں گناہ تو نے کیا تھا؟ فلاں کیا تھا؟ یہ اقرار کرتا جائے گا اور دل دھڑک رہا ہوگا کہ اب ہلاک ہوا۔ اتنے میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا دیکھ! دنیا میں میں نے ان گناہوں کی پردہ پوشی کی اور ان گناہوں کو معاف کرتا ہوں۔ پھر اسے اس کی نیکیوں کا اعمال نامہ دیا جائے گا۔ (تفسیر ابن کثیر 382/1)

تین نجات دینے اور تین تباہ کرنے والی چیزیں
حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا، تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں تباہ کرنے والی ہیں..... نجانے دینے والی تین چیزیں..... 1- اللہ سے ڈرنا خلوت و جلوت میں۔ 2- حق بات کہنا خوشی و ناخوشی میں۔ 3- اور (خرج میں) میانہ روی اختیار کرنا، مالدار کی اور غریبی میں..... اور تباہ کرنے والی تین چیزیں یہ ہیں..... 1- خواہش نفس کی پیروی کرنا.....

2- حرص و بخل کرنا..... 3- گھمنڈ کرنا اور یہ تینوں میں سخت تر ہے۔ (مشکوٰۃ ص 434)۔

وہ کون سا درخت ہے جو مسلمان کے مشابہ ہے صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا، مجھے بتلا وہ کون سا درخت ہے جو مسلمان کے مشابہ ہے۔ جس کے پتے جھڑتے نہیں، نہ جاڑوں میں نہ گرمیوں میں جو اپنا پھل ہر موسم میں لاتا رہتا ہے..... عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں کہ وہ درخت کھجور کا ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ مجلس میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ ہیں۔ اور وہ خاموش ہیں تو میں بھی چپ رہا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، وہ کھجور کا درخت ہے۔ جب یہاں سے آپ ﷺ اٹھ کر چلے گئے تو میں نے اپنے والد (حضرت عمرؓ) سے یہ ذکر کیا تو آپ نے فرمایا، پیارے بیٹے! اگر تم یہ جواب دے دیتے تو مجھے تمام چیزوں کے مل جانے سے بھی زیادہ محبوب تھا۔ (ابن کثیر 66/3)

ہر کام میں اعتدال
ایک رات نبی کریم ﷺ کا گزر حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرف سے ہوا تو دیکھا کہ وہ پست آواز سے نماز پڑھ رہے تھے پھر حضرت عمرؓ کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا تو وہ اوپچی آواز سے نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے دونوں سے پوچھا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا، میں جس سے مصروف مناجات تھا وہ میری آواز سن رہا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا کہ میرا مقصد سوتوں کو جگانا اور شیطان کو بھاگانا تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے فرمایا کہ اپنی آواز کو قدرے بلند کرو اور حضرت عمر فاروقؓ سے کہا اپنی آواز کو کچھ پست رکھو۔ (تفسیر مسجد

نبوی صفحہ 798، تفسیر ابن کثیر سورۃ بنی اسرائیل آیت 110)۔

اناج ذخیرہ کرنے کا عذاب

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ مسجد سے نکلے تو اناج پھیلا ہوا دیکھا۔ پوچھا یہ غلہ کہاں سے آگیا۔ لوگوں نے کہا بکنے کے لئے آیا ہے۔ آپ نے دعا کی یا اللہ! اس میں برکت دے لوگوں نے کہا یہ غلہ گراں بھاؤ پر بیچنے کے لئے پہلے سے جمع کر لیا گیا تھا؟ پوچھا کس نے جمع کیا تھا؟ لوگوں نے کہا ایک تو فروغ نے اور دوسرے آپ کے آزاد کردہ غلام نے۔ آپ نے دونوں کو بلوایا اور فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ جواب دیا کہ ہم اپنے مالوں سے خریدتے ہیں لہذا جب چاہیں بیچیں۔ ہمیں اختیار ہے آپ نے فرمایا، سنو! میں نے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص مسلمانوں میں مہنگا بیچنے کے خیال سے غلہ روک کر رکھے اسے اللہ تعالیٰ مفلس کر دے گا یا جذامی۔ یہ سن کر حضرت فروغؓ فرمانے لگے کہ میری توبہ ہے اللہ تعالیٰ سے۔ میں آپ سے عہد کرتا ہوں کہ پھر یہ کام نہیں کروں گا، لیکن حضرت عمرؓ کے غلام نے پھر بھی کہا کہ ہم اپنے مال سے خریدتے ہیں اور نفع اٹھا کر بیچتے ہیں اس میں کیا حرج ہے؟ راوی حدیث حضرت ابو یحییٰ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے پھر دیکھا کہ اسے جذام ہو گیا اور وہ جذامی بنا پھرتا تھا۔ ابن ماجہ میں ہے کہ جو شخص مسلمانوں کا غلہ گراں بھاؤ پر بیچنے کے لئے روک رکھے اللہ تعالیٰ اسے مفلس کر دے گا یا جذامی۔ (تفسیر ابن کثیر جلد 1 صفحہ 372)۔

سب سے زیادہ قابل رشک بندہ

ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ میرے دوستوں میں بہت زیادہ قابل رشک

میرے نزدیک وہ مومن ہے جو سب بار (یعنی دنیا کے ساز و سامان اور مال و عیال کے لحاظ سے بہت ہلکا پھلکا) ہونماز میں اس کا بڑا حصہ ہو اور اپنے رب کی عبادت خوبی کے ساتھ اور صفت احسان کے ساتھ کرتا ہو اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری اس کا شعار ہو اور یہ سب کچھ اخفا کے ساتھ اور خلوت میں کرتا ہو اور وہ چھپا ہوا اور گمنامی کی حالت میں ہو اور اس کی طرف انگلیوں سے اشارے نہ کئے جاتے ہوں اور اس کی روزی بھی بقدر کفاف ہو اور وہ اس پر صابر و قانع ہو پھر رسول ﷺ نے اپنے ہاتھ سے چنگی بجائی (جیسے کہ کسی چیز کے ہو جانے پر اظہار تعجب یا اظہار حیرت کے لئے چنگی بجاتے ہیں) اور فرمایا جلدی آگئی اس کو موت اور اس پر رونے والیاں بھی کم ہیں اس کا ترکہ بھی بہت تھوڑا سا ہے۔ (مسند احمد جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)..... فائدہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میرے دوستوں اور اللہ کے مقبول بندوں کے الوان و احوال مختلف ہیں، لیکن ان میں بہت زیادہ قابل رشک زندگی ان اہل ایمان کی ہے جن کا حال یہ ہے کہ دنیا کے ساز و سامان اور مال و عیال کے لحاظ سے وہ بہت ہلکے، مگر نماز اور عبادات میں ان کا خاص حصہ ہے اور اس کے باوجود ایسے نامعروف اور گمنام کہ آتے جاتے کوئی ان کی طرف انگلی اٹھا کے نہیں کہتا کہ یہ فلاں بزرگ اور فلاں صاحب ہیں اور ان کی روزی بس بقدر کفاف ہے لیکن وہ اس پردل سے صابر و قانع، جب موت کا وقت آیا تو ایک دم رخصت نہ پیچھے زیادہ مال و دولت اور نہ جائیدادوں، مکانات اور باغات کی تقسیم کے جھگڑے اور نہ زیادہ ان پر رونے والیاں۔ بلاشبہ بڑی قابل رشک ہے اللہ کے ایسے بندوں کی زندگی اور الحمد للہ اس قسم کی زندگی والوں سے ہماری یہ دنیا اب بھی خالی نہیں۔ (معارف الحدیث جلد 2 صفحہ 88)۔

ایف ایم 101 کی آر جے زینب ارشد



خوش کن کھلکھلاتی مسکراتی جھلملاتی آواز جب ایف ایم 101 سے مخاطب ہوتی ہے تو سامعین کی سماعتوں سے دلوں میں چھلکنے لگتی ہے۔ اس آواز کی مالک زینب ارشد ایف ایم 101 لاہور سے پروگرام کرتی ہیں، زینب ارشد 2008ء سے ایف ایم 101 لاہور سے پنجابی شوز ”سحری سویر“ اور ”جی آیاں نوں“ کے نام سے کر رہی ہیں۔ پنجابی کے علاوہ اردو پروگرامز بھی کرتی ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے مقابلہ آر جے میں 2011ء میں زینب ارشد کو پاکستان کی بہترین آر جے قرار دیا گیا۔ زینب ارشد سے کیا گیا ایک تفصیلی انٹرویو قارئین ردا کے لئے پیش خدمت ہے۔



س: پہلا پروگرام کب کیا؟
ج: پہلا پروگرام 14 اگست 2008ء کو کیا تھا اور یہ پنجابی شوتھا۔
س: اب تک آپ کتنے شوز کر چکی ہیں؟
ج: میں نے تقریباً 600 کے قریب اردو پنجابی شوز کیے ہیں۔
س: آج کل کون سے شوز کر رہی ہیں؟
ج: آج کل ایف ایم 101 سے پنجابی شو ”جی آیاں نوں“ دوپہر 1 سے 3 تک کرتی ہوں۔
س: گھروالوں نے اعتراض کیا یا حوصلہ افزائی؟
ج: پہلے تو بہت زیادہ اعتراض کیا گیا جب

س: السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟
ج: میں بالکل خیریت سے ہوں، ہنسی مسکراتی۔
س: آپ کس نام سے ایف ایم سے منسلک ہیں؟
ج: میں زینب ارشد کے نام سے ہی منسلک ہوں اور یہی میرا اصل نام ہے۔
س: ایف ایم پر کس نے متعارف کرایا؟
ج: مجھے ایف ایم کا بہت زیادہ کریم تھا، میں نے ایف ایم پر خود ہی اپلائی کیا تھا۔ میں نے آڈیشن دیا، ایک ہفتے کے اندر میری سلیکشن ہو گئی اور نوں دن میرا پہلا پروگرام آن ایئر چلا گیا۔

پتہ چلا کہ ایف ایم پر شو کرنا ہے اجازت مل گئی اور بہت زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس کے علاوہ اکلوتی بیٹی ہونے کے ناتے بہت زیادہ سپورٹ کیا گیا۔

س: ایک اچھا آر جے بننے کے لیے کن صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے؟

ج: ایک اچھے آر جے میں اعتماد، انداز دوسرے لوگوں سے تھوڑا مختلف، بہت زیادہ ناچ اور ذمہ دار ہونا چاہیے۔ آن ایئر کیا بات کرنی ہے، کسی کی دل آزاری نہ ہو ایک اچھے آر جے کے ذہن میں یہ بات ہونی چاہیے۔

س: پہلا پروگرام کیا تو کیا کیفیت تھی؟
ج: پہلا شو جب کیا تو وہ لوگ جنہوں نے میرا آڈیشن لیا وہ بھی تھے اور پہلا شو پنجابی تھا، عجیب سی کیفیت تھی اور میرے ساتھ وہ پریزنٹر تھے جن کو میں سنتی تھی، جن کو میں کالز کرتی تھی، لیکن میں خود کو ہواؤں میں محسوس کر رہی تھی۔

س: کیا واقعات کے حوالے سے اپیشل شو کیے ہیں؟

ج: جی ہاں میں نے واقعات، حالات کے حوالے سے اپیشل شوز کیے ہیں جن میں عید کے خصوصی شوز، محرم الحرام کے موقع پر اپیشل شو، سیلاب کی خصوصی نشریات تقریباً تین ماہ کیوں۔

س: کس ساتھی پریزنٹر کے ساتھ شوز کرنے میں مزہ آتا ہے؟

ج: جن کے ساتھ پہلا شو کیا تھا شمس الحق اور روبی امتیاز کے ساتھ شو کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔
س: آج کل کمپیوٹر، نیٹ، کیبل ہے لیکن پھر کیا

لوگ ریڈیو کی اہمیت کو سمجھتے ہیں؟
ج: کمپیوٹر نیٹ کیبل کے باوجود ریڈیو کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ایف ایم نے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔

س: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کی رائے سامعین تک پہنچ رہی ہے؟

ج: لوگوں تک اچھا میسج پہنچنا کافی حد تک کامیابی ہے۔ ایک ایک لفظ، ایک ٹاپک یاد رکھتے ہیں فلاں شو میں یہ ٹاپک تھا، یہ بات تھی جس سے واضح ہوتا ہے کہ سسرز تک میری رائے میری بات پہنچتی ہے۔

س: پروگرام کرنے سے پہلے کبھی تیاری کی؟
ج: شروع کے شوز میں بہت زیادہ تیاری کر کے جاتی تھی، پورا ہفتہ ہی ہوتا تھا کہ کوئی نئی بات کرنی ہے نئے سوگ چلانے ہیں اور پورا ہفتہ میں تیاری کرنی تھی مگر اب اتنی ضرورت نہیں پڑتی۔

س: وہ کون سے سامعین ہیں جن کا پروگرام میں انتظار رہتا ہے؟

ج: میرے لیے تو سب سامعین ایک جیسے ہی ہیں لیکن مجھے اپنی بے جان (والدہ) کا انتظار رہتا ہے کہ وہ کال کریں کیونکہ وہ عموماً میرے پروگرام میں کالز کرتی ہیں اور باقاعدہ سنتی ہیں۔

س: آپ کی سالگرہ کا دن، کیا آپ سالگرہ مناتی ہیں؟

ج: 12 ستمبر۔ سالگرہ مناتی ہوں گھر والے کسی نہ کسی طریقے سے میری سالگرہ مناتے ہیں اور میری بے جان کا حکم ہوتا ہے کہ سالگرہ والے دن کھانا تم بناؤ گی اپیشل قسم کا، تو یہ بات مجھے عجیب لگتی ہے کہ میری سالگرہ، میرا دن اور کھانا

بھی میں نے بنانا ہے۔

س: کن لوگوں پر رشک آتا ہے؟

ج: اچھا بولنے والے اخلاق والے سچ بولنے والے لوگوں پر رشک آتا ہے۔ اچھی گفتگو مجھے متاثر کرتی ہے۔

س: دوستوں کو sms کرنا اچھا لگتا ہے یا فون کال کرنا؟

ج: میں کال کرتی ہوں تاکہ فوراً بات ہو۔

س: اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟

ج: میری فیملی میں میرے والد، میری بے بے جان، دو بھائی۔

س: مزاج کیسی ہیں؟

ج: بہت بولنے والی، خوش مزاج۔

س: کیا فلمی دیکھتی ہیں؟

ج: کبھی کبھار دیکھ لیتی ہوں۔ صائمہ کی فلمیں اکثر دیکھتی ہوں۔

س: اپنی ناپسندیدہ عادت؟

ج: یقین کرتی ہوں ہر کسی کے کام آنا، مدد کرنا، اس بری عادت سے بعض اوقات نقصان بھی ہوا۔

س: بچپن کیسا گزرا؟ بچپن کی کوئی یاد؟

ج: میرا بچپن بہت زیادہ مصروف گزرا۔ اکیڈمی جانا، بکس پڑھنا، پوزیشن لینا، ایک ناٹم ٹیبل کے تحت چلنا۔

س: خوبصورت ترین چیز؟

ج: میری ماں جی۔

س: پسندیدہ اداکار/اداکارہ؟

ج: ہمایوں سعید، عمران عباس، صائمہ ریما۔

س: پسندیدہ گلوکار/گلوکارہ؟

ج: عابدہ پروین، نصرت فتح علی خان۔

س: دیہات کی زندگی پسند ہے یا شہر کی؟

ج: دیہات کی زندگی زیادہ سکون والی زندگی ہے وہاں لوگ مہمان نواز، کھلے دل کے ہیں، پورا ناٹم دیتے ہیں، اپنائیت ہے، ملنساری ہے، وہ لوگ جھوٹ فریب دھوکے سے عاری ہوتے ہیں۔ میرا بہت کم اتفاق ہوا ہے۔ شہر میں اگر ایک مہمان آجائے تو سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ اس نے جانا کب ہے لیکن وہاں یہ بات نہیں۔

س: کھانے میں کیا پسند ہے؟

ج: میں بریانی، حلیم زیادہ شوق سے کھاتی ہوں۔ وہی بھلے فروٹ چاٹ اور تگے پسند ہیں۔

س: آپ کو کیا اچھا لگتا ہے دن یا رات؟

ج: مجھے رات اچھی لگتی ہے۔

س: موسم کون سا اچھا لگتا ہے؟

ج: سردیوں کا موسم پسند ہے۔

س: وہ لمحہ جسے آپ بھول نہ پائی ہوں؟

ج: وہ لمحہ جب میں نے قرآن پاک حفظ کیا تھا۔ اور 25 نومبر 2011ء کا وہ لمحہ جب مجھے بیسٹ آر جے کا ایوارڈ دیا گیا۔

س: ایک رات جنگل میں گزارنی پڑے تو؟

ج: جنگل میں تمام جانور ہوں لیکن شیر نہ ہو۔

س: دوستی آپ کے نزدیک؟

ج: دوستی خوبصورت رشتہ ہے اگر اسے صحیح طریقے سے نبھایا جائے۔

س: بارش برسی ہے تو کیسا لگتا ہے؟

ج: بارش برسی ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔

س: غصہ آئے تو کیا کرتی ہیں؟

ج: غصے میں رونا شروع کر دیتی ہوں۔

س: اگر چاند پر جانے کا موقع ملے تو؟

ج: چاند پر جانے کا موقع ملے تو ریڈیو ساتھ لے کر جاؤں گی۔

س: کیا کبھی مشورہ لیتی ہیں؟

ج: میں اپنے ماموں جان سے مشورہ لیتی ہوں۔ وہ بہت زیادہ رہنمائی کرتے ہیں۔

س: شوز کے درمیان کوئی ایسا واقعہ جو یادگار رہا؟

ج: میں مارننگ شو کر رہی تھی ایک کالر آئے آف

ایئر، انہوں نے کہا آج میرے بچے کی سالگرہ ہے اسے وش کر دیں۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا میرا کیک کہاں ہے۔ 9 بجے پروگرام ختم کر کے میں باہر آئی تو وہ کالر استقبال پر موجود تھا کیک کے ساتھ۔ میری یہ فنی مسئلہ گئی جو مجھے آج بھی یاد ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا وہ شخص ایک گھنٹہ میں کیک لے کر موجود تھا کہ آپ نے کہا تھا۔

س: آپ بہت خوبصورت پنجابی بولتی ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

ج: میرے پچھا اختر حسین اختر پنجابی رسالے کے ایڈیٹر تھے اور یہ رسالہ میرے پاس آتا تھا اور میرے پچھا جب بھی ہمارے ہاں آتے تو وہ مجھے یہ کہتے ”پتر میرے نال پنجابی بول“ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اتنی اچھی پنجابی بولتی ہوں۔

س: ایک اچھے اور معیاری پروگرام میں پریزنٹر کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے۔

ج: سارا ہاتھ ہی پریزنٹر کا ہوتا ہے۔

س: اگلے پانچ سالوں میں اپنے آپ کو کہاں دیکھتی ہیں؟

ج: سارا ہاتھ ہی پریزنٹر کا ہوتا ہے۔

س: اپنے آپ کو اتنا قابل کر لیں، ٹیلنٹ کا مقابلہ کریں، یقین اور خود اعتمادی بہت ضروری ہے۔

☆ ☆ ☆

ج: میں اس فیلڈ میں ہی رہوں گی اور پروڈکشن کی طرف بھی آؤں گی جس کے لئے میں کورس اور ورکشاپ کر رہی ہوں۔

س: آپ کا اشار کون سا ہے، کیا آپ ستاروں کے علم پر یقین رکھتی ہیں؟

ج: میرا اشار ورگو ہے اور میں ستاروں کے علم پر بہت زیادہ یقین نہیں رکھتی۔

س: ایف ایم کے علاوہ آپ کی مصروفیات؟

ج: ایف ایم کے علاوہ میں ایم اے کر رہی ہوں پنجابی میں۔

س: ردا ڈائجسٹ کے بارے میں آپ کے تاثرات؟

ج: ردا ڈائجسٹ ایک معیاری ڈائجسٹ ہے جس میں کہانیاں، ناول، شاعری، بیوٹی ٹپس، کوئز اور لیٹر ہوتے ہیں۔ سب سلسلے اچھے ہیں لیکن اس میں ایف ایم سے منسلک آر جے کو متعارف کروانا یہ زبردست اور اچھا سلسلہ ہے۔

س: جو اس فیلڈ میں آنا چاہیں ان کے نام پیغام؟

ج: اگر آپ اچھے آر جے بننا چاہتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ شوز سنیں، آپ میں لوگوں کو سننے کی طاقت ہو، کسی اور کے انداز کو کاپی نہیں کرنا، اعتماد اور تجربہ بھی ہونا چاہیے۔

س: قارئین کے نام پیغام؟

ج: حوصلہ بھی نہیں ہارنا، کسی بھی معاملے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے، اگر آپ کا کام نہیں ہو رہا تو اپنے آپ کو اتنا قابل کر لیں، ٹیلنٹ کا مقابلہ کریں، یقین اور خود اعتمادی بہت ضروری ہے۔

☆ ☆ ☆

فردوس لڑکھائی!

میری نگاہیں بھی منتظر ہیں

اسی سحر کی کہ جس کی کرنیں پیام دیں گی
لو اب سے دنیا میں امن ہوگا
کچھ ایسی خوشیوں کی منتظر ہوں
جو گولہ بارود دفن کر کے

محببتوں کو دوام دے گا

وہ چلچلاتی دھوپ میں ابھی کالج سے لوٹی تھی اور
آتے ہی سلمان کا دماغ کھانے لگی تھی۔ یہ کام وہ پچھلے
دو ہفتے سے کر رہی تھی۔

”سلو بھائی میری جان پلیز میرا یہ کام کر دے
ناں۔“ نرمنا نے بہت محبت اور لاڈ سے کہتے ہوئے
بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں تھیں۔

”نمی! یار تو دیکھ نال کتنی زبردست گرمی ہے اتنی سڑی
گرمی میں تو مجھے پبلک ٹرانسپورٹ میں صدر جانے کا کہہ رہی
ہے یار! گرمی سے ویسے ہی بندہ آدھا ہو جاتا ہے اوپر سے یہ
بیس جگہ جگہ رکتی ہیں۔“ سلمان بے زاری سے بولا تھا۔

”تو تو ایسے بول رہا ہے جیسے AC والی گاڑیوں
میں سفر کرتا ہو! اپنی جاب کیلئے کیسے مارا مارا پھرتا ہے ایک
چکر میری خاطر بھی لگا لے میرا پیارا بھائی۔“

”چل چل زیادہ مکھن مت لگا، کل صبح چلا جاؤں گا
اور دو تین بجے تک تیری ساری تصویریں پرنٹ آؤٹ
اور تیرے تمام ویڈیو کلپ کو ایک CD میں Convert

کرادوں گا، بس خوش۔“

نرمنا اپنے کالج کے سالانہ فنکشن کی تصویریں اور
ویڈیو کلپ جو موبائل میں محفوظ تھے نکلوانے کی ضد
کر رہی تھی۔

”آئی لو یو سوچ میرا پیارا بھائی، میری جان!“ نرمنا
خوشی سے کھلکھلا کر بولی تھی۔

☆.....☆.....☆

”کراچی صدر ریسیوسٹر میں خودکش بم دھماکا 152 افراد
ہلاک 75 زخمی۔ مزید تفصیلات کیلئے دیکھتے رہئے جو
نیوز.....“ نرمنا کالج سے نکلی تھی کہ اس پاس کی دکانوں پر یہی
خبریں چل رہی تھیں نرمنا بھی گزر رہی تھی کہ یکفخت چیخی۔

”نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا، میرا بھائی سلمان.....
سلمان آج وہیں ریسیوسٹر گیا ہے۔“ چلانے کے ساتھ
ہی وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

سلمان کا محلے کے لڑکوں نے بہت پتہ کروایا، لیکن
کوئی سراغ نہ ملا اور نرمنا اپنے اکلوتے بھائی کا صدمہ
برداشت نہ کر سکی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ ایک ہفتا بستا
گھر انہ جو ایک بہن بھائی پر مشتمل تھا بالکل برباد ہو گیا۔
کون ہے اس سب کا ذمہ دار۔

ہر نئے دن یہی کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی اپنا
عزیز کھو رہا ہوتا ہے۔ کیا زندگی کی کوئی اہمیت یا محبت نہ رہی
کہ بے درد لوگ یوں زندگیوں کو بے مول کر رہے ہیں۔ کس
کود سے دار کہا جائے۔ کون ہے لوگوں کی خوشیوں کا قاتل۔

رنگِ جہاں سے جو قریب تھے

صبا بہت دیر تک کروٹیں بدلتی رہیں، انہیں نیند نہیں آرہی تھی، طرح طرح کے دوسوے اور خیالات ان کے ذہن میں جنم لے رہے تھے، وہ بہت بے قراری انہیں، ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی، اشمل نے دروازہ کھولا تھا، وہ بہت بے قراری اٹھ کر دروازے سے باہر نکل آئیں، اشمل کے کمرے کی جلتی لائٹ دیکھ کر وہ اندر آ گئیں، رومی نے جلدی سے گھبرا کر ان کی جانب دیکھا، دروازہ کھلا تھا، وہ ہینڈل تھامے اشمل سے پوچھ رہی تھیں۔

”اتنی دیر تک تم لوگ کہاں تھے؟ اور تمہارا فون بھی بڑی تھا۔“ وہ شک بھری نظروں سے اُسے گھور رہی تھیں۔

”مام پلیز!“ وہ بیزار کن لہجے میں انہیں دیکھ کر سر جھکا گیا۔

”اشمل! تم اپنی لمٹ کر اس کر رہے ہو۔“ انہوں نے ایک قہر بھری نظر رومی پر بھی ڈالی۔

”مام! آپ جائیں پلیز، میں بہت ڈسٹرب ہوں، آپ دیکھ نہیں رہیں۔“

”یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟“ انہوں نے ایک نظر رومی کے بینڈ تاج بندھے ہاتھ پر ڈالی۔

”مام پلیز! یہ چوٹ ہے اور کیا ہے؟ اب آپ پوچھیں گی کہ یہ کیسے لگ گئی؟ سی سائیڈ کے کنارے پر ایک بچے کے ساتھ

حادثہ ہوا تھا، رومی نے بروقت اس کو بچا لیا۔“

”اچھا.....! تو یہ ہمدردیاں بنو رہی پھر رہی ہے؟“

”مام پلیز! اس وقت میں بہت اپ سیٹ یوں، آپ جائیں۔“

”اوکے، میں تمہارا بہت جلد بندوبست کرتی ہوں۔“ وہ یہ کہتی ہوئیں روم سے نکل گئی تھیں، رومی کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی

نمی اُتر آئی تھی، ہر روز اُسے تکلیف دہ ماحول سے گزرنا پڑتا تھا، جس کی وہ عادی نہیں تھی، وہ اُداس لہجے میں بولی۔

”اشمل! میں ہر روز اس کھیل سے تنگ آ گئی ہوں، پلیز! میں تمہارے اس کھیل کا ڈراپ سین چاہتی ہوں، جتنی جلدی

ہو سکے تم مجھے.....“ وہ یہ جملہ کہتے کہتے کانپ رہی تھی، اشمل نے ایک نظر اس کے وجود پر ڈالی، زرخ پھیر کر کشن اٹھا کر وہ

صوفے پر جا بیٹھا تھا۔

”آپ سے میں کتنے سوالات کرتی ہوں، آپ میری کسی بات کا جواب نہیں دیتے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں کشن بھیج کر

اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”کیا جواب دوں؟“ وہ کھسک کر بیڈ کے کونے پر ہو گئی۔

”پھر تم کیوں مجھ سے سوال کرتی ہو؟ اور خود ہی ڈر کر پیچھے ہو جاتی ہو، اندر سے تم خوفزدہ ہو، اور خوفزدہ ہونے کی کوئی نہ

کوئی وجہ تو ہوتی ہے، کیا وجہ ہے تمہارے ذہن میں یہ خوف کیسے آیا؟“

Express
your thoughts
beautifully

June 11 near 96

”کچھ تو فیل کیا ہوگا؟“

”کیا فیل کیا تم نے بولو، ایسا کیا محسوس کیا جو تم سہم کر ہمیشہ دوفٹ مجھ سے دور ہو جاتی ہو؟“

”اس میں ہماری اور تمہاری بہتری ہے۔“

”رومی پلیز! میں اس وقت ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہوں۔“ اس نے اٹھ کر لائٹ کا مٹن آف کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

انسان کے اختیار میں جو ہوتا ہے وہ سب کچھ کر لیتا ہے، مگر ہوتا ہی ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا، کلثوم کی بنائی ہوئی دنیا میں زویا آ تو گئی تھی، لیکن پہلے ہی دن میں خود کلثوم کو لگا کہ تصویر فریم میں فٹ نہیں ہو رہی، فرسٹ نائٹ ہی زویا کی ماں ساتھ آئی تھی، جاتے جاتے وہ دروازے پر رُک کر بولی۔

”اب یہ رسم و رواج کا زمانہ نہیں ہے، یہ کھیر چٹوائی اور منہ دکھائی فی الحال بند کرو، میری بیٹی بہت تھک رہی ہے، اس کے آرام کا وقت ہو رہا ہے، اور ہاں ارسلان بیٹے! اس سوٹ کیس میں بلیٹکٹ ہے، زویا سو جاتی ہے تو اُسے ٹھنڈ لگتی ہے، اسپلٹ چل رہا ہو تو اس پر بلیٹکٹ ڈال دینا، ورنہ ٹھنڈ سے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے، اوکے میری جان زویا!“ وہ پھر پلٹ کر بیٹی کے روم میں آئیں اور لپٹا لپٹا کر پیار کیا، ارسلان ماں کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ رہا تھا، تو رومی جھپ سے سامنے پلٹ کر آئی تھی۔

”آئی! یہ رسم و رواج تو اچھے لگتے ہیں ولید ہاؤس کے گیٹ پر، مجھے اُٹھنے کے ساتھ ایک گھنٹے روک دیا گیا تھا، ساری لڑکیاں ننگ مائیک رہی تھیں ولید ماموں صرف انجوائے کرنے کے لئے لڑکیوں سے بارگیننگ کر رہے تھے۔“ تو کلثوم نے ایک سکون کا سانس لیا تھا کہ چلو کوئی تو ہے جو بولا، ایشل جو شرمندگی کے مارے گڑسی گئی تھی، رومی کو ہنس کر دیکھنے لگی۔

”بیٹا! تمہاری بات کوئی اور تھی، وہ رحم اور ترس کھا کر تمہیں اس گھر سے لے گئے، مگر میری بیٹی ایسی تو نہیں۔“ تو ارسلان کو ایک کرنٹ سا لگا، تبھی کلثوم بولیں۔

”ہمارے گھر کی بیٹیاں صبر اور تحمل سے کام لیتی ہیں۔“

”لیکن میری بیٹی تو بہت نازک ہے۔“ انہوں نے سر سے آنچل ہٹا دیا تھا۔

”دیکھو تو پھول سا چہرہ ہے، ذرا سی دیر ہوتی ہے تو اس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگتی ہیں، بالکل ادھ کھلی کلیوں کی طرح، کوئی بات نہیں بیٹا! تھوڑا سا صبر کرو، بیٹے ارسلان! جلد ہی لائٹ بند کر دینا، میں تو جا رہی ہوں۔“ کلثوم ساکت سی جہاں بیٹھی تھیں وہیں بیٹھی رہ گئیں، البتہ ارسلان پلٹ کر بولا تھا۔

”آئی! اب یہ ہمارا معاملہ ہے۔“ تو زویا نے نظریں اٹھا کر ارسلان کی جانب دیکھا تھا، کلثوم منہ دکھائی میں ایشل کا لاکٹ لئے کھڑی تھیں، تذبذب کا عالم تھا، گہری خاموشی میں کسی کی سانس سنائی نہیں دے رہی تھی، تب سارے سکوت کو توڑتی ہوئی ایشل بولی۔

”ای جان! پہنادیں ناں۔“ تو کلثوم کے ہاتھ زویا کی گردن تک پہنچے ہی تھے۔

”پلیز آئی! یہ تو استعمال شدہ ایشل کا لاکٹ ہے، جو وہ پہن کر میرے گھر آئی تھی، میں کبھی کسی کی استعمال شدہ چیز نہیں لیتی۔“ کلثوم کے دونوں ہاتھ میں لاکٹ جو موتیوں میں پرویا ہوا تھا، وہیں کا وہیں رک گیا، کلثوم کی نظر امی جان کی طرف گئی، وہ بہت غور سے کلثوم کو دیکھ رہی تھیں، ارسلان نے نظر بچا کر شرمندگی سے رومی پر نظر ڈالی، تو بیڈ پر بیٹھی ہوئی زویا نے اس کی جانب دیکھا تھا، ہلکے نیلے رنگ کی جھلملاتے شلوار، گولڈن گرٹا اور بڑا سا گولڈن دوپٹہ سچے موتیوں کا گرین جھلملاتا ہوا سیٹ اس کے کانوں میں پرانے زمانے کے بڑے بڑے بالے مل رہے تھے، اس نے چھو کر جلدی سے اپنی بالیوں کو دیکھا، چھوٹی

دادی نے اُسے اپنی نشانی دی تھی بطور تحفہ، اور بہت پرانے زمانے کی بالیاں تھیں، جن کو بڑی داوی نے سیٹ میں تبدیل کر دیا تھا، رومی نے ہاتھ لگا کر فخر یہ انداز میں ارسلان کی جانب دیکھا تھا، زویا نے بہت تنقیدی نظروں سے رومی پر ایک نظر ڈالی اور بولی۔

”پلیز آئی! میں ریست کرنا چاہتی ہوں۔“

”چلو سب کلین بولڈ ہو گئے۔“ رومی اور ایشل بہت کھلکھلا کر ہنسیں تھیں، باقی ساری لڑکیاں اور خواتین کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔ سب کے جانے کے بعد ارسلان صوفے پر سر جھکائے بیٹھا تھا، زویا نے خاموشی سے دیکھتے ہوئے ارسلان پر ایک نظر ڈالی۔

”کیا اب دروازہ بھی میں بند کروں گی؟“ تو ارسلان بڑی طرح چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا، اس کی آواز میں بڑا تکبر تھا، زویا کھٹاک سے اٹھی، اس نے اپنے ڈریس کو سنبھالتے ہوئے دروازے کو لاک کیا، بیڈ پر دھڑ سے بیٹھی، اس کی باڈی لینکونج سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ شدید غصے میں ہے، ارسلان جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا، زویا نے سر سے دوپٹہ نوج کر گھور کر دیکھا، بندے، بالی، جھکے، یکس سب اس نے اُتار کر ڈرینگ ٹیبل پر پٹخ دیئے، آنکھوں اور ناک سے پانی بہنے لگا، رنگین چوڑیوں سے اُسے وحشت ہونے لگی تھی، آہستہ آہستہ وہ اپنی کانچ کی چوڑیوں کو اُتارتی جا رہی تھی اور ہر چوڑی اُتارنے پر وہ ایک نظر ارسلان پر ضرور ڈالتی، مگر ارسلان ٹس سے ٹس نہ ہوا، جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا، مرنجٹا کھر میں زویا اس وقت بے حد حسین لگ رہی تھی، پھر بھی وہ ارسلان کا دل نہ جیت سکی۔

”پلیز مجھے وحشت ہو رہی ہے اس خاموشی سے، آپ باہر جائیں، مجھے آرام کرنا ہے۔“ زویا روتے ہوئے بولی۔

”پلیز زویا! مجھے تماشہ مت بناؤ اور نہ خود کو تماشہ بناؤ۔“

”تم تھے ہی تماشے کے قابل، تبھی تو تمہارے سب گھر والے باتیں بنانا کر چلے گئے۔“

”تم لوگوں نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔“ ارسلان پھٹ پڑا۔

”اگر میں پسند نہیں تھی تو کیوں کی مجھ سے شادی؟ تمہارے دل و دماغ پر تو وہ رومی بسی ہوئی ہے، آئی نے مجھے سب بتایا ہوا ہے۔“ ارسلان نے بہت گہری نظروں سے زویا کو دیکھا تھا، ایک نیا چہرہ رومی کے حوالے سے پھر کھل چکا تھا۔

”امی نے تم سے کیا کہا ہے؟“

”جو وہ جانتی ہیں۔“ وہ بھی اُسی انداز میں بولی۔

”کیا جانتی ہیں وہ زویا! میرے بارے میں یا رومی کے بارے میں، تم یہ کس قسم کی بات کر رہی ہو؟ تم بہتان لگا رہی ہو، تم جانتی ہو یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔“

”تو یہ رات گناہ اور ثواب کی ہے۔“ وہ پلٹ کر بولی۔

”آہستہ بولو زویا! باہر برآمدے میں ابوسوئے ہوئے ہیں۔“ ارسلان کمزور پڑ گیا تھا۔

”کیا تمہارے گھر میں کن سوئیاں لیتے ہیں لوگ؟ میں نہیں رہوں گی چپ، تم نے میری ماں اور میرے باپ کی توہین کی ہے، میری ماں یہاں سے بہت اُداس گئی ہے، سب کچھ تو دیا ہے میرے باپ نے، اگر کچھ کی رہ گئی ہے تو بول دیتے۔“

”زویا! پلیز آہستہ بولو۔“

”میں نہیں بول سکتی آہستہ، تمہیں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہئے تھا۔“ اس کے چہرے پر اُدا سی پھیل گئی۔

”زویا! پلیز، آہستہ بولو، میں نہیں چاہتا کہ تمہاری آواز باہر جائے۔“

”اتنا ہی خوف تھا تو اپنا یہ محل کہیں اور تعمیر کروالیتے۔“

”بس زویا! پلیز میں آج کی رات کوئی بحث نہیں چاہتا۔“

”آج کی رات جو میری زندگی کے فیصلے کی رات ہے، اور تم کہتے ہو کہ میں چپ ہو جاؤں، سب کچھ تو میرے باپ نے دے دیا تم لوگوں کو، پھر اگر کسی بات کی ہے؟ ایک نیلا لاکٹ تو دے نہ سکے، زویا کو ایشل کی اُترن پہنار ہے، اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ ایک چاندی کا سیٹ لے آتے، کتنی ذلت سہی ہے میرے ماں باپ نے، کہ کہاں بیٹی دے دی؟“

”سب کچھ تم لوگوں کے سامنے تھا، ہم نے کوئی زبردستی نہیں کی، سمجھیں زویا؟“ وہ بہت اُداس لہجے میں بولا۔

”تو تم کیا سمجھتے ہو کہ میرے والدین نے زبردستی کی ہے؟ دن میں دس دس چکر لگاتی تھیں آپ کی ماں جی۔“

”زویا! تم سے بات کرو، وہ میری ماں ہیں۔“

”میرا نام لے کر مخاطب مت کرنا، تم ابھی مجھے نہیں جانتے۔“

”میں جانتا ہوں تمہیں اچھی طرح، میری ماں کو تم لوگوں نے ٹریپ کیا ہے۔“ تو وہ بہت زور سے چیختی تھی۔

”ارسلان! پلیز۔۔۔ میرے ماں باپ کو کچھ مت کہنا۔“

”کیسا دکھ ہوا تمہیں، اور تمہارا لہجہ کیسا ہے میری ماں کے بارے میں، کبھی تم نے سوچا کیا مہذب گھرانوں کی بیٹیاں اسی لہجے میں بات کرتی ہیں اپنے شوہروں سے؟“

”جتنے مہذب گھرانے کے آپ ہیں ناں، میں سب جانتی ہوں، کھلے عام آپ کی ماں آ کر کہتی تھیں کہ رومی آپ پر دُور سے ڈال رہی ہے۔“

”اگر ایسا ہوتا تو آج تم یہاں نہ ہوتیں، رہا میری ماں کا تعلق، تو میں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، انہیں یہ شان و شوکت، تمہارا رتبہ بہت متاثر کرتا تھا، لیکن میں نے بھی تو یہ سنا تھا کہ تمہاری اتج زیادہ ہو گئی ہے، آپ کے والدین پریشان ہیں اور کوئی غریب لڑکا دیکھ رہے ہیں تاکہ تمہیں رخصت کر سکیں، بس یوں سمجھ لو کہ ہم ایک دوسرے کی ضرورت تھے۔“

”ہاں تو اس کی بھی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، میں تم سے صرف دو سال بڑی ہوں۔“

”میں کب کچھ کہہ رہا ہوں، تم جو بھی ہو، اب میری بیوی اور اس گھر کی عزت ہو، میں بس اتنا بول رہا ہوں کہ آہستہ بولو، اور عزت کرو میرے گھر والوں کی۔“ ارسلان نے بھی اُسے آئینہ دکھایا تھا، زویا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، ارسلان نے بیڈ سے چادر اٹھا کر چوڑیاں اس کے ہاتھوں میں ڈالی تھیں، وہ رُخ پھیر کر ابھی تک سسک رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہارن کی آواز پر رومی چونک گئی تھی، رات گئے ایشل اُسے لینے اچانک آ گیا تھا، وہ ملگجی سے شبِ خوابی کے سادہ سے لباس میں صوفے سے اُٹھ کر باہر کی جانب بڑھی، دروازہ کھولا تو ایشل سامنے کھڑا تھا۔

”کیا سوچتی تھیں تم؟“ وہ تھوڑا جھل کر قریب آیا۔

”کیوں خیریت؟“ وہ ہڑبڑا کر دو قدم آگے بڑھی۔

”سوری رومی! تم باپ کو تو جانتی ہو، دو گھنٹے سے تمہاری رٹ لگائی ہوئی ہے کہ رومی کو لے کر آؤ، اور تم نے اپنا سیل بھی آف کر رکھا ہے۔“

”نہیں تو۔۔۔“

”بس تم گھر چلو۔“

”اتنی رات کو۔۔۔“ ایشل نے اپنی ریٹ وایج پر نظر ڈالی۔

”اتنی رات۔۔۔ صبح کے پانچ بج رہے ہیں۔“ وہ نیند سے بوجھل آنکھوں سے دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

”سب گھر والے تھکے ہوئے سو رہے ہیں، اتفاق سے تمہاری گاڑی کے ہارن سے میری آنکھ کھل گئی، ورنہ میں تو خود بہت گہری نیند میں تھی۔“ اس نے جلدی سے اپنا بڑا سا پنک دوپٹہ اٹھا کر اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس پر لپیٹ لیا تھا۔

”پاپ کا تو وہاں دن نکلا ہوا ہے، چلیں آپ۔“

”چلو ٹھیک ہے، میں ایشل کو بتا دیتی ہوں یا شاید تایا ابو نماز کے لئے اُٹھے ہوں تو میں دیکھتی ہوں، تم اندر آؤ، میں چھج کر لوں، تھوڑی دیر لگے گی۔“ ایشل چلتا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا، رومی نے پلٹ کر دیکھا تو برآمدے میں جہاں وہ ایشل کو لے کر آئی تھی، تایا ابو چوکی پر بیٹھے نماز پڑھ رہے تھے، نجانے کس پہر وہ تہجد کے لئے اُٹھ کر آئے تھے، کسی کو خبر نہ ہوئی، اس نے انگلی کے اشارے سے ایشل کو خاموش رہنے کو کہا، تو وہ وہیں پڑی ہوئی کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا تھا، تایا ابابا کے دونوں ہاتھ اللہ کے حضور پھیلے ہوئے تھے، آنسوؤں سے ان کا چہرہ بھیگ رہا تھا اور ہلکی ہلکی سرگوشیاں ان کے ہونٹوں سے نکھر رہی تھیں یا وہ دعا کے موتی تھے جو وہ سمیٹ رہے تھے۔

”اے اللہ! ایشل کا نصیب اچھا کرنا، رومی کا تو نے نصیب اچھا کیا ہے، تو آگے بھی اس کے لئے آسانیاں کر دے، پھر کو بھی تو موم کر دے، میری رومی کبھی بچھی رہتی ہے، اس کو سائبان تو مل گیا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کے سر پر دھوپ بھری ہے۔“ اتنی آہستہ سی سرگوشی بھی ایشل کے دل و دماغ پر چڑھ رہی تھی، پاپا مل سے گھرے سمندر میں وہ اس لمحے اُتر گیا تھا۔

”کیا محبت اتنی گہری ہوتی ہے، بن کہہ وہ سارے بھید جان لے، یا پھر چروں کے عکس اتنے مکمل ہوتے ہیں وہ پرت در پرت کھلتے جاتے ہیں، یہ سب کیا ہے؟ جو ہاتھ پھیلائے ایک بوڑھا شخص اپنے رب سے خوشیاں مانگ رہا ہے، یہاں تو دولت کے انبار نے ہمارے ارد گرد اتنے سارے خوش گمانوں کے خواب بکھیر دیئے ہیں، جس کو چاہوں میں ہاتھ بڑھا کر حاصل کر لوں، ہر چیز ہماری دسترس میں ہے اور یہ شخص صرف نصیب کی بھیک مانگ رہا ہے۔“ بھی وہ بڑا سادہ اُٹھائے اندر آئی، نہ صرف ایشل بلکہ ٹکیل بھی رُخ پھیر کر حیرانی سے اُسے دیکھنے لگے تھے۔

”بیٹا! اتنی جلدی، اتنی صبح تمہاری تو آنکھ بھی نہیں کھلتی، تم جانے کی تیاری کر رہی ہو؟“ تو خود بخود ان کا رُخ ایشل کی طرف ہو گیا۔

”سب خیریت تو ہے، بھابی تو ٹھیک ہیں، اور ولید۔۔۔؟“

”جی، جی سب ٹھیک ہیں۔“ ایشل سہم کر کھڑا ہو گیا تھا، اُسے یوں لگ رہا تھا کہ سامنے کھڑا ہوا شخص اچھی طرح سے اُسے پڑھ رہا ہے، رومی کیسی زندگی گزار رہی ہے، یہ شخص جانتا ہے اس نے پلٹ کر نظر اٹھا کر رومی کی جانب دیکھا، پنک شیٹون کی لمبی سی فراک اور بڑے سے دوپٹے کو سر سے لپیٹے بے حد قیمتی پرس تھا، ہاتھوں میں پڑی ہوئی ڈائمنڈ کی رنگ بے حد نفیس جڑاؤنگٹن اور ہاتھوں میں بھری مہندی جو اس نے ارسلان کی شادی پر لگوائی تھی، رومی کی براؤن آنکھوں میں اس قدر غمراہی، پُر سکون شفاف چہرہ اور آنکھوں میں رات کی شبِ خوابی شبنم کی طرح اُتر گئی تھی، کہیں بھی تو ایسا کچھ نہیں تھا، کوئی مفلسی، کوئی ڈر خوف، نہ ہی چہرے سے اس کی اصلیت بیدار ہوئی تھی، چشم گریہ بھی اتنی جل تھل نہ تھی کہ کوئی اُسے پڑھ سکتا۔

”جی تایا ابو! ماموں نے مجھے بلوایا ہے۔“

”جی سب خیریت ہے۔“ ایشل انہی ہوئی آواز میں بولا تھا۔

”آپ فون کر دیتے، ہم خود چلے آتے۔“

”اب تو صبح ہو رہی ہے انکل! پاپ بھی آپ کی طرح جاگ رہے ہیں۔“ سگار پیتے ہوئے ایزی چیئر پر بیٹھے ہوئے ولید حیدر کا خیال اُسے آیا۔

”سرد اور گرم دنوں میں بھی یہ اسی تخت پر نمازیں ادا کرتے ہوں گے۔“ ٹکیل کے ماتھے پر سیاہ داغ پر اس کی نظر پڑی تو

اُسے دور کہیں روشنی کا ایک ہالانظر آیا، ولید حیدر کی طرف سے اس نے اپنا رخ پھیر لیا تھا، مسلسل سگار چیتی ہوئی ایزی چیئر بل رہی تھی۔

”کتنا مختلف ہے انسان ایک دوسرے سے اس دنیا میں۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور رومی کے بیک کو اس نے یوں اٹھایا، جیسے کوئی تھکا ہوا مسافر کسی منزل کی تلاش میں ہو، بھی سامنے سے چائے کا کپ تھا، ہوئے کلثوم آئی نظر آئی تھیں۔

”میں نے سوچا آپ نماز پڑھ چکے ہوں گے، اماں کہہ رہی ہیں آپ کو چائے دے دوں۔“ ایک اور روپ کھڑک کر سامنے آیا، تو اس نے آہستہ سے سر کو سلام کے لیے جھکایا تھا۔

”کیا ہو رومی! تم اتنی صبح صبح جا رہی ہو؟“ کلثوم کے لہجے میں ماؤں والی مٹھاس اُتر آئی تھی۔

”جی تائی اماں! آپ سو رہی تھیں تو میں نے سوچا آپ کو ڈسٹرب نہ کروں۔“

”کہاں بیٹا! رات بھر نہ سو سکی، میں زویا...“ آگے ان کی آواز کو بریک لگ گئے تھے، وہ اشمیل کی موجودگی کا احساس کر گئیں۔

”جی تائی اماں! زویا بہت خوبصورت لگ رہی تھی رات۔“ وہ بھی ان کے جملے پر بات بنا گئی۔

”بس اللہ رحم کرے گا۔“ تایا ابو نے آہستہ سے کہا تھا۔

”دادی سے مل کر جاؤ، وہ جاگ رہی ہیں۔“

”جی تائی اماں!“ وہ جھپاک سے دادی سے مل کر پلٹ بھی آئی تھی، گیٹ تک وہ چھوڑنے آئیں، رومی نے دور بینی ہوئی کوٹھڑی کی طرف دیکھا، جس کے دروازے ابھی تک کھلے ہوئے تھے، اس رات کی طرح جب وہ اس گھر کو چھوڑ کر گئی تھی۔

”ارے ایسے کیسے؟ گلے تو لگ کر جا۔“ کلثوم نے اُسے اپنے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ پہلی بار ان کے سینے سے لپٹ کر وہ ماں کی یاد میں روئی تھی، ماں کے وجود کی خوشبو اس کی سانسوں میں اُتر رہی تھی، اس نے بھیگی نظروں سے اس کوٹھڑی کی طرف دیکھا، وہ سہمی ہوئی رات میں جب تائی اماں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”دیکھو تم یہاں اگر رُک کی ناں تو میں تمہارا بستر یہاں لگوادوں گی۔“ لیکن جب اس نے خوف سے کوٹھڑی کے اندر پڑے ہوئے پلنگ کو دیکھا تو اس پر تائی اماں سر جھکائے بیٹھی ہوئی نظر آئیں تھیں، آج بھی ایسا ہوا تھا، اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ کر باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے، گاڑی کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہوتی چلی گئی، اشمیل کے ذہن پر شکیل کی سکتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”اے اللہ! ایشل کا نصیب اچھا کرنا، رومی کا تو نے نصیب اچھا کیا ہے، تو آگے کے لئے بھی آسانیاں پیدا کر دے، پتھر کو بھی ٹوموم کر دے، میری رومی کبھی بچھی رہتی ہے، اس کو سائبان مل گیا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کے سر پر دھوپ بھری ہے۔“ اس نے مڑ کر رومی کی طرف دیکھا تو وہ اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو پونچھ رہی تھی۔

”کیا ہوا... ارسلان کی بیوی پسند نہیں آئی؟ یقیناً وہ تمہارے سامنے کچھ بھی نہیں ہوگی۔“

”بکو اس مت کرو اشمیل!“ اس نے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں تھیں۔

”کیوں... حقیقت سے آنکھیں پُڑا رہی ہو یا اپنے نصیب پر رورہی ہو؟“

”یہ تو پرانی بات ہے، کوئی نئی بات ہے۔“

”آئی شیور... کہ میں جو سوچ رہا ہوں وہ سچ ہے، تمہارے ان آنسوؤں نے تمہارے تایا ابو پر تمہارے سارے بچید کھول دیئے ہیں۔“ وہ بہت غور سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”جی نہیں، امپوسبل۔“ وہ بہت اکڑ کر بولی۔

”کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں رومی! جو ایک دوسرے سے کہے بنا سب کچھ جان لیتے ہیں۔“ گنل پر گاڑی رُک گئی تھی۔

”وہ اشمیل ولید نہیں ہیں جو میرے دل کا حال جان لیں، ان کی زندگی میں اپنے مسائل ہیں، وہ تہجد گزار ہیں، ساری ساری راتیں وہ عبادت میں گزار دیتے ہیں، ان کے پاس اتنا فضول وقت نہیں ہے کہ وہ کسی کی ہسٹری جانتے پھریں۔“

”یعنی میں بہت فالتو ہوں؟“ وہ بہت دکھی سے لہجے میں بولا۔

”اب تمہیں اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہ دیکھو۔“ اس نے اپنا بڑا سا بیک اٹھا کر لپ اسٹک کو اپنے ہونٹوں پر لگایا، ہلکا ہلکا بلش آن کا ٹچ کر کے اس نے آئینے میں دیکھا، کا جل بھری براؤن آنکھیں، پنک آئینل سے سر کو ڈھانپنے ہوئے وہ مسکرا کر بولی۔

”دیکھو اشمیل! میں تایا ابو کے سامنے ایسے جاتی ہوں۔“

”واؤ...! یہی روپ تو تمہارا چغلی کھاتا ہے، جب تم تیار ہو کر پاپ کے سامنے آتی ہو اور میں تمہیں دیکھتا ہوں، ہا ہا...!“ اس نے زور کا قہقہہ لگا کر اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا تھا۔

”شٹ اپ اشمیل! تم کوئی بات تو دل میں رکھ لیا کرو۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔

”اس کا مطلب ہے میں سچ بول رہا ہوں۔“ اس کا پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

”اس وقت بہت دکھی دل ہو تم، جیسے کسی نے دل توڑ دیا ہو۔“ وہ بولی تو وہ بولا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

”کیا ہوا اشمیل! تم ٹھیک تو ہو؟“

”شاید نہیں، بوجھ کر جانو۔“

”تمہیں تایا ابو پر بہت رحم آیا ہے ناں کہ وہ بے چارے اتنی صبح جائے نماز پر بیٹھے ہوئے نظر آئے، تم نے ایسا ماحول دیکھا نہیں ہے شاید اس لئے، غربت طعنہ نہیں ہے۔“

”شٹ اپ! تمہاری کیمسٹری فیل ہوگئی۔“

”تو پھر کیا کریں اس محبت کا، جس پر ان کا اختیار نہ ہو، آئی ایم رائٹ؟“ رومی نے اُسے غور سے دیکھا۔

”کچھ تو ہے اشمیل! تمہارے آنے والے موڈ اور جانے والے موڈ میں بہت فرق ہے۔“

”کچھ نہیں، مجھے نیند آ رہی ہے، میں گھر جا کر سو جانا چاہتا ہوں۔“ وہ منہ پھیر کر بولا۔

”اور یہاں دن نکل رہا ہے، یہی فرق نمایاں ہے ناں، تمہاری اور ان کی تہذیب میں؟“

”پلیز رومی! میں تم سے اس ٹاپک پر بات نہیں کرنا چاہتا۔“

”ہمت ہار رہے ہیں ناں، مجھے معلوم ہے تایا ابو کی محبت تمہارے دل پر اثر کرگئی ہے، بھئی، ہندہ اسی طرح سے اپنے رب سے محبت کرتا ہے۔“ وہ محبت و عقیدت سے بولی۔

”محبت کا عنصر تو ہمارے دل کے بھی کسی گوشے میں ہے، لیکن یوں آنکھیں نہیں بھگتیں۔“ وہ حسرت سے بولا۔

”کوئی خاص ہوتا ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔“ وہ پُریقین ہو کر بولی۔

”یو آر رائٹ۔“ اس نے رخ پھیر کر اس کی جانب دیکھا۔

”رات میں بہت دیر سے سوئی تھی، اس لیے وہ اچانک دیکھ کر کچھ بول گئے ہوں گے۔“

”جی نہیں، ان کو تو خبر بھی نہیں تھی کہ ہم ان کے پاس بیٹھے ہیں۔“

”تو چلو تمہیں خبر ہوگئی۔“

”شاید....“ وہ بہت گہری نظروں سے بولا۔
 ”کیا ہوا شمل! تم کچھ زیادہ سیریس نہیں ہو گئے، تم اپنا موڈ ٹھیک کرو، مام دیکھ لیں گی۔“
 ”مام سو رہی ہوں گی۔“ وہ اطمینان سے بولا۔
 ”تو پاپ دیکھ لیں گے۔“ وہ شرارت سے بولی۔
 ”پاپ اس وقت.... وہ بریک فاسٹ لے کر آفس کی تیاری کر لیں گے اور فائزہ آنٹی آفس پہنچ چکی ہوں گی، یو
 نو 7:30“

”تو پھر ہم کہیں بریک فاسٹ کر لیتے ہیں۔“

”میرا موڈ نہیں ہے۔“

”محبت کی جب ایک کاری ضرب لگ جائے تو دل بدل جاتا ہے شمل! مجھے معلوم ہے کہ تم اس ماحول میں کبھی نہیں
 آئے، غریبوں کے قانون الگ ہوتے ہیں اور امیروں کے الگ۔“
 ”لیکن محبت الگ نہیں ہوتی۔“

”پتہ نہیں اب تم کس محبت کی بات کر رہے ہو۔“

”اب اتنی انجان بھی نہ بنو۔“ وہ دھکی دھکی سے لہجے میں بولا تو وہ ہنس پڑی۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ماموں میرا انتظار کر رہے ہیں، آئی شیور۔“ اس نے اپنا موبائل آن کیا۔

”7:30 پر ان کی لاسٹ کال تھی۔“ وہ دھیمے سے مسکرائی۔

”شمل! تمہارا موڈ اتنا دھکی کیوں ہو رہا ہے؟“ وہ استفہامیہ انداز میں بولی۔

”کیوں کیا میرے چہرے پر لکھا ہے؟“ وہ شرارت سے بولا۔

”ہاں ناں....!“ اس کے مسکرانے سے دانت نظر آ رہے تھے۔

”کچھ نہیں، مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا ہے۔“ وہ اپنا رخ پھیر گیا۔

”چلو جو کچھ ہو گیا ہے ناں اس کو سنبھال کر رکھنا۔“

”دل و دماغ میں بہت فرق ہے، دماغ انکار کر رہا ہے، اور دل مجبور کر رہا ہے، دونوں میں جنگ ہے۔“

”چلو دیکھتے ہیں کون ہارتا ہے، میرا خیال ہے شمل....!“ اس نے اپنے نام پر پلٹ کر دیکھا تو رومی کی ہمت جواب

دے گئی کہ وہ آگے کچھ کہہ سکتی۔

”او کے بابا! او کے، تمہارے دل کی جیت پر میں دماغ کو فقیہ دے دوں گی، ڈونٹ وری۔“

”یہ حق میں تمہیں کبھی نہیں دوں گا، نہ دل کا نہ دماغ کا۔“

”ظاہر ہے یہ دونوں تمہارے اپنے ہیں، مگر نہ میرا دماغ تمہارے پاس ہے اور نہ ہی دل تمہارے پاس ہے اور اگر آگے

ناں تو شمل، شمل نہ رہے گا۔“

”او ہو.... تمہیں اتنا بڑا گمان ہے۔“

”گمان نہیں، یہ حقیقت ہے، میں جس چیز کو چاہوں بھلا دوں، یہ میرا مقدر ہے، میں پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھتی، کچھ فیصلے

اللہ پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں ایک یقین سا تھا۔

”جیسے تم نے آنکھیں بند کر لیں۔“ وہ طنز یہ بولا۔

”ہاں جیسے تم نے گویائی کھودی تھی۔“ وہ بھی پلٹ کر بولی۔

”تو پھر کاٹو زندگی کا یہ سفر آنکھ بند کر کے۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”میں اس سفر کی عادی ہوں آزما دیکھو۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”مجھے کسی کو آزمانے کی ضرورت نہیں، اور میں یہ سفر آنکھ کھول کر طے کرنا چاہتا ہوں، اندھیرے میں نہیں، کسی کی انگلی

تھام کر نہیں، بے بسی سے نہیں۔“ وہ دھکی سا بولا۔

”ظاہر ہے تم مرد ہو، تمہیں یہ اختیار حاصل ہے، ہم سے یہ اختیار لے لیا گیا ہے، ایک عورت ہونے کے ناطے، خیر! تم چلو

چھوڑو، گھر بھی آ گیا، میں ماموں کے ساتھ ناشتہ کر لوں گی، تم چاہو تو تم بھی آ جاؤ۔“

”نہیں، میں سیدھے روم میں جا رہا ہوں، ورنہ وہ مجھے پکڑ کر بیٹھ جائیں گے، میں نے کہاں پر لاسٹ کیا، کہاں گئے، کتنا

خرچ کیا، رومی 3 دن سے گھر پر کیوں نہیں ہے۔“ وہ تیوری پر بل ڈال گیا۔

”تو تم انہیں اونٹلی جواب دو۔“ وہ اُسے زچ کر رہی تھی۔

”تو میں پرسنل لائف کا جواب دوں، کبھی انہوں نے سوچا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟“ ارج کا دھیان آتے ہی وہ ایک پل

میں ہنسی سے اتر گیا تھا۔

”شمل، شمل! پلیز ایک بار.... صرف ایک بار اپنی بات تو کلیئر کر کے دیکھو، وہ باپ ہیں تمہارے، وہ خود تمہاری زندگی

میں آسانیاں کر دیں گے۔“

”رومی پلیز! جتنا میں انہیں جانتا ہوں، اتنا تم انہیں نہیں جانتیں۔“

”جاننے کے لیے صدیوں کی ضرورت تو نہیں پڑتی، یہ تم بھی جانتے ہو۔“ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے بولی تو وہ اپنا بڑا سا

بیگ چھوڑ کر گاڑی سے باہر آ گئی تھی۔

”اور یہ بیگ....“ شمل نے پوچھا۔

”تم اٹھا کر پیچھے چلو تا کہ ماموں پر میں رعب دکھا سکوں کہ دیکھیں ہم نے کیسے کنٹرول کر لیا ہے ان کے کروڑ پتی

بیٹے کو، شمل! کسی کو دوپل کی خوشی دینے میں کیا جاتا ہے؟“

”میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”اچھا اچھا، پھر بھی زحمت کر کے اسے اٹھائیے اور چلیئے، گاڑی ڈرائیور پارک کر لے گا اور بیگ آپ اٹھا کر چلیئے شمل

صاحب!“ وہ ہنسنے جا رہی تھی۔

”دیکھو شمل! میری آنکھوں میں کوئی دکھ، کوئی ملال ہے، تم نہیں جانتے کل تایا ابو کے گھر میں قیامت کی رات تھی،

شادی کی نہیں، نہ میں سوئی نہ تایا ابو، نہ تائی اماں اور ایشل سو گئی۔ دادی کو ہم نے نیند کی ٹیبلٹ دے کر سلا دیا تھا۔“ شمل نے

غور سے رومی کو دیکھا، تو وہ ولید ہاؤس کے گیٹ پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

حماد کب آئے کب گئے یہ پل کوئی نہ جان سکا، صرف جلوہ بی بی کے دل سے کوئی پوچھتا کہ بالمش اور انگلیوں کی پوروں پر

حماد کے گرتے کی ناپ لکھی تھی، لمحوں کا حساب انہوں نے اپنے ماہ و سال کو دل پر اتار رکھا تھا، کیلنڈر کی انہیں ضرورت بھی نہ

تھی۔

پھر اچانک ایک اور تبدیلی آئی، انم ماسٹرز کرنے کے لیے حماد کے پاس چلی گئی۔ اماں کیسے بلک بلک کر روئیں تھیں،

آخری اولاد کے بچہ جانے کا دکھ، وہ کمرے کی تنہائی، سناٹا، چھوٹی شنو جو خالہ زاد تھیں، شاید وہ اماں کا دکھ بانٹنے کے لئے ان

کے نصیب کا حصہ بن گئیں، انم کے جانے کے بعد ماہم اماں سے ملنے جلدی جلدی جانے لگی تھی۔

”ارے ماہم! تم اور اس وقت....“ وہ بھری دوپہر میں اچانک پہنچ گئی تھی۔
 ”ہاں اماں! میرا دل گھبرا رہا تھا کہ آپ اکیلی ہوں گی اس لیے میں آ گئی۔“ نورانی بہشتی چہرے پر جو پانی سے بھیگ رہا تھا وہ سفید ڈھک ساڑھی سے اپنا چہرہ رگڑ رگڑ کر پونچھ رہی تھیں، شفاف چہرے پر وہ اپنی آنکھوں کا رنگ نہ چھپا سکیں، گلابی آنکھوں کے رنگ کو ماہم بھی نظر انداز کر گئی۔

”آؤ بیٹھو۔“ وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔
 ”پر دے کھلو، اندھیرا ہو رہا ہے، جاؤ دیکھو ہم نے بہت عمدہ آلو مینگن سویا ڈالوا کر بنوائے ہیں، تھوڑا سا چکھ کے تو دیکھو۔“
 ”اماں! میں کھانا کھا کر آئی ہوں۔“

”ارے ایسے ہی....“ چچے سے تھوڑا سا کھا کر دیکھ لو۔“ اماں کی محبت کا انداز ہی الگ تھا، ماہم کو یوں لگا جیسے دل کے اندر کہیں ایک برسات سسک رہی ہے، وہ بہت تیزی سے یوں پلٹ کر بچن میں آئی جیسے برسوں کی بھوک ہو، جو نبی اس نے بندھا کا ڈھکن کھولا تو زور بیہ بھائی فوراً بچن میں آ گئی تھیں اور انہوں نے جلدی سے دیکھی کو تھام لیا تھا۔

”ابھی عذیر نے کھانا نہیں کھایا۔“
 ”اچھا....“ ماہم بھی بڑی کچی چیز تھی، اس نے چچے اٹھا کر جلدی سے سبزی پلٹ میں ڈالی اور چچہ رکھ کر بولی۔
 ”چلو.... لو اب تم دے دینا عذیر بھائی کو۔“ وہ ہنسی ہوئی پلٹ تھامے اماں کے کمرے میں پلٹ آئی تھی۔
 ”کیا کہہ رہی تھی تم سے یہ؟“

”یہی کہ عذیر بھائی نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔“

”آف تو بہ....“ میں نے ہی تو سبزی خریدی اور کاٹ کر دی، پتہ نہیں یہ کیسی ہے۔“ وہ خفگی سے بولیں۔
 ”چھوڑیں اماں! مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں جانتی ہوں اس گھر کی حقیقت کو۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ ان کے اندر اور بھی تو اتنی اچھائیاں ہیں، آپ وہ بھی تو دیکھیں۔“ ماہم نہیں چاہتی تھی کہ وہ پل دوپل کے لیے آئے اور بھابی کے خلاف ان کو بھڑکا کر چلی جائے۔

☆.....☆.....☆

وہ بے حد اُداس اُداس اور تھکے تھکے انداز میں بول کر اپنا بیک چیک کر رہی تھی، اماں کی جانب دیکھا کمرے میں گہرا سناٹا تھا، انعم کے جانے سے اماں تنہا رہ گئی تھیں، وہ دکھ، وہ احساس جو اماں کے چہرے پر تھا ہر کوئی مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے، مجبوریاں ایسے موقعوں پر قدم نہیں تھامتیں، ماہم نے جب بڑا سا بیک اٹھا کر کندھے پر ڈالا، پھر پلٹ کر دیکھا تو اماں کی آنکھوں میں نجانے کتنی صدیوں کی مسافت تھی کہ اس کے قدم تھم رہے تھے، باہر سے ہارن کی آوازیں آرہی تھیں، اماں اپنی ساڑھی کی فال ٹھیک کرتی ہوئیں جلدی سے کمرے سے نکل آئی تھیں۔

”تم کہیں سے پتہ تو کرو حماد۔ کہ گھر میں انعم کیسے رہ رہی ہے؟ تم خود بھی تو ایک چکر لگا سکتی ہو، تمہارے لیے کیا مشکل ہے۔“ اماں نے بڑی گہری نظروں سے ماہم کی طرف دیکھا تھا، دل میں نجانے کتنی ٹیسیں اٹھتی تھیں، پر وہ ہنس کر کہہ رہی تھیں۔

”ابھی تھوڑے ہی دن تو ہوئے ہیں انعم کو گئے ہوئے، وہ اپنے ایڈمیشن کے چکر میں مصروف ہوگی۔“

”پھر بھی کیا کرتی ہوگی، کیسے رہتی ہوگی؟ اُسے تو کچھ کرنا ہی نہیں آتا، میں یہ بات جانتی ہوں عصمت اُسے کبھی رہنے نہیں دے گی۔“

”ارے بیٹا! تمہیں کیا بتائیں، چھوڑو تم۔“ ساڑھی کے پلو سے انہوں نے اپنا چہرہ پونچھ لیا تھا، لیکن وہ آنکھوں کی نمی کو نہ

چھپا سکیں، دل کا بھید دل رکھنے والے جانتے ہیں، آنکھوں کی نمی سمندر کی گہرائی ہوتی ہے، جس میں ماہم پور پور اتر چکی تھی، ہر ایک لمحہ مرنا، ایک ایک قطرہ جب گرتا ہے تو دکھوں کے گہرے سمندر بنتے ہیں، آج بھی اسے اس سمندر کے کھنور میں کئی چہرے نظر آئے تھے۔ سب سے گہرا چہرہ شانزے کا تھا، پتہ نہیں کہاں سے سنہرے بالوں والی شانزے کے روپ میں شنو آنکھڑی ہوئی تھی۔

”تم جا رہی ہو، اماں کو چھوڑ کر؟“

”تو تم نے کون سا وفا نبھائی ہے اماں کے ساتھ؟ پہلے ساتھ تم نے چھوڑا، میں بہت بزدل تھی، شانزے! دنیا چھوڑنے کی بات تو میں نے کی تھی، وہ تمہارے دماغ میں سا گئی۔“

”اچھا اماں! اللہ حافظ!“ اماں گیٹ تھا سے کھڑی تھیں اور آنکھوں کے پٹ میں جھانکتی ہوئی شانزے کی آنکھیں تھیں، ان گلیوں میں اس کے قدموں کی چاپ تھی، ایک عہد تھا، بچپن کا ساتھ تھا، جو دور تک بکھرا پڑا تھا، جس کو سمیٹتے سمیٹتے ماہم کی انگلیاں ریزہ ریزہ ہو گئی تھیں، آنکھوں میں بھی گہرا اندھیرا تھا، اماں گیٹ کے باہر آ گئی تھیں، بظاہر وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں، لیکن ان کی نظروں میں ماہم کا چہرہ سارہا تھا، یہی محبتوں کی بشارتیں ہیں، یہی اُلویں محبت تھی جو دلوں سے دور نہیں ہوتی۔

☆.....☆.....☆

”اور تمہارا نیا پروجیکٹ اب کیا ہے؟“ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے وہ بولی۔

”کون سا پروجیکٹ؟“ اس نے موبائل میں گیم کھیلتے ہوئے نظریں اٹھا کر رومی کو دیکھا۔

”وہی جو تمہارا ہاٹ ایٹو ہے۔“ اس کے لہجے میں کچھ تو تھا۔

”کون سا ہاٹ ایٹو؟“ وہ واقعی کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔

”جس پروجیکٹ پر مامی کام کر رہی ہیں۔“ وہ چونک گیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ حیرانی سے بولا۔

”رومی والے پروجیکٹ پر....“ میں ایک نیا پروجیکٹ ہوں، ولید ہاؤس میں، میں ایک ہاٹ ایٹو ہوں۔“

”فضول کی باتیں مت کرو۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”اچھا میں فضول کی باتیں کر رہی ہوں؟“ رومی نے غصے سے کہا۔

”آف کورس۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”یہ فضول کی بات نہیں ہے، کل رات میں نے تمہاری مام کے میسجز پڑھے تھے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

”سو واٹ.... تمہیں اس سے کیا؟“

”میں جانتا چاہتی ہوں کہ ہم کس فلائٹ سے باہر جا رہے ہیں؟“ وہ سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔

”اوہ نو.... رومی! فارگا ڈسک، مت کرو ایسی باتیں، میں نے خود مام سے بات کی ہے کہ رومی راضی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ جو بھی فیصلہ ہو تم مجھے انوالو کرو، اور جلد از جلد فیصلہ کرو، میں بھی اذیت سے گزر رہی ہوں۔“ وہ دکھ سے بولی۔

”فی الحال میڈم! دادی نے مجھ سے کہا ہے کہ شام میں آپ ارسلان کے ویسے میں جا رہی ہیں، موصوف! آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”جسٹ شٹ اپ، تم ارسلان سے جیلس ہوتے ہو۔“ وہ غصے سے بولی۔

”میں ارسلان سے جیلس ہوتا ہوں؟“ وہ طنز یہ بولا۔

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ

آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ

لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

”آف کورس، تمہاری باتوں سے مجھے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ تم اُسے پسند نہیں کرتے، کیوں؟“ وہ اُسے چوارہ ہی تھی۔
”جی نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔
”یقیناً میری ذات کے حوالے سے تم نے اُسے مجھ سے اٹیچ کر دیا ہے، وہ بہت سیدھے سادھے اور شریف انسان ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔
”جی جی وہ تمہاری تائی اماں کا ہاتھ نہیں روک سکا، بزدل کہیں کا، چوہا ہے وہ، میں تو اُسے بچپن سے جانتا ہوں۔“
”آپ تو جیسے شیر ہیں ناں، آپ نے تو روک لیا ماما کو، آپ خود کتنے بڑے بزنس مین ہیں، گولڈ کی طرح مجھے خرید کر مارکیٹ میں گیش کروا رہے ہیں آپ لوگ، کتنے ڈالر آپ لیں گے ولید ماموں سے؟“ اشمیل یہ بات سن کر کھول اٹھا تھا۔
”دیکھو رومی! تم لمٹ کر اس کر رہی ہو۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔
”اشمیل! میں تمہیں اور تمہاری مام کو جانتی ہوں، سوکالٹ، ارج اور رومی کے درمیان بارگینگ کر رہے ہو تم لوگ۔“ اس کے لہجے میں ایک سچائی تھی۔
”آئی سیڈنٹ اپ، میں کہیں نہیں جا رہا، میں نے ماما کو انکار کر دیا ہے۔“ وہ غصے سے بولا۔
”جی اس لیے کہ آپ کا پاسپورٹ ولید ماموں کے بریف کیس میں ہے اور اس کا نمبر تم نہیں جانتے، بائی داوے، میں بتا دوں وہ نمبر؟ میں جانتی ہوں اور تمہاری ماما کو بھی یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ وہ ناکام ہو چکی ہیں۔“ وہ طنز یہ بولی۔
”بٹ بائی داوے، میں ایمپلی سے رابطہ کر سکتا ہوں، میں ٹیشنل ہوں، میں امریکن شی زن ہوں، لیکن میں ایسا نہیں چاہتا، ماما نے مجھ سے کئی بار کہا ہے، مگر اس سے پاپ زیادہ ہرٹ ہوں گے، میں پاکٹ مار نہیں ہوں۔“ اس نے اُسے تنبیہ کی۔
”اچھا تم یہ کہہ رہے ہو، تم نے کبھی سوچا کہ ایک لڑکی کو داؤ پر لگا کر تم اپنی محبت ارج کو حاصل کرنا چاہتے ہو، دیٹ از ناٹ فیئر، اپنی مجبوری کو میری بیس بنا رہے ہو۔“ اس کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے۔
”رومی! اون منٹ، تم جو چاہ رہی ہو، بولے چلی جا رہی ہو۔“ اس نے وارن کیا۔
”تکلیف ہو رہی ہے سن کر کہ تم ناکام ہو چکے ہو؟“ وہ اس بار کچھ غصے سے بولی۔
”جی نہیں، ماما نے جو کچھ کہا ہے وہ سن کر تم برداشت بھی نہیں کر سکو گی، ففٹی پرسنٹ مجھے لگتا ہے کہ وہ سب سچ ہے۔“ اس بار اس کا لہجہ پُرسوج تھا۔
”لیکن وہ کیا بات ہے، مجھے بھی تو پتہ چلے؟“ اس نے پُر زور لہجے میں پوچھا۔
”اس کی حقیقت جس دن سامنے آئے گی اس دن میں خود تمہیں دور کر دوں گا، ولید ہاؤس میں، میں تمہیں تماشہ بننے نہیں دوں گا، تم جہاں سے آئی ہو، وہاں واپس جاؤ گی، میں نے ماما سے وعدہ کیا ہے۔“ وہ گہری سوچ میں گم تھا۔
”کیسا وعدہ، کون سا وعدہ؟“ وہ سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔
”یہ تم کبھی نہیں جان سکو گی، میں اتنا گرا ہوا بھی نہیں ہوں کہ تم اپنی لمٹ کر اس کر لو اور میں سب کچھ دیکھتا ہوں۔“ وہ غصے سے اٹھا تو وہ اس کے پیچھے لپکی تھی کہ۔
”میری بات سنو، میری بات سنو۔“ مگر وہ وہاں سے جا چکا تھا۔
وہ بہت تیز ڈرائیو کر رہا تھا اور اس سے تیز اس کا ذہن کام کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

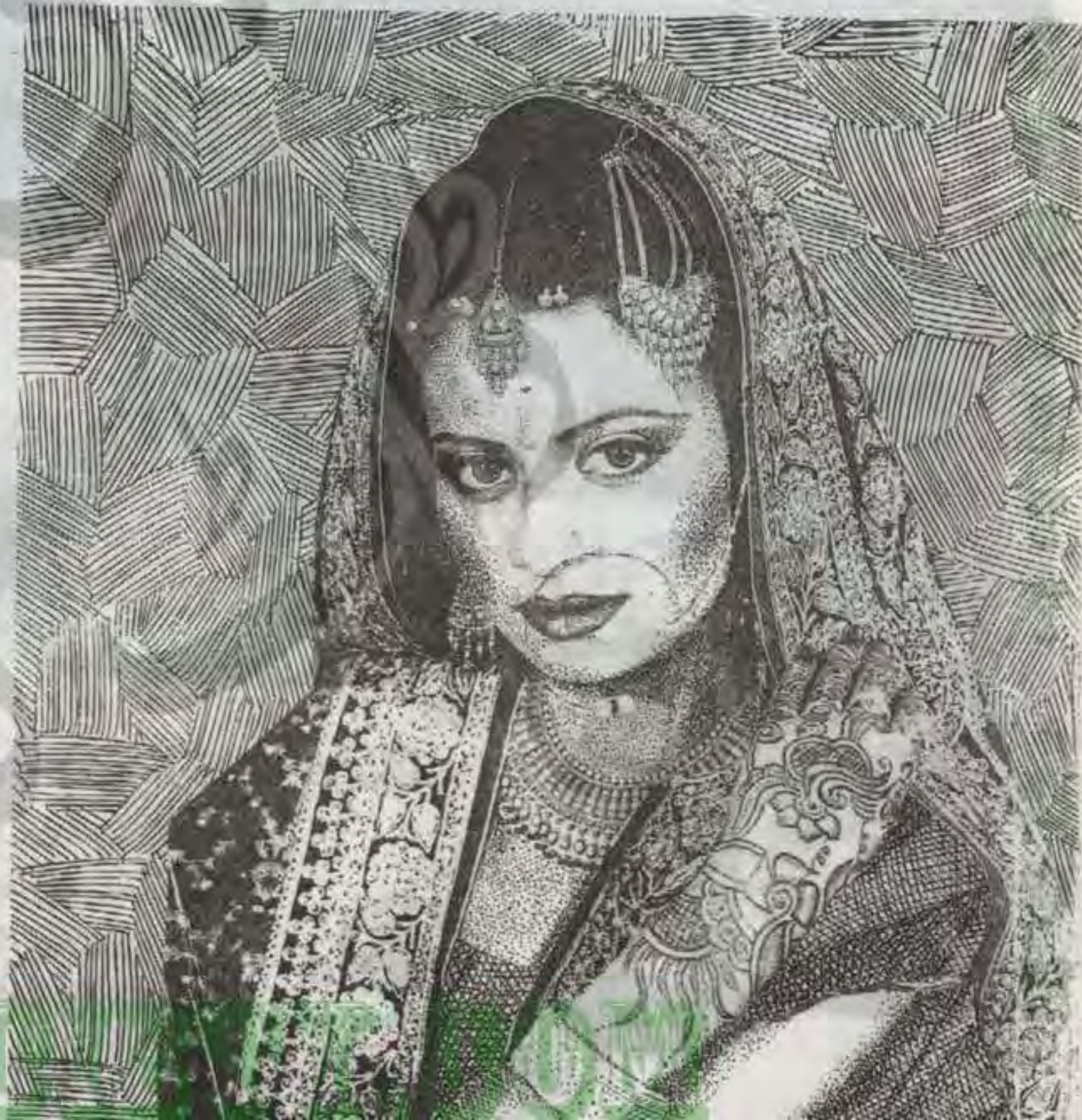
قمر و شہک

آخری قسط۔

مکمل ناول

دلوں کے مدن

”وہ نہیں، نہیں، مجھے انابیہ بہت پسند آئی ہے، میں اُسے اب کہیں نہیں جانے دوں گی، بڑی مشکل سے چاہے وہ کسی بھی حالت میں ہوئی ہو، تیری شادی تو ہوئی، انابیہ اب میرے پاس ہی رہے گی، فاروق سے میں خود بات



کر لوں گی، تو مجھے ان کے پاس لے کر چل، بلکہ ابھی لے کر چل۔“

”ارے، ارے، بی جان! آپ تو عقلی پر سرسوں جمار ہی ہیں، اس لیے تو میں آپ سے چھپا رہا تھا۔“
”مگر میں بھی تیری ماں ہوں، تیرے ایک ایک رنگ سے واقف ہوں، نو ماہ تجھے اپنی کوکھ میں رکھا ہے، اور چلا ہے مجھ سے ہر بات چھپانے۔“ وہ اُسے گھور کر رہ گئیں۔
”بی جان! آپ سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر آپ مجھے جانتی تو ہیں، میری عادت و اطوار سنجیدہ مزاج ہے میرا، اور انابیہ ایک امیچو رسی لڑکی ہے۔“

”ہیں... وہ کیا ہوتا ہے بھلا؟“

”نا سمجھ۔“ انابیہ کی بچوں والی ضدیں یاد آ گئیں اُسے۔

”ارے، تو کیا ہوا؟ مانا وہ تم سے بہت چھوٹی ہے، مگر دیکھ لینا دو، تین بچے ہوں گے تو بالکل ٹھیک ہو جائے گی، ساری سمجھ آ جائے گی اُسے۔“



”بی جان! آپ بھی ناں۔“ وہ مڑی طرح جھینپ کر رہ گیا۔

”بس اب میں کچھ نہیں سنوں گی، بلکہ آج ہی پورے گاؤں میں مٹھائی کے ٹوکڑے بٹاؤں گی، ابھی رحیم یار کو گاؤں بھینتی ہوں۔“ وہ تو خوشی سے پاگل ہی ہوئی جا رہی تھیں، تو سید ابہتاج عالم نے جلدی سے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”بی جان! کیا کر رہی ہیں آپ، اگر اس طرح کریں گی تو سرد اصفہانی کو سب خبر ہو جائے گی۔“

”ارے ہاں، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا ابہتاج پتر! اس سرد شیطان سے کب جان چھٹے گی؟“ ان کی رنگت بدل گئی تھی، سرد اصفہانی کے لیے نفرت سی بھرنے لگی ان کے لب و لہجے میں۔

”بہت جلد، اس کو تو ایسے جہنم رسید کروں گا کہ ہزار بار بھی سوچے گا تو کسی کو دھوکا دینے کی جرأت نہیں کرے گا۔“ ان بڑی بڑی آنکھوں میں غصے کے نفرت کے سرخ ڈورے نمایاں ہونے لگے تھے۔

”خیر! آپ یہ سب چھوڑیں، یہ سب میرے سوچنے اور کرنے کے کام ہیں، آپ انا بیہ کو دیکھ لیں، اُسے بہت تیز بخار ہے، اور اوپر سے وہ کچھ کھاتی بھی نہیں رہی ہے۔“

”تو اس میں بھی تیری غلطی ہے، اگر پہلے دن ہی بتا دیتا، تو بچی اتنی بیمار نہ ہوتی، اب دیکھنا میں اُسے ایک دن میں کیسے ٹھیک کرتی ہوں؟“ انا بیہ کا خیال آتے ہی وہ کھڑی ہوئیں۔ ان کے جانے کے بعد سید ابہتاج عالم نے اسپتال فون کیا تھا، فاروق خان کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔

☆.....☆.....☆

”کچھ پتا چلا؟“ سرد اصفہانی آفس میں بیٹھا تھا، اس نے ہر جگہ پتا کروالیا تھا، مگر کچھ پتا نہیں چل رہا تھا دونوں کا۔

”نہیں سر! مگر مجھے لگتا ہے اس میں سید ابہتاج عالم انوا لو ہیں۔“

”ہاں، اب تو مجھے بھی شک ہوتا جا رہا ہے، سید ابہتاج عالم پر، مگر مسئلہ یہ ہے کہ اگر اس کو معمولی سا بھی شک ہوا کہ ہم اس پر نظر رکھے ہوئے ہیں تو وہ ہمیں چھوڑے گا نہیں، وہ تو اڑتی چڑیا کے پر گننے والوں میں سے ہے، اگر انا بیہ اور فاروق اس کے قبضے میں بھی ہوئے تو ہم چاہ کر بھی دونوں کو وہاں سے نہیں نکال سکتے، لیکن سرد اصفہانی نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھلی ہیں، میرے پاس بھی اتنے کپے کاغذات ہیں کہ کوئی مائی کالال بھی انہیں پہچان نہیں سکے گا، فاروق کو 200 کروڑ کے عوض اپنی بیٹی سے میری شادی کرنی پڑے گی۔“

”مگر سر! یہ تو بھی ممکن ہو سکے گا جب ان دونوں کا کچھ پتہ چلے۔“

”ہاں، تم ایک بار پھر پورے کراچی کی تلاشی کراؤ، وہ کہاں جاسکتے ہیں؟ ان دونوں کی اس کراچی شہر میں کوئی تو جائے پناہ ہوگی، کیونکہ کراچی سے باہر تو وہ گئے نہیں ہیں، ریلوے اسٹیشن، ایئر پورٹ سے بھی پتا کرا لیا ہے؟ وہ یہیں کراچی میں ہیں، ایک بار پھر ڈھونڈو۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے سر! ہم پورا کراچی ایک بار پھر دیکھ لیں گے، سوائے سید ابہتاج عالم کے“ وائٹ محل“ کے۔“

”تو پھر کیا کریں مایہ ناندہ بھینیں کوئی؟“

”وہاں کے ملازم تو وہاں کے کتوں سے زیادہ وفادار ہیں، اپنی جان تو دے سکتے ہیں، مگر زبان نہیں کھولیں گے۔“

”تو پھر ہمیں اندھیرے میں تیر چلانا پڑے گا۔“

”مطلب سر؟“

”ٹرن.... ٹرن۔“ فون کی گھنٹی بجی تو سرد اصفہانی نے ریسو کیا۔

”سر! سید ابہتاج عالم آئے ہیں۔“ سرد اصفہانی چند لمحوں کے لیے چپ ہو کر رہ گیا، صرف چند لمحوں کے لیے رنگت بدل گئی تھی، جانے کیوں دل میں ڈر و خوف نے سر اٹھایا تھا، شاید دل میں چور تھا، سامنے بیٹھا منیجر بھی سرد اصفہانی کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”سر! آریو آل رائٹ؟“ منیجر فکر مندی سے بولا۔ سرد اصفہانی نے چونک کر پہلے منیجر کو دیکھا، پھر بیکریٹری سے کہا۔

”تم انہیں اندر بھیج دو۔“

”سید ابہتاج عالم آیا ہے، چلو اندھیرے میں تیر چلانے کا وقت آ گیا ہے۔“ اس نے جلدی سے خود پر کنٹرول کر لیا تھا، آج آ منسا سامنا ہو گیا تھا۔ دروازہ کھولے سید ابہتاج عالم مضبوط قدموں سے چلتا ہوا جیسے پربالکل سرد اصفہانی کے سامنے بیٹھا تھا، گرے کلف لگے کاشن کے شلوار قمیض پر براؤن بھاری شال جوڑے کندھے پر ڈالے وہ سرد اصفہانی کو بغور دیکھ رہا تھا، سرد اصفہانی اس کی بارعب شخصیت کے آگے بہت چھوٹا لگ رہا تھا، مگر وہ پھر بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”اور سناؤ، سرد اصفہانی! کیا حال ہیں؟ سنا ہے اب کی بار بہت اونچا اڑ رہے ہو؟“

”میری چھوڑو، میں تو جو کر رہا ہوں سب کے سامنے کر رہا ہوں، مگر تم نے تو بازی ہی ماری، لیکن اگر تم سوچ رہے ہو کہ تم جیت جاؤ گے تو میں ایسا ہونے نہیں دوں گا، بہتری اسی میں ہے کہ ان دونوں کو میرے حوالے کر دو۔“ اس نے سوچا کہ سید ابہتاج عالم کے چہرے کی رنگت بدل جائے گی، مگر وہ تو اسی اعتماد سے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا، جیسے اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔

”اگر تم نے اندھیرے میں تیر چلایا ہے تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تمہارا تیرا یہاں نہیں گیا، فاروق خان اور انا بیہ میرے ہی پاس ہیں اور یہ جو تم نے دو سو کروڑ کا فراڈ کیا ہے ناں، بہتری اسی میں ہے کہ شرافت کے دائرے میں آ کر سب کلیئر کر دو، ورنہ تمہیں دھوکا دہی کے الزام میں نہ صرف سلاخوں کے پیچھے رہنا پڑے گا ساری زندگی، بلکہ ڈبل قیمت بھی ادا کرنا ہوگی فاروق خان کو۔“

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“

”یہ تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ میں دھمکیوں جیسی چھوٹی حرکتیں نہیں کرتا ہوں، سید حائل پر یقین کرتا ہوں اور ابھی تمہیں صرف سمجھانے آیا ہوں، آرام سے سمجھ جاؤ تو ٹھیک، ورنہ پھر تم نہیں چاہو گے کہ میں کسی قسم کی کوئی زحمت کروں۔“ چند لمحوں کے لیے سرد اصفہانی نے سید ابہتاج عالم کو بغور دیکھا تھا، دل میں ایک ڈرنے سر اٹھایا تھا، جس کا سرد اصفہانی نے بڑی بے دردی سے سر پٹل دیا تھا۔

”دیکھو سید ابہتاج عالم! یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے، تم اس معاملے سے دور رہو، اور میرے پاس ثبوت ہیں، وہ سارے کاغذات بھی ہیں جن پر فاروق خان کے دستخط ہیں۔“

”تمہارے ثبوتوں کو مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے؟ تم جیسے کرپٹ شخص کے لیے کوئی مشکل بات نہیں کہ وہ کہاں سے ثبوت اکٹھے کر سکتا ہے، اور کس طرح دستخط کروا سکتا ہے۔“

”مگر میں نے فاروق کے سامنے چوائس رکھی تھی۔“

”تمہاری چوائس تمہاری سوچ کی طرح گھٹیا ہے سرمد اصفہانی!“

”چلو میں نے صرف گھٹیا سوچ سوچی ہے، مگر تم نے تو اس پر عمل بھی کر لیا۔“ سرمد اصفہانی طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے انابیہ کی طرف اشارہ کرنے لگا، اور اس کا اشارہ تو وہ بہت اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

”ہاں، سید ابہتاج عالم! اگر تم چاہو تو ہمارے بیچ ڈیل ہو سکتی ہے، اتنے دن انابیہ کو تم نے اپنے پاس رکھا ہے، اندازہ تو ہو گیا ہو گا وہ کس قدر حسین ہے، اس کا نو خیز حسن کسی بھی عابد وزاہد کے ہوش و حواس گم کر سکتا ہے، تم اور میں تو ایک عام سے انسان ہیں۔“ بہت کمینگی تھی اس کے چہرے پر۔

”پہلی بات تو یہ کہ مجھے اپنے جیسے گھٹیا شخص کے ساتھ ملا کر گالی مت دو، میں تمہاری طرح نفس کا غلام نہیں ہوں، اپنے نفس کے گھوڑوں پر قابو کرنا آتا ہے، اور دوسری بات جس لڑکی کے بارے میں تم نے ابھی فضول گفتگو کی ہے، تو یہ آخری بار ہے، آئندہ اس کے بارے میں بولنا تو دور، سوچنے کی غلطی بھی مت کرنا، کیونکہ انابیہ اب میرے نکاح میں ہے، میری عزت و آبرو ہے، اور یہ تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارے خاندان کی طرف میلی آنکھ اٹھانے والوں کا ہم کیا حشر کرتے ہیں؟“ یہ بازی تو سرمد اصفہانی ہار گیا تھا، انابیہ اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی، یہ سوچ کر ہی سرمد اصفہانی کو اپنی بے وقوفی، اپنے دیر ہو جانے پر جی بھر کے افسوس ہوا تھا، کاش! کہ وہ اسی دن انابیہ کو اٹھوا لیتا جس دن پہلی بار اسے دیکھا تھا، سرمد اصفہانی کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کا سید ابہتاج عالم نے بغور جائزہ لیا تھا، سرمد اصفہانی نے سید ابہتاج عالم کو دیکھا تھا، اس کی باتوں پر ایک لمحے کے لیے سہم بھی گیا تھا، مگر اپنی شیطانی سوچوں پر بند نہیں باندھ سکتا تھا۔

”پھر بھی بولتے ہو کہ تم نفس کے غلام نہیں ہو؟“

”میں نے کہا ناں کہ آئندہ اس ٹاپک پر بات مت کرنا، اپنی دین، یہاں میں تمہیں صرف سمجھانے کے مقصد سے آیا ہوں، تمہارے لیے بہتری اسی میں ہے کہ فاروق خان کے وہ دو سو کروڑ کے شیئرز انہیں واپس کر دو، ورنہ جن ثبوتوں کی تم بات کر رہے ہو اور کس طرح تم نے ہیر پھیر کی ہے، اور ان سب لوگوں کو بھی آدھے گھنٹے میں تمہارے ہی آفس میں، تمہارے سامنے، تمہارے خلاف کھڑا کر سکتا ہوں، مگر تھوڑی سی رعایت دے رہا ہوں۔“

”تم مجھے ڈرا رہے ہو سید ابہتاج عالم؟“

”تم جو بھی سمجھ لو۔“

”تو ٹھیک ہے، میں بھی دیکھتا ہوں انابیہ تو مجھ سے بچ گئی، مگر دو سو کروڑ ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا، فاروق خان کو وہ پیسے مجھے واپس کرنے ہوں گے۔“ سرمد اصفہانی غم و غصے کی شدت سے پاگل ہو رہا تھا، اس سے انابیہ کا ہاتھ سے نکل جانا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

”اوکے سرمد اصفہانی! اب مجھے چلنا چاہیے، مگر میں تمہیں دو دن کا ٹائم دے رہا ہوں، پھر اس کے بعد جو کارروائی کروں گا اس کا تصور واریا ذمہ دار مجھے مت ٹھہرانا۔“ سید ابہتاج عالم اپنی جیسٹ سے کھڑا ہو گیا، سرمد اصفہانی اس کو صرف گھور کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

سید ابہتاج عالم کی بلیک پجارو ”وائٹ محل“ کے بڑے پورچ میں آکر کڑکی تھی، جہاں پہلے ہی سے ہر ماڈل کی سات، آٹھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اللہ بخش فوراً آگے بڑھا تھا، گاڑی کا دروازہ کھولنے، رات کے دس بج رہے تھے،

وہ جیسے ہی اندر انٹر ہوا، نوری کسی چراغ کے جن کی طرح حاضر ہوئی۔

”سائیں! کھانا گرم کر کے ٹیبل پر لگا دوں؟“

”بی جان نے کھالیا؟“

”جی سائیں! انابیہ بی بی کے ساتھ کھالیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“ وہ آگے بڑھا۔

”سائیں! کھانا.....؟“

”نہیں رہنے دو، مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ بی جان کے بیڈ روم میں داخل ہوا، بی جان یقیناً سائیڈ روم میں ہوں گی، کیونکہ یہ وقت ان کی عشاء کی نماز و وظائف کا تھا، اس کی نظر سیدھی بی جان کے فل سائز بیڈ پر پڑی جہاں وہ ہوشربا بے پناہ حسن کی مالک، نازک سی لڑکی سینے پر کبل ڈالے بے خبر سو رہی تھی، جانے کیا سوچ کر وہ آگے بڑھا اور اس کے سائیڈ میں بیٹھ گیا، اور بغور اس کے چہرے کو تکتا چلا گیا تھا۔

”ابہتاج پٹر! تیری وہٹی (بیوی) بہت خوبصورت ہے، ایسا لگتا ہے جنت کے میوے کھا کے جوان ہوئی ہے۔“ بی جان کا جملہ اس کے کانوں میں گونجتا ہوا دل کے آر پار ہوا تھا۔

”وہ اس قدر حسین ہے، اس کا نو خیز حسن کسی بھی عابد وزاہد کے ہوش و حواس گم کر سکتا ہے، اور میں تو ایک عام سامعہ مولی انسان ہوں۔“ سرمد اصفہانی کا یہ جملہ اس کے اطراف زور و شور سے گونجتا تھا۔

یہ وہ چہرہ تھا جسے ناچاہتے ہوئے بھی سید ابہتاج عالم سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا، جو بڑے دھڑلے سے پورے طمطراق کے ساتھ اس کے دل کی مسند پر براجمان ہو گیا تھا، بڑی بڑی آنکھیں جن میں اس نے ہمہ وقت ایک ڈرو خوف ہلکورے لیتے دیکھا تھا، یا پھر ایک سمندر موجزن ہوتے دیکھا تھا، وہ قدرت کا کوئی کرشمہ ہی تو تھی، جسے دیکھ کر خدا کی قدرت کی بیساختہ تعریف دل سے ادا ہو، یقیناً جب وہ بہت فرصت میں ہو گا تب یہ حسین شاہکار تیار کیا ہو گا، مگر بعض اوقات حسن بھی کتنا مہنگا پڑ جاتا ہے، انابیہ اپنے بے پناہ حسن سے انجان ہی تو تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا کیا قیامتیں ٹوٹی ہیں اس کے بابا پر، خود اس کے اس بے پناہ حسن کی وجہ سے، اور اس کے حسن کی یہ خامی بھی یا خوبی کہ وہ حد درجہ سادہ اور معصوم تھی، جس نے سرمد اصفہانی جیسے رنگین مزاج انسان کو اٹریکٹ کیا، اُسے پانے کے لیے وہ ایڑی چونی کا زور لگا رہا تھا۔

”مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، انابیہ اور فاروق خان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“ سید ابہتاج عالم کو ایسا لگا جیسے وہ سانس نہیں لے رہی ہو، اس کا وجود بالکل ساکت و جامد ہو گیا ہو، شاید یہ اس کا گمان تھا، وہ اس کو محسوس کرنے کے لیے تھوڑا سا اس کے چہرے کے قریب جھکا تھا، اس کی سانس محسوس کرنے کے لیے اپنا گال اس کے چہرے کے نزدیک کر لیا، کیا احساس تھا، کیسی گرمی سی تھی جو پوری شدت سے محسوس ہوئی تھی کہ اسی پل وہ ہر نی آنکھیں دا ہوئی تھیں، اس کی سمجھ سے بالاتر تھا یہ سب کچھ، وہ ایک جھٹکے سے جو اٹھی تو اس کے شکر فی لب جھٹکے ہوئے سید ابہتاج عالم کے گال سے مس ہوئے تھے، اس افتاد کے لیے وہ دونوں قطعی طور پر تیار نہیں تھے۔

لمحوں میں ہی یہ کیا ہوا، کچھ سمجھ نہیں آیا، سید ابہتاج عالم نے نہایت سکون و اطمینان سے اُسے دیکھا تھا، جبکہ اس کی نسبت انابیہ کے دل کی دھڑکنیں اتنی زور سے شور کر رہی تھیں، جیسے پسلیوں سے نکل کر ابھی باہر آ جائیں گی، چہرے کی رنگت میں گلال سا گھلنے لگا تھا، پلکیں لرز کر رخسار پر ہی گری ہوئی تھیں، گھبراہٹ نے بھی جیسے اس کے سندر کھڑے کا احاطہ کیا ہوا تھا، سید ابہتاج عالم اس کے چہرے کی رنگت کو بغور دیکھتا ہوا کھڑا ہوا، بہت مضبوط

اعصاب کا مالک تھا وہ، خود پر کنٹرول کرنا وہ اچھی طرح جانتا تھا، ورنہ انا بیہ جیسی حسن کی مالک جس سے شرعی و قانونی رشتہ ہو، کیسے اس سے رات کے اس پہر نظر پھیر سکتا تھا؟

”کیسی ہوا ب؟“ گھمبیر و بھاری لب و لہجے میں کیے گئے سوال پر انا بیہ نے گھمیری پلکیں بمشکل اوپر اٹھائیں، اس کی تو جیسے جان ہی نکل گئی ہو، بولنے و سننے کی صلاحیتیں مفلوج سی ہو گئی ہوں۔ سید ابہتاج عالم کو تو سوچ پڑھنے میں کمال حاصل تھا، لفافہ دیکھ کر ہی اس کے اندر کا مضمون جان لیتا تھا وہ تو، عنابی گداز لبوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ رہتی تھی اور پھر بغیر کچھ اور کہے وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد انا بیہ نے اپنا رُکاوہ سانس بڑی مشکل سے بحال کیا تھا، آرام سے وہ اٹھ کر بیٹھی تھی اور اس کے کمرے سے جانے کی تصدیق کرنے کو اپنے اطراف دیکھا، جب یقین ہو گیا تو وہ بیڈ سے نیچے اتری اور جلدی سے جا کر دروازے کو لاکڈ کر کے اس سے ٹیک لگا کر دل پر ہاتھ رکھے ہلچل کرنی دھڑکنوں کو قابو کرنے کی سعی کرنے لگی۔ سید ابہتاج عالم اپنی خواب گاہ میں انٹرواڈیل میں ایک عجیب سا احساس تھا، آنکھوں میں ایک الگ ہی چمک تھی، عنابی لبوں پر دلکش سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا، آج کی رات ہر رات سے مختلف رات تھی۔

وہ مضبوط قدم دھرتا ہوا قد آدم آئینے کے آگے کھڑا ہو گیا، سرمئی کلف لگے کاشن کا گرتا شلوار جس پر چوڑے شانے پر بھاری گرے شال رکھی تھی، اس نے آئینے میں بغور خود کو دیکھا تھا، سرخ و سفید چہرے پر الگ ہی چمک تھی، سیاہ گھنی مونچھوں کے نیچے عنابی گداز لبوں پر تھیلی دلفریب مسکراہٹ کیا کہانیاں سنار ہی تھی، بڑی بڑی سیاہ روشن آنکھوں میں کسی کا عکس پورے حق سے جھلملا رہا تھا، نظر پورے چہرے پر سے ہوتی اس گال پر جاٹھری جہاں کچھ دیر پہلے کسی کا نادانستگی میں ایک لمس ٹھہر گیا تھا۔ ایک چھنا کے سے وہ گھبرایا، شرمایا، جھکتا خود میں سمٹتا چہرہ آئینے پر ابھرنے لگا تھا۔ سید ابہتاج عالم کے دل و دماغ نے بیساختہ اس ابھرتے چہرے پر اپنی چوڑی تھیلی پھیری تھی، مگر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ عکس مزید گھبرا کے چھپ گیا ہو، سید ابہتاج عالم کو آئینے میں اپنا عکس دکھائی دیا، اس نے اپنے گال پر اپنی انگلیاں پھیریں۔

”تو سید ابہتاج عالم! تم پر اب یہ وقت آ گیا ہے کہ کوئی پری ویش اپنے پورے وجود سمیت بنا تمہاری اجازت کے بڑے دھڑلے سے تمہارے دل و دماغ پر قابو پا چکی ہے، وہ تمہارے دل کی مسند پر قبضہ کر چکی ہے اور تم کو ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع بھی نہیں ملا۔“ خود سے بولتا وہ ہولے سے ہنس دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”پھر کیا سوچا سر! آپ نے؟ ہمیں یہ تو پتا ہے کہ فاروق خان کس کے پاس ہیں، مگر یہ پتا نہیں چل رہا کہ سید ابہتاج عالم نے انہیں کہاں چھپا کے رکھا ہے؟“ سرد اصفہانی کا منہجرا اس کے آفس میں بیٹھا رپورٹ دے رہا تھا۔

”اتنا پتا کروایا، مگر دونوں کا کہیں کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔“ صرف سید ابہتاج عالم کا محل نما گھر رہ گیا تھا، جس کے بارے میں سوچنا شیر کی کچھاڑ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔

”میرا شک ہی نہیں یقین بھی ہے کہ سید ابہتاج عالم نے ان دونوں کو اپنے محل میں ہی رکھا ہے۔“ سرد اصفہانی کے لب و لہجے میں نفرت کی چنگاری تھی۔

”سر! یقین تو مجھے بھی ہے، مگر ان کے محل میں جائے گا کون؟ اور پھر سر! ایک تشویش کی بات تو اور بھی ہے کہ انہوں نے عدالت سے نوٹس بھجوا دیا ہے۔“

”ہوں.... یہی تو سوچ رہا ہوں کہ آگے کا کیا لائحہ عمل طے کرنا ہوگا، مگر میں بھی ہار نہیں مانوں گا، سید ابہتاج عالم

کو پیچھے ہٹنا ہوگا۔“ اس دوران سرد اصفہانی کا پرسنل ڈسکرت ان کی باتوں میں مداخلت کر گیا، اس نے اپنا سیل فون دیکھا، جہاں اسکرین پر ”سید ابہتاج عالم“ کا لنک جگمگا رہا تھا۔

”ہیلو!“ سرد اصفہانی نے موبائل کان سے لگایا۔

”نوش تو تمہیں مل ہی گیا ہوگا سرد اصفہانی!“

”ہاں، مل گیا ہے، دیکھو سید ابہتاج عالم! یہ تمہارا میٹر نہیں ہے، تم پیچھے ہٹ جاؤ۔“ اس کے لہجے کی بے بسی پر سید ابہتاج عالم نے ایک جاندار قہقہہ لگایا تھا۔

”آج تمہارے لہجے میں اتنی بے بسی و عاجزی کیوں سرد اصفہانی؟“ سرد اصفہانی کو اس کی بات پر غصہ تو بہت آیا، مگر اس کی خاموشی میں ہی بھلائی تھی۔

”دیکھو! میں بات کو مزید آگے بڑھانا نہیں چاہتا، بہتری اسی میں ہے کہ فاروق خان اور میرے معاملات میں تم دخل اندازی مت کرو۔“

”وہ کیا ہے ناں سرد اصفہانی! تم اسے اپنی بد قسمتی کہہ لو یا میری خوش قسمتی کہ فاروق خان رشتے میں میرے سُسر ہوتے ہیں۔“

”ہوں.... سُسر.... تمہیں شرم تو نہیں آئی، اپنی عمر سے اتنی چھوٹی سی لڑکی سے شادی کرتے ہوئے۔“ وہ طنز کر کے سید ابہتاج عالم کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں نے تو جائز راستہ اپنایا ہے سرد اصفہانی! مگر تم اپنی گھٹیا سوچ کے بارے میں کیا کہو گے؟ لیکن خیر! یہاں میں تمہارا بہت مشکور ہوں کہ یہ تمہاری ہی مرہون منت ہے کہ انا بیہ جیسی خوبصورت لڑکی میری شریک حیات بنی ہے، وہ اب میری بیوی، میری عزت و آبرو ہے، میرے خاندان اور میری نسل بڑھانے کی علمبردار، اگر آج کے بعد اُسے ڈسکس کیا تم نے تو اچھی طرح سوچ لو سرد اصفہانی! تمہارے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ گنتے گنتے ایک عمر بھی کم پڑے گی، ہم سندھی وڈیرے ہیں، اپنی عزت پر آنکھ اٹھانے والوں کی آنکھیں نوچ لیا کرتے ہیں، اس لیے تمہیں وارن کرتا ہوں، میرے اندر کے سندھی وڈیرے کو جگانے کی کوشش مت کرنا، ورنہ تمہارا خاندان ہی نہیں، تمہاری آنے والی سات پشتیں بھی تمہارے عبرت ناک انجام سے پناہ مانگیں گی، اس لیے میں نے تمہیں جو نوٹس بھجوا دیا ہے اس پر عمل کرو اور دو سو کروڑ فاروق خان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرو، ورنہ یہ تو صرف قانونی کارروائی ہے، اگر میں نے کارروائی کی تو اس دنیا کے کسی بھی حصے میں تمہیں چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی اور آج کل ویسے بھی میرے پالتو کتوں کو انسانی گوشت کا بڑا چمکا لگا ہوا ہے۔“ سرد اصفہانی تو حج معنوں میں اندر تک کانپ کر رہ گیا تھا، سید ابہتاج عالم نے اس کا سارا کھیل بگاڑ دیا تھا اور سید ابہتاج عالم جو کہہ رہا تھا وہ اس پر عمل بھی کرے گا، یہ بھی وہ جانتا تھا، سب کچھ بالکل ٹھیک جا رہا تھا، فاروق خان کو اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ سرد اصفہانی کے دو سو کروڑ کا اس سے نقصان ہوا ہے، جسے اُسے ہر صورت ادا کرنا ہے اور اگر نہ کر سکا تو اس کی حسین ترین بیٹی دو سو کروڑ کے عوض دینی پڑے گی، اور انا بیہ اس کے پاس آ بھی جاتی، مگر سید ابہتاج عالم نے آ کر سارا معاملہ ہنس نہس کر دیا تھا، اور اس کی راہ میں آنا موت کو دعوت دینا تھا، کیونکہ اس کا مقابلہ وہ نہیں کر پائے گا، لیکن وہ ہار بھی نہیں ماننا چاہتا تھا۔

”کیا بات ہے سر! کیا کہہ رہے تھے سید ابہتاج عالم؟“ منہجرا تشویش زدہ نظروں سے سرد اصفہانی کو دیکھ رہا تھا۔

”دھمکی دے رہا تھا۔“

”سر! اگر آپ کہیں تو یا سر ابراہیمی کو فون کروں؟“ منہجرا نے بہت آہستگی سے کچھ جھک کر کہا تھا، سرد اصفہانی

نے منبر کو بغور دیکھا تو اس کا مطلب سمجھا، اس کے دماغ کے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے، ہونٹوں پر ایک کینی مسکراہٹ رہ گئی تھی۔

”تمہیں یقین ہے وہ ہمارا یہ کام کر دے گا؟“

”سر! پیسہ پھینکنا پڑے گا۔“

”تو پھر خیال رہے، کام پورا ہونا چاہیے اور میرا نام بیچ میں نہیں آئے۔“

”ایسا ہی ہوگا سر! آج رات آپ سکون اور اطمینان کی نیند سو جائیں، کیونکہ کل صبح کا سورج دیکھنے کے لیے سید ابہتاج عالم زندہ نہیں رہیں گے۔“

”مگد، مگر ایک بات اور بول دینا سراسر ابراہیمی کو کہ یہ کام بہت چالاکی اور ہوشیاری سے کرنے والا ہے۔“

”اس کی تو آپ فکر ہی نہیں کریں سر! ہر کام آپ کی سوچ کے مطابق ہی ہوگا۔“

”ہوں.... ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ سرد اصفہانی اپنے خاص الخاص منبر کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کے دو بجے اس کی آنکھ کھلی، اپنے برابر میں دیکھائی جان دو انٹیوں کے زیر اثر بے خبر نیند سو رہی تھیں، اس نے بہت احتیاط سے خود پر سے کبل ہٹایا اور آہستگی سے بیڈ سے نیچے اترتی، دبے پاؤں دروازے کی سمت بڑھی، زمین پر اتنا مہنگا دبیز قالین بچھا تھا کہ آدھا نیچہ دھنس جاتا تو پھر چلنے کی آواز ہی پیدا نہیں ہو سکتی تھی، دھیرے سے دروازہ کھولا اور نکل کر اسی طرح دھیرے سے دروازہ بند کر دیا تھا، سمجھ نہیں آیا کہ اتنے بڑے محل میں یاہر جانے کا راستہ کہاں سے ہے؟ وہ بغیر تعین کیے کچھ بھی سوچے سمجھے سیدھا چل پڑی تھی، یہ اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ جلد ہی لان کی طرف کھلنے والا دروازہ مل گیا تھا، وہ اتفاقاً آدھا کھلا ہوا بھی تھا، جلدی سے وہ باہر نکلے۔

”اُف اللہ! یہ تو اس قدر بڑا لان ہے، اب میں کہاں جاؤں؟“ بے بسی ہی بے بسی تھی اندر و باہر، مگر اب تو باہر نکل ہی گئی، تو کچھ تو کرنا ہی تھا، وہ سیدھا چلنے لگی، مگر یہ کیا....؟ وہ سامنے کے منظر کو دیکھ کر بالکل ساکت و جامد ہو کر رہ گئی تھی، سانسیں رُک سی گئیں، دھڑکنیں تھم تھم کر چلنے لگیں، ہر نی آنکھوں میں خوف اُٹھنے لگا تھا، نازک سادل حلق میں آ گیا تھا، سامنے ہی لیے چوڑے سے بڑے بڑے دانتوں والے چار بلیک ڈوگز (dogs) جن کی سرخ زبانیں نیچے تک لٹک رہی تھیں اور جن سے سب سے زیادہ خوف محسوس ہو رہا تھا، وہ تھی ان کی خوفناک غراہٹ اور بڑی بڑی کالی آنکھوں میں بے تحاشہ غصہ، جیسے ہی وہ چاروں بھونکتے ہوئے اس کی سمت بڑھے، وہ ایک دل سوز چیخ مارتے ہوئے اُلٹے قدموں بھاگی تھی کہ کسی کے مضبوط چوڑے سینے سے بڑی طرح ٹکرا کے گرنے کو تھی، مگر سید ابہتاج عالم نے اپنی مضبوط بانہوں کا حصار اس کے گرد کھینچ دیا تھا، وہ کسی خوفزدہ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح اس کے سینے میں منہ چھپائے ہچکیوں سے رو رہی تھی، وہ چاروں بلیک ڈوگز اپنے مالک کو دیکھتے ہی رُک گئے تھے۔ چیخ کی آواز سن کر اللہ بخش اپنی بھاری گن لیے وہاں آ گیا اور ہوائی فائرنگ کر کے ان چاروں بلیک ڈوگز کو جانے کا حکم دیا، وہ چاروں ڈوگز پھرتی سے دوسری طرف بھاگے تھے، سید ابہتاج عالم نے ایک گہری سانس کھینچی اور اس نازک سی لڑکی کو اپنے ہمراہ لیے اندر آیا تھا۔

”تم وہاں کیا کر رہی تھیں؟“ سید ابہتاج عالم کو غصہ تو بہت آیا مگر اس کا ڈر و خوف کے مارے بلک بلک کر رونے کی وجہ سے بڑی مشکل سے خود پر قابو کیا تھا، اگر بروقت وہ وہاں نہیں آ جاتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا، وہ انا بیہ نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں اور تم باہر کیسے نکلی ہو؟ دماغ تو ٹھکانے پر ہے تمہارا؟ اگر وہ تمہیں کچھ نقصان پہنچا دیتے تو؟“ سید ابہتاج عالم کے لب و لہجے میں نرمی بالکل مفقود تھی، وہ سخت نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے بابا کے پاس جانا ہے۔“

”واٹ.... رات کے اس پہر؟“ اس کی ذہنی حالت پر سید ابہتاج عالم کو معمولی سا شبہ ہوا تھا۔

”کیونکہ دن میں آپ لوگ مجھے جانے نہیں دیتے ہیں۔“ سید ابہتاج عالم نے بغور اس کے خوبصورت و دلکش چہرے کو دیکھا، جو رونے کی وجہ سے مزید حسین لگنے لگا تھا۔

”تم جانتی ہو تمہارے بابا کہاں ہیں؟“

”نہیں۔“ روتے ہوئے گردن نفی میں اُدھر اُدھر گھمائی۔

”جب جانتی نہیں ہو تو پھر کیوں جا رہی تھیں باہر؟“

”میں سردا نکل کے پاس جا رہی تھی، وہ جانتے ہوں گے میرے بابا کہاں ہیں؟“

”سردا نکل!“ کس قدر حیرت زدہ نظروں سے اس نے انا بیہ کو دیکھا تھا۔

”تم جانتی ہو سردا نکل کو، کبھی ملی ہو ان سے؟“

”نہیں، مگر مجھے اتنا پتا ہے وہ بابا کے بزنس پارٹنر ہیں۔“ کتنی معصومیت تھی اس کے انداز میں۔

”فاروق خان ٹھیک بولتے ہیں، ان کی بیٹی بہت معصوم اور سادہ سی ہے، اور شاید بہت بے وقوف بھی، اگر اس کو پتا ہوتا کہ آج اس کے بابا جس مصیبت کا شکار ہوئے ہیں، وہ سب سردا اصفہانی کی وجہ سے ہی ہے تو کبھی اس طرح نہ کرتی۔“

”مجھے جانے دیں ناں۔“ بہت عاجزی سے اُس نے کہا تھا۔

”نہیں، تم اب یہاں سے کہیں نہیں جاسکتی ہو، تم سید ابہتاج عالم کی عزت و آبرو ہو، اور سید ابہتاج عالم اپنی عزت کی حفاظت کرنا اچھی طرح جانتا ہے، آج تو یہ غلطی کر لی ہے، اب کبھی اس کے بارے میں سوچنا بھی مت۔“ بہت نرم و ملائم انداز میں اس کو سمجھایا تھا۔

”آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ؟“

”لیکن میں نے تو تمہارے ساتھ ابھی کچھ نہیں کیا۔“ اس کی خوفزدہ ہر نی آنکھوں میں جھانکا، جہاں ایک سمندر موجزن تھا، اس کی یہ ذمہ داری بات انا بیہ کو نگاہیں جھکانے پر مجبور کر گئی تھی، سید ابہتاج عالم نے اس کے چہرے کے بدلتے موسم کو بغور دیکھا تھا، اس کے عنابی گداز لبوں پر مسکراہٹ آئی تھی، وہ دو قدم اور آگے بڑھا اور اس کے نازک شانوں پر اپنی مضبوط ہتھیلیاں رکھ دیں، بہت چاہت سے اُسے دیکھتے ہوئے اس کی ٹھوڑی اپنی انگشت شہادت سے اوپر اٹھائی، بڑی مشکل سے انا بیہ نے اپنی بھاری بو جھل گھنیری پلکوں کی باڑا اوپر اٹھائی تھی۔

”اپنے اس چھوٹے سے دماغ پر زیادہ زور مت ڈالو، اپنی ساری سوچوں کو ایک طرف اٹھا کے رکھو، یہ کام مجھ پر ہی چھوڑ دو، اگر اپنے بابا کے لیے پریشان ہو تو بے فکر رہو، وہ بالکل ٹھیک ہیں، کچھ ٹریٹمنٹ چل رہا ہے، جیسے ہی وہ پورا ہوتا ہے تو وہ تم سے خود آ کر ملیں گے۔“

”مگر....!“

”شش۔“ سید ابہتاج عالم نے اس کے شکر فی گلابی ہونٹوں پر اپنی شہادت کی انگلی رکھ دی۔

”اب کوئی سوال نہیں، ساری فکریں مجھ پر چھوڑ دو، یہ اتنا بڑا محل ہے، یہاں گھومو، کھاؤ پیو اور سب سے بڑی

بات خوش رہو۔

”آپ کا محل بہت بڑا ہے، میں کھو جاؤں گی۔“ سید ابہتاج عالم اس کی بات پر دھیرے سے ہنس دیا تھا۔
”میں تمہیں کھونے نہیں دوں گا، اپنی جان سے لگا کر رکھوں گا۔“ اس کے کان میں ہولے سے سرگوشی کی۔
رات کے اس پہر اگر بروقت بی جان نہیں آ جاتیں تو اس سے کوئی حرکت، کسی گستاخی کا سبب بن جاتی، اپنی اس بے ساختہ سوچ پر وہ خفیف سا ہو گیا۔

”ابہتاج!“ بی جان نے دونوں کو دیکھا نہیں تھا، بس سید ابہتاج عالم کو پکارنا شروع کر دیا تھا، وجہ وہاں لاؤنج میں زیرو پوائنٹ کا بلبل جل رہا تھا، وہ دھیرے سے انابیہ سے پیچھے ہٹا تھا۔

”جی بی جان!“ وہ ان کے پاس آیا تھا۔

”پٹر! کمرے میں انابیہ دھکی نہیں ہے۔“ وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

”بی جان! پریشان مت ہوں، انابیہ یہاں ہے۔“ بی جان نے سامنے دیکھا جہاں وہ کھڑی تھی، وہ تیزی سے اُس کی جانب بڑھیں کہ اس دوران سید ابہتاج عالم کا موبائل چیخ اٹھا تھا، اسکرین کی طرف دیکھا جہاں اس کے خاص وفادار آدمی کا فون تھا۔

”ہیلو!“

”سائیں! آپ کو ایک خبر دینی تھی۔“

”ایک منٹ۔“ سید ابہتاج عالم نے سامنے دیکھا بی جان، انابیہ کو خود سے لگائے اپنے بیڈروم میں لے جا رہی تھیں، بند دروازے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ اپنے وسیع و عریض بیڈروم کی سمت بڑھا تھا۔

”ہاں، بولو۔“

”سائیں! یاسر ابراہیمی.....!“ اور پھر وہ سب کچھ بتاتا چلا گیا تھا۔

”اوں.....“ وہ پُر سوچ انداز میں کھلے فل سائز T.V کو دیکھنے لگا تھا۔

”سرمد اصفہانی سے مجھے ہر کمینگی کی توقع ہے، اب تک ہم اُسے آرام سے اور پیار سے سمجھا رہے تھے، مگر وہ کہتے ہیں ناں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے، تم ایک کام کرو، یاسر ابراہیمی کو ڈیرے پر لے کر پہنچو، میں وہیں آتا ہوں۔“

”حکم سائیں!“ موبائل آف ہو چکا تھا۔

”تو سرمد اصفہانی! اب تمہیں اپنے طریقے سے ہی سمجھانا پڑے گا۔“ کچھ فیصلے کر کے وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اس وقت گہری سوچوں میں غلطاں، بہت انہماک سے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں ٹکائے ہوئے تھی، صبح ناشتے کی ٹیبل پر سید ابہتاج عالم خاص طور پر بی جان سے کہہ گئے تھے، اس کا خیال رکھنے کا، بی جان کب سے اُسے یونہی سوچتا ہوا دیکھ رہی تھیں، وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئیں اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں، وہ اپنی سوچوں میں اس قدر منہمک تھی کہ اپنے برابر بیٹھی بی جان کا احساس بھی نہ ہوا اسے۔ بی جان کے چہرے پر اتنی نرمابھٹ تھی کہ انابیہ کو ان کے اندر اپنی ماں کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہے میری دھی رانی؟“ نہایت شفقت سے کہتے ہوئے انہوں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا، وہ بُری طرح چونک کر رہ گئی تھی اور ان کو دیکھنے لگی تھی۔

”کیا بات ہے پریشان ہو؟ دیکھو اگر کوئی بھی بات ہے تو تو مجھے بتا، تو مجھے اپنی ماں سمجھتی ہے؟“
”جی بی جان! میں آپ کو اپنی ماں سمجھتی ہی نہیں مانتی کبھی ہوں، وہ بھی دل سے۔“ اس نے مسکرا کے ان کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔

”تو پھر بتا، کیا بات ہے، ابہتاج نے کچھ کہا ہے؟“

”نہیں تو، انہوں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ہے۔“ سید ابہتاج عالم کا مضبوط سراپا اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر گھوم گیا تھا۔

”تو پھر کس بات کی فکر میں گھل رہی ہے؟“ بی جان نے اس کے سر کو سہلایا۔

”بابا کی بہت یاد آ رہی ہے۔“ اس کے لب و لہجے میں دکھ بول رہا تھا۔

”تو فکر مت کر، وہ جیسے ہی ٹھیک ہو جائیں گے، تجھ سے ملنے خود یہاں آئیں گے۔“

”بی جان! میرے بابا کو کیا ہوا ہے؟ وہ یہ بھی تو نہیں بتاتے ہیں۔“ اس کا اشارہ سید ابہتاج عالم کی طرف تھا۔

”وہ بیمار ہیں، ان کو دل کا دورہ پڑا ہے، جی بی ابہتاج نے ان کو اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔“

”دل کا دورہ.....!“ وہ ایک جھٹکے سے ان سے الگ ہوئی تھی۔

”بی جان! پھر تو میں ہر حال میں اپنے بابا کے پاس جاؤں گی۔“ بہت بے صبری سے بولتے ہوئے انابیہ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”پٹر! کوئی وجہ ہے ناں، جی بی ابہتاج تجھے یہاں سے لے کر نہیں جاسکتا۔“

”بی جان! میں کچھ نہیں جانتی، آپ اُن سے بولیں مجھے اپنے بابا کے پاس جانائے۔“ وہ روتے ہوئے ضد کرنے لگی تھی۔ بی جان نے اُسے بہت سمجھایا، مگر وہ ایک نہیں سن رہی تھی، روتے جا رہی تھی اور اپنے بابا سے ملنے کی ضد کرنے لگی تھی۔

”اب کیا کروں؟“ وہ صحیح معنوں میں پریشان ہو گئی تھیں۔

”اللہ بخش!“ انہوں نے اپنے سب سے وفادار ملازم کو پکارا تھا۔

”جی مالکن! حکم۔“

”مجھے ذرا ابہتاج کو تو فون ملا کر دے۔“

”جی بہتر مالکن!“ اس نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور سید ابہتاج عالم کا نمبر ڈائل کیا، ایک دو تیل پر ہی فون اوکے کر دیا تھا، اس نے موبائل بی جان کو تھما دیا تھا اور خود دور جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ہاں اللہ بخش! کیا بات ہے؟“

”پٹر! میں بات کر رہی ہوں، تیری بی جان۔“

”جی بی جان! بولیں سب خیریت ہے ناں؟“

”نہیں، خیریت نہیں ہے، دھی رانی بہت رورہی ہے، وہ اپنے بابا سے ملنا چاہتی ہے، تو اس کی فون پر بات ہی کروادے، مجھ سے اس کا رونا دیکھا نہیں جا رہا۔“ ان کے لب و لہجے میں جس قدر تکلیف بول رہی تھی انابیہ کے لیے، وہ وہاں بھی محسوس کر سکتا تھا۔

”اوکے، آپ انابیہ کو فون دیں، میری بات کروائیں۔“ بی جان نے فون انابیہ کی سمت بڑھایا۔

”لے بات کر، ابہتاج بات کرے گا۔“

”نہیں وہ ڈانٹیں گے مجھے“۔ وہ روتے ہوئے گردن نفی میں ادھر ادھر ہلانے لگی، اس کی آواز موبائل کے اس پار سید ابہتاج عالم کی سماعت تک پہنچ گئی تھی، اس کے عنانی گداز لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ رہ گئی تھی۔

”نہیں ڈانٹنے گا، میں ہوں ناں تیرے پاس، اگر ڈانٹا تو دیکھنا کیسے اس کے کان کھینچوں گی تیرے سامنے“۔ انابییہ کو بی جان کی کچھ ڈھارس ملی تو موبائل کانوں سے لگا لیا۔

”ہیلو...!“ سٹر سٹر کرتی آواز نکلی تھی۔

”اگر میری ڈانٹ کی اتنی ہی فکر ہے تو کیوں پریشان کرتی ہو بی جان کو؟“

”مجھے بابا کے پاس بھیج دیں ناں“۔ سید ابہتاج عالم کچھ دیر خاموش رہا تھا۔

”تمہیں اپنے بابا کے پاس جانا ہے؟“

”جی...“

”ٹھیک ہے، میں رات میں آتا ہوں تو تمہاری بات کرادوں گا، تمہارے بابا سے خوش...؟“

”آپ سچ بول رہے ہیں ناں؟“ وہ یقین بے یقینی کی کیفیت میں بولی تھی۔

”بالکل سچ، مگر پہلے وعدہ کرو کہ اب بی جان کو پریشان نہیں کرو گی۔“

”جی نہیں کروں گی۔“ وہ دل ہی دل میں خوش ہو گئی تھی کہ اس کے چہرے اور لہجے سے دل کی خوشی عیاں تھی،

بی جان نے جاں نثار ہوتی نظروں سے دیکھا تھا اُسے۔

”تو پھر ٹھیک ہے، میں بھی اپنا وعدہ پورا کروں گا، تم بی جان کو فون دو“۔ اس نے موبائل بی جان کو دیا، انہوں

نے کچھ اور اُسے تنبیہ کر کے موبائل آف کر کے واپس اللہ بخش کو دے دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

مجھے معاف کر دیں سائیں! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی، سرد اصفہانی نے مجھے پانچ لاکھ روپے دیئے تھے،

آپ کو مارنے کے لیے، اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ آپ کے لیے دے رہے ہیں تو یقین کریں میں اپنے بچوں کی قسم

کھاتا ہوں میں یہ پیسے اس کے منہ پر مارتا۔“ یاسر ابراہیمی اس وقت گھٹنے ٹیکے گڑگڑا رہا تھا، اپنی زندگی کی بھیک

مانگ رہا تھا۔

”ٹھیک بولتے ہو، پانچ لاکھ کے لیے تو کوئی بھی کسی کی جان لے سکتا ہے۔“

”سائیں! مجھے معاف کر دیں، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”سائیں! اگر آپ حکم کریں تو اس کا سرتن سے جدا کر دوں؟“ سید ابہتاج عالم کا وفادار ملازم کرم داد غصے میں

آگے بڑھا تھا، یاسر ابراہیمی پر اُسے اتنا غصہ آ رہا تھا کہ بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے

کتوں کے آگے ڈال دے۔

”ارے نہیں بابا، یہ تو صرف ایک مہرہ ہے، اصل کھلاڑی تو کوئی اور ہے جو خود کو بہت زیادہ شاطر اور چالاک

سمجھ رہا ہے۔“

”تو پھر حکم کریں سائیں! کیا کرتا ہے؟“

”کرتا کیا ہے، بلا لوهوم منسٹر اور ڈی ایس پی کو، اب ذرا انہیں ہماری خدمت کا موقع تو دو۔“

”اور سائیں! اس کا کیا کرتا ہے؟“ کرم داد نے ایک زوردار ہاتھ یاسر ابراہیمی کے سر پر مارا تھا، جو سید ابہتاج

عالم کے قدموں میں ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا۔

”اس کو فی الحال کوٹھڑی میں ڈال دو، اس کا اسٹینٹ اب ڈی ایس پی ہی لیں گے، پھر تم یوں کرتا سرد اصفہانی کے شیراز اور فاروق خان صاحب کے کیس میں جتنے بھی لوگ انوالو ہیں، ان سب کو باعزت طریقے سے یہاں لے آؤ، اس معاملے کو میں اب اپنے طریقے سے ہینڈل کروں گا، بہت وقت دے دیا سرد اصفہانی کو، اب اور نہیں۔“

”جیسا آپ کا حکم سائیں!“ وہ مؤدب ہو کر بولا تھا۔ سید ابہتاج عالم پھر زکا نہیں، چلتا چلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ محل میں آیا تو بی جان کو ہراساں دیکھ کر فوراً ان کی سمت بڑھا تھا۔

”بی جان! کیا بات ہے، سب خیریت ہے ناں؟“ بی جان کی بھی جب اس پر نظر پڑی تو وہ بھی تیزی سے اس

کی جانب بڑھیں۔

”پتھر! تو آ گیا، میں کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔“

”ہوا کیا ہے، آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟“ اس نے ان کو خود سے لگایا تھا۔

”ہاں، وہ انابییہ پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے۔“

”چلی گئی؟ کہاں چلی گئی ہے، گارڈز کہاں تھے؟“ اس کے چہرے پر غصہ در آیا۔

”ارے وہ مجھے بول رہی تھی کہ بی جان آپ کا محل بہت بڑا ہے، تو میں نے کہا تو دیکھ لے، یہ سب تیرا ہی تو

ہے، وہ مسکرا کے بولی کہ میں ابھی گھوم کر آتی ہوں، آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے، ابھی تک نہیں آئی ہے، سب ڈھونڈ رہے

ہیں۔“ بالآخر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے، جن سے سید ابہتاج عالم کو بہت تکلیف پہنچی تھی، اس نے اپنے

ہاتھ سے ان کے آنسو صاف کیے اور آرام سے صوفے پر بیٹھا دیا۔

”آپ پریشان مت ہوں، میں خود آپ کی بہو کو پانچ منٹ میں آپ کے پاس لے آتا ہوں۔“ وہ وہاں سے

نکل کر محل کے دوسرے حصے کی طرف گیا تھا، اور جس بات کا اُسے شک تھا وہی ہوا، انابییہ محل کے دوسرے حصے کی

طرف انڈر گراؤنڈ میں بنے چھوٹے سے روم میں ایک کونے پر ڈری سہی دہکی سر کو گھٹنوں میں دیئے بیٹھی تھی، اس کا

جسم ہچکیوں کی زد میں تھا، وہ بے تحاشہ رو رہی تھی۔ سید ابہتاج عالم ٹرپ کے آگے بڑھا اور بڑی بے قراری سے اس

کو دونوں نازک شانوں سے پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔

”انابییہ!“ وہ صحیح معنوں میں بھونچکا کر رہ گیا تھا، دل اس کا چہرہ دیکھ کر جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا ہو، اس کا چہرہ

زرد خوف کی وجہ سے بالکل سپید پڑ چکا تھا، انابییہ، سید ابہتاج عالم کو سامنے پا کر اس کے چوڑے سینے سے لگی تھی، اس

کا خوف ختم ہی نہیں ہو رہا تھا، بالآخر وہ عقل و خرد سے بیگانہ ہوتی چلی گئی، جس کا احساس سید ابہتاج عالم کو شدت سے

ہوا تھا، اس نے اس نازک اندام پیکر کو اپنے مضبوط آہنی بازوؤں میں اٹھالیا تھا۔

وہ اُسے اپنے بازوؤں میں اٹھائے اندر داخل ہوا سامنے بی جان جو بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی تھیں،

انابییہ کو یوں اس حالت میں دیکھ کر ٹرپ کر تیزی سے آئیں۔

”کیا ہوا اسے ابہتاج! یہ کہاں تھی، اور یہ بے ہوش کیوں ہے؟“ بی جان حواس باختہ سی ہو گئی تھیں، وہ سید

ابہتاج عالم سے زیادہ پیار کرنے لگی تھیں اُسے۔

”بی جان! پریشان مت ہوئے، کچھ نہیں ہوا ہے اُسے، بس ڈر گئی ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔“

”ارے ایسے کیسے پریشان نہ ہوں، تو اسے یہاں لیٹا اور ڈاکٹر کو فون ملا۔“ بول جلدی سے آئے وہ، میری تسلی

نہیں ہو رہی ہے۔“ سید ابہتاج عالم اُسے بی جان کے بیدروم میں لے آیا اور آہستگی سے ان کے جہازی ساز بیڈ پر لیٹا دیا، بی جان جلدی سے اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھیں۔

”اب جاناں، بلا ڈاکٹر کو۔“ یہ ان کی محبت ہی تو تھی جس کے لیے وہ اتنا بے چین ہو رہی تھیں، سید ابہتاج عالم نے اپنا موبائل نکالا اور ڈاکٹر کو فون ملایا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد اُسے ہوش آ گیا تھا۔ اس دوران ڈاکٹر بھی اُسے دیکھ کر جا چکے تھے، اور یہی کہا تھا کہ وہ کسی خوف کے زیر اثر ہے، انجکشن دے دیا تھا، ٹھیک ہو جائے گی، بی جان تو اس سے لگ کر ہی بیٹھی تھیں اور اُس پر کچھ نہ کچھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں، اس نے آنکھیں کھولیں تو بی جان کا شفقت و محبت بھرا چہرہ نظر آیا، اس کا دل ان کی آغوش میں چھپ جانے کو ہنسنے لگا تھا۔

”بی جان!“ وہ ہلک کر ان سے لگی تھی۔

”میری بچی! میری دھی رانی! کہاں چلی گئی تھی اپنی بی جان کو چھوڑ کر؟“ انہوں نے بھی اس کے لیے اپنی نرم و گرم بانہیں وا کر دیں۔ سامنے کھڑا سید ابہتاج عالم اس جذباتی منظر کو دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دیا، یہ تو کوئی اس کے دل سے پوچھتا کہ اس کے دل کو کس قدر سکون ملا تھا، قرار آیا تھا، انا بیہ کے ہوش آنے پر، مگر وہ یہ بھی جانتا چاہتا تھا کہ وہ وہاں اس انڈر گراؤنڈ روم میں کیسے پہنچی؟

”تم وہاں کرنے کیا گئی تھیں؟“ سید ابہتاج عالم کی گھمبیر آواز پر اس نے اپنا روتا چہرہ بی جان کی آغوش سے اوپر اٹھایا تھا، اس نے بی جان کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا تھا، اور ان ہر نی آنکھوں میں ایک بات تھی ”بی جان مجھے ان سے بچالیں“ اور بی جان اس کی نظروں کی بات کو اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔

”اب چھوڑ دے، یہ میرے پاس آگئی ہے، مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔“

”بی جان! آپ خود سوچیے، اگر خدا نخواستہ وہاں پر دروازے کو لاکڈ کر دیا جاتا، تو کیا ہوتا؟ اس کو وہاں جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ وہ حد درجہ غصے میں آ گیا تھا، انا بیہ کو اگر کوئی نقصان پہنچ جاتا یہ سوچنا ہی کس قدر سوہان روح لگ رہا تھا۔

”بی جان! انہوں نے ہی کہا تھا کہ محل میں گھومو، میں نے تو منع کر دیا تھا۔“ سارا الزام سید ابہتاج عالم پر رکھ دیا تھا۔

”محل گھومنے کا کہا تھا، گم ہو جانے کا نہیں، پتا نہیں کیوں میری جان کو مشکل میں ڈال دیتی ہے۔“ یہ آخری جملہ اس نے خود سے کہا تھا، جوں جوں کی سماعتوں سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا، انہوں نے نہایت چونک کر اپنے لمبے چوڑے بیٹے کو دیکھا تھا، براؤن ٹکڑے کے کلف لگے کاٹن کے شلوار کرتے میں وہ خاصا الجھا الجھا سا لگ رہا تھا، اور اس کی آنکھوں کی وجہ وہ جان گئی تھیں، اس لیے کچھ بھی کہے بنا منہ نیچے کیے ہو لے سے مسکرا دیں۔

”میری عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا ہے، مجھے نماز پڑھنی ہے۔“ وہ جان کر ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر جانا چاہ رہی تھیں، اصل مقصد سید ابہتاج عالم کو انا بیہ سے بات کرنے کا موقع دینا چاہتی تھیں، ورنہ انا بیہ کو تو وہ جان ہی گئی تھیں کہ وہ ایک سیدھی سی معصوم بھولی بھالی سی لڑکی تھی، سونے پر سہاگہ وہ ایک حسین ترین کم عمر دوشیزہ تھی۔

”بی جان! آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ اس نے گھبرا کر بی جان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”میرا بچہ! نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے، تجھے تو معلوم ہے میں وقت پر نماز ادا کرنے کی عادی ہوں، تو جب تک یہاں بیٹھ، ابہتاج ہے یہاں، تو ڈر مت۔“ انہوں نے نرمی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑایا تھا اور کھڑی ہو گئیں، سید ابہتاج عالم بھی ایک زیرک بندہ تھا، وہ اپنی ماں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ بی جان کھڑی ہو گئیں اور باہر

جانے لگیں، انا بیہ بھی ڈر و خوف اور سب سے بڑھ کر سید ابہتاج عالم کی موجودگی سے گھبرا کر اٹھی، تیزی سے ان کے پیچھے جانے لگی کہ سید ابہتاج عالم اس کی راہ میں حائل ہو گیا، اس کا تیزی سے اٹھ کر جانا اور سید ابہتاج عالم کا یوں جلدی سے رکاوٹ بننا کچھ تو رنگ لانا ہی تھا، وہ بُری طرح اس کے چوڑے و مضبوط سینے سے ٹکرائی تھی، وہ مزید خوفزدہ ہو گئی، اب کیا کرتی نہ کرتی کے مصداق وہ پلکوں کی گھنیری جھال گرائے کھڑی ہی رہی، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کیے بڑی بے دردی سے مروڑ رہی تھی، سید ابہتاج عالم نے نہایت پر شوق نظروں سے اس کے خوبصورت و دلکش چہرے کو بغور دیکھا تھا۔

”جانتی ہو کس قدر مشکل میں ڈال دیتی ہو میری جان کو، اس طرح کی حرکتیں کر کے؟“ ذومعنی میں مدہم سرگوشی تھی جو انا بیہ کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”میں گھوم رہی تھی کہ اچانک وہاں آپ کا ایک بلیک ڈوگ آ گیا تھا، میں ڈر کر اس روم میں بھاگی تھی۔“

”اُف اللہ.....!“ سید ابہتاج عالم نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

”کیا ہوا، میں نے کچھ غلط کہا؟“ ہر نی آنکھوں میں بے پناہ معصومیت تھی۔

”نہیں میری جان! آپ بھلا کچھ غلط کہہ سکتی ہیں؟“

”میری جان“ پروہ بُری طرح جھینپ کر رہ گئی تھی، سرخ و سفید گالوں پر لالی سی بکھرنے لگی تھی، سید ابہتاج عالم نے کتنے ہی لمحے تک اس کے بکھرتے رنگوں کو اپنی آنکھوں میں جذب کیا تھا، بے خودی میں ہی اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور اس کے سرخ ہوتے رخسار پر پھیلتا چلا گیا تھا، اس دہکتے لمس پر انا بیہ کی جان جیسے نکلنے لگی، دل میں اس قدر ادھم پیل ہونے لگی جسے وہ خود سمجھ نہیں پار ہی تھی، ایک نیا جذبہ سیراٹھانے لگا، جسے وہ کوئی نام نہیں دے پار ہی تھی۔

”تم نے بھی آئینہ دیکھا ہے؟“ سرگوشی نہایت مدہم تھی، ان ہر نی آنکھوں میں حیرانگی کے لاکھوں سوالات جنم لے رہے تھے، جن کی تحریر پڑھنا سید ابہتاج عالم کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔

”تم بہت خوبصورت ہو، چودھویں کے چاند کی روشنی جیسے تمہارے اندر سے پھوٹتی ہو، ان ہر نی آنکھوں میں اس قدر چمک ہے کہ اگر کوئی ان میں ڈوب جائے تو پَر مارنے کی بھی ہمت نہ ملے، تمہارے شکر فی ہونٹ جیسے کوئی داستان رقم کر رہے ہوں، کوئی حسین کتھا سن رہے ہوں جسے پڑھنے کا دل کرتا ہے۔“ سید ابہتاج عالم دھیرے دھیرے بولتا اس کے خوبصورت چہرے کے ایک ایک نقوش پر ہاتھ پھیر رہا تھا، اور انا بیہ! اس کی تو جان ہی نکلی جا رہی تھی، اس سے پہلے کہ وہ پیچھے ہٹی، سید ابہتاج عالم نے اس کی نازک مرمیں کمر پر اپنی گرفت کا حصار کھینچ دیا تھا، وہ مکمل طور پر اس کی مضبوط بانہوں میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔

”سید ابہتاج عالم جو ایک جہاں فتح کرنا جانتا ہے وہ ایک نازک سی معصوم سی لڑکی کی معصومیت اس کی سادگی کے آگے بالکل زیر ہو کر رہ گیا تھا، اور سید ابہتاج عالم اپنی بات پر مہر ثبت کرتا ہے کہ اُسے تم سے، انا بیہ ابہتاج سے محبت نہیں عشق ہو گیا ہے، اس کا دل تمہاری سانسوں کے ساتھ دھڑکنے لگا ہے، اس کی سانسیں تمہاری خوشبو کے احساس سے مہکنے لگی ہیں، نس نس میں تم جان بن کر دوڑنے لگی ہو۔“ اس کی سانسوں کے گرم ٹھنڈے انا بیہ کے چہرے کو جھلسا رہے تھے، جیسے کوئی دہکتا انگارہ اس کے اوپر رکھ دیا ہو، آنکھوں میں بے بسی کا ایک سمندر موجزن ہونے لگا تھا، بلکہ چند موتی ٹوٹ کر اس کے رخسار پر بکھرنے بھی لگے تھے، جنہیں سید ابہتاج عالم نے بغور دیکھا تھا اور ایک ٹوٹا موتی جھک کر اپنے لبوں سے چُن بھی لیا تھا۔

سید ابہتاج عالم کی ان بے ساختگیوں پر وہ کیسے بندھ باندھے سمجھ نہیں آ رہا تھا، بس ان ہر نی آنکھوں میں مزید

خوف سمٹنے لگا تھا، اس کے شکر فی گلابی ہونٹ کپکانے لگے تھے، سید ابہتاج عالم کو اس کی غیر ہوتی حالت پر رحم آ گیا، وہ مزید اس کو امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا، اس لیے ہولے سے مسکرا کر بغیر کچھ اور کہے نہایت آہستگی سے اُسے خود سے الگ کیا اور پھر مڑ کر کمرے سے نکلتا چلا گیا تھا۔ کتنی ہی دیر تک اس نے سید ابہتاج عالم کی غیر موجودگی کو محسوس کیا تھا، بڑی مشکل سے اپنے بکھرتے دل کو سنبھالا اور غیر ہوتی دھڑکنوں پر ہاتھ رکھے وہیں بیٹھتی چلی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سید ابہتاج عالم نے جو کہا سچ کر دکھایا وہ اپنی بات کا، اپنے دعوے کا کیا تھا، دشمن کو صرف ایک بار موقع دیتا تھا، اس کے بعد اس طرح اس کے گرد دائرہ کھینچتا تھا کہ زندگی بھی تم پڑنے لگتی، مگر کہیں بھاگ نہیں سکتا، یہی سب سرمد اصفہانی کے ساتھ ہوا تھا، سید ابہتاج عالم نے اس کے گرد اتنی مضبوط گرفت کس دی تھی کہ وہ ہاتھ پیر تو چلانا بھی دور، بل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے خود کے شیر زبھی کوئی کوڑیوں کے دام بھی خریدنے کو راضی نہیں تھا، اس کے آفس کو سیل کر دیا گیا تھا، گھر کی ایک ایک شے نیلام کر دی گئی تھی اور آج وہ اس وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی زندگی کے دن گن رہا تھا، اس کا وہ حشر کر دیا تھا سید ابہتاج عالم نے کہ فراڈ کرنے والوں کے لیے عبرت کا نشان بن کر رہ گیا تھا۔

”مجھے معاف کر دو، سید ابہتاج عالم! مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی تھی۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑے سید ابہتاج عالم کے آگے گڑ گڑا رہا تھا۔

”بھول....؟“ اس نے غصے سے سرمد اصفہانی کو دیکھا تھا۔

”نہیں سرمد اصفہانی! تم سے بھول نہیں، غلطی ہوئی ہے، گناہ کیا ہے، غداری کی ہے تم نے فاروق خان سے۔“

”ہاں.... ہاں میں مانتا ہوں، میں تسلیم کرتا ہوں، میں فاروق سے بھی معافی مانگنے کو تیار ہوں، مجھے بس یہاں سے نکال لو۔“ کس قدر عاجزی تھی اس کے انداز میں۔

”نہیں سرمد اصفہانی! اب بہت دیر ہو چکی ہے، موقع دیا تھا نا ہم نے تمہیں؟ مگر افسوس تم اپنی ہوس و ناجائز خواہشات کے آگے اس قدر اندھے ہو چکے تھے کہ تمہیں حلال و حرام کی ساری پہچان بھول چکی تھی، اس لیے اب جو کیا ہے اس کی سزا تو تمہیں ملے گی، لہذا اب اپنی زندگی کے باقی دن ان جیل کی سلاخوں کے پیچھے کاٹو۔“ وہ پھر زکا نہیں تھا، وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا، مگر اپنے پیچھے سرمد اصفہانی کی آہ و بکا، اس کی بے بسی و گڑ گڑاہٹ ضرور سنی تھی، وہ چیختا چلاتا رہا، معافیاں مانگتا رہا، مگر اس کی پکار سننے والا کوئی ذی روح وہاں موجود نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

”جامیری دھی رانی! یہ چائے تو خود اپنے ہاتھ سے ابہتاج کو اندر دے کر آ جا اور اس نے تجھے بولا تھا نا تیرے بابا سے بات کرانے کو، وہ بھی کر لینا۔“ بی جان نے زبردستی چائے کی ٹرے انا بیہ کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ ایک جھجک مانع تھی اس کی شرم و حیا آڑے آرہی تھی، جو اس کو سید ابہتاج عالم کے سامنے جانے سے روک رہی تھی، وہ اس وقت اس کے بیڈروم کے دروازے پر کھڑی تھی، اس دن کے بعد سے تو وہ جان بوجھ کر ہی سید ابہتاج عالم کا سامنا نہیں کر رہی تھی، وہ گھر میں آتا تو وہ بات تو کہیں چھپ جاتی یا پھر سوتی بن جاتی، زیادہ تر بی جان کے ساتھ ہی لگی رہتی، مگر ہاں اس نے اپنے اندر ایک تبدیلی ضرور محسوس کی تھی کہ وہ سید ابہتاج عالم کو دیکھے بغیر رہ بھی نہیں سکتی تھی، لازمی ایک جھلک اس دشمن جاں کی چھپ کر دیکھ لیتی تھی اور جس دن وہ نظر نہ آتا تو دل میں ایک بے چینی، ایک بے

قراری سی ہونے لگتی تھی، اس نے ٹرے کو دیکھا، چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی اور سید ابہتاج عالم کو ٹھنڈی چائے سخت ناپسند تھی پھر یاد آیا کہ اس نے بابا سے بات کرانے کا وعدہ بھی تو کیا تھا، یہی سوچ کر اس نے دروازے پر دھمکے سے دستک دی تھی۔

”یس....“ اندر سے جواب ملا تھا، اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا، مگر یہ کیا وہ اندر آئی تو دروازہ پیچھے سے خود ہی بند ہو گیا تھا، اس نے چونک کر پیچھے پلٹ کر دیکھا تو دروازے کے کٹ میں کچھ ایسے فنیسی اسپرنگ لگے تھے جس کی وجہ سے دروازہ بند کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی، وہ اب اندر تو آ ہی چکی تھی، سامنے دیکھا وہ کمرہ تھا، اتنا حسین اتنا بڑا اور شاندار اور اتنی مہارت سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا، محل کی خوبصورتی ایک طرف، اس بیڈروم کی خوبصورتی ایک طرف، سامنے ہی وسیع و عریض خوبصورت سے بیڈ پر سید ابہتاج عالم نیم دراز کسی فائل کو ہاتھ میں لیے دیکھ رہا تھا، سید ابہتاج عالم کی نگاہیں اوپر اٹھیں، وہاں انا بیہ کوڑے میں چائے لیے پایا۔

”وہاں کیوں کھڑی ہو؟ یہاں آؤ۔“ مصروف سے انداز میں کہتا وہ دوبارہ فائل کی ورق گردانی کرنے لگا تھا جو شاید بہت ضروری کام تھا۔ انا بیہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی آئی اور ٹرے وہیں بیڈ کی سائیڈ میں کالج کی ٹیبل پر رکھ دی، ایک نظر مصروف سید ابہتاج عالم کو دیکھا تھا، اپنی بات بھی تو پوری کرنی تھی۔

”آپ نے کہا تھا کہ پلٹے سے میری بات کرا میں گے۔“ نگاہیں جھکائے انگلیوں کو آپس میں مروڑے وہ کہہ ہی گئی تھی، مگر یہ کیا، جب ہر نی جھکتی نگاہیں اوپر سامنے اٹھی تھیں تو جیسے شرم و حیا سے پانی پانی ہو کر رہ گئی تھی، سامنے فل سائز اسکرین ٹی وی پر جو سونگ چل رہا تھا، اسے سی کی کولنگ میں بھی وہ پوری طرح شراہور ہو گئی تھی۔

”بھیکے ہونٹ تیرے، پیسا من میرا۔“

”آف اللہ!“ وہ یہاں نہیں ٹھہر سکتی تھی، پھر سوچا۔

”یہ باہر آئیں گے تو بی جان کے سامنے ہی بات کروں گی۔“ یہی سوچ کر وہ بغیر سید ابہتاج عالم کو دیکھے وہاں سے جانے لگی، مگر یہ ناکام ثابت ہوا، کیونکہ اس کی نازک سی خمرطی کلائی سید ابہتاج عالم کی مضبوط پھٹیلی میں قید ہو کر رہ گئی تھی، اس نے رخ موڑ کے دیکھا، وہ اسی کو بغور دیکھ رہا تھا، انا بیہ اس سے پہلے کہ اپنی کلائی اس کی گرفت سے آزاد کراتی کہ سید ابہتاج عالم نے جھٹکا دیا وہ اپنا توازن سنبھال نہ سکی اور پورے وجود سمیت اسی پر آ رہی۔

”جو کہنا ہے قریب آ کر کہو، ویسے بھی اتنے دن ہو گئے تمہیں دیکھے، خود تو روز چھپ چھپ کر مجھے دیکھ لیتی ہو اور اپنے دیدار کا شرف بھی نہیں دیتی ہو۔“ چہرے پر آئی چند لٹوں کو وہ چھیڑ رہا تھا۔

”تو وہ سب جانتا ہے، اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہے، میں کتنی بے وقوف ہوں۔“

”جی ہاں آپ اوّل درجے کی بے وقوف اور کم عقل ہیں۔“ سید ابہتاج عالم کو تو سوچ پڑھنے میں کمال حاصل تھا، وہ حیران ہو کر رہ گئی تھی، وہ اس کی بانہوں میں کسمانے لگی تھی، خود کو چھڑانے کی مزاحمت کرنے لگی مگر ناکامی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آیا، کس قدر بے بسی سے اس نے دیکھا تھا وہ کیا کہنے آئی تھی اور کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

”آپ مجھے چھوڑ دیں نا پلیز!“ کپکانے شکر فی لبوں سے بڑی مشکل سے یہ چند الفاظ ادا ہوئے تھے۔

”کیوں....؟“ وہ اس لمحے کوئی خواب اُن ہر نی آنکھوں میں پیرونا چاہتا تھا، جس کی تعبیر نہایت خوبصورت تھی۔ اب اس سے آگے وہ کیا بولتی؟ لفظ تو جیسے کھوی گئے تھے، اوپر سے اس بیڈروم کی خاموشی کو چیرتا وہ گانا جس سے اس کی روح فنا ہونے کو تھی، اس گانے کے بول ہی کچھ ایسے تھے کہ وہ پلوں کی گھنیری باڑ زخار سے اٹھا ہی نہیں پار رہی تھی۔ ”تجھے صبح تک میں کروں پیار.... ہو ہو ہو....“ سید ابہتاج عالم نے اس کے خوبصورت چہرے پر اپنی

انگلیوں کی پوروں سے چھو، پھر کالی گھٹا جیسی لرزتی پلکیں چھوئیں، وہ مزید خود میں سمٹنے لگی تھی، سید ابہتاج عالم بھی بندہ بشر تھا، کوئی فرشتہ نہیں جو بانہوں میں حسن و جمال کا پیکر موجود ہو، اور وہ اس کے بے پناہ حسن سے نگاہ چرائے، اور پھر وہ کوئی غیر تو نہیں، حالات جو بھی رہے ہوں وہ اس کی منکوحہ تھی اور اب تو اس کی محبت، اس کا عشق و جنون بن چکی تھی، مگر یہ کیا؟ اس کے چہرے پر یہ اتنا کرب کیا تھا، یہ تکلیف کیوں تھی، یہ تو سید ابہتاج عالم نے نہیں جاپا تھا کہ انابیہ کو معمولی سی بھی زک پہنچے، نہیں وہ انابیہ کو اس طرح حاصل نہیں کرے گا، اس کی مرضی کے خلاف تو بالکل نہیں، اس نے نہایت احتیاط سے انابیہ کو خود میں سمو کر اس کی چمکتی پیشانی پر اپنے پیار و چاہت کی مہر ثبت کی اور بیڈ سے نیچے اتار دیا تھا۔

”جاؤ....!“ گھمبیر لہجے میں حکم صادر ہوا تھا۔ وہ تو تھی ہی موقع کی تلاش میں، تیزی سے بھاگی تھی، سید ابہتاج عالم نے خاموشی سے اس کو جاتے ہوئے دیکھا اور پھر ایک سرد سانس کھینچ کر موبائل نکالا۔

☆.....☆.....☆

دن یونہی بے کیف سے گزر رہے تھے، معلوم نہیں اُسے محل میں آئے کتنا عرصہ گزر گیا تھا، رمضان شروع ہو گئے تھے، آج بیسواں روزہ بھی ہو گیا تھا، وہ پورے خشوع و خضوع سے عبادت میں مشغول تھی، پابندی و خوش اسلوبی سے سحری و افطاری کی تیاریاں بھی خود ہی کرتی تھی، بی جان کو ذرا بھی پریشان نہیں کرتی تھی۔ روزہ کھلنے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا، وہ اُداس اُداس سی، افسردہ حال میں لاؤنج میں بیٹھی تھی، آج اس کو بابا کی یاد بہت شدت سے آرہی تھی، کتنے دن ہو گئے تھے بابا کی آواز تک نہ سنے، اس دن کے بعد سے تو وہ سید ابہتاج عالم کے بیڈروم میں گئی ہی نہیں تھی، ان کی چاہت و محبت روشن آنکھوں میں جلتے پیار کے دیپ سے وہ چھپنے لگی تھی، حالانکہ سحری و افطاری میں وہ تینوں ساتھ ہی ہوتے تھے، مگر سید ابہتاج عالم نے کوئی ایسی حرکت، کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے وہ وہاں سے بھاگنے کے لیے پرتو لے، اور اس لیے شاید سید ابہتاج عالم کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔

”انابیہ....!“ اس شفقت پر نور آواز پر اس نے چونک کر اس سمت دیکھا تھا، کتنے ہی لمحے لگے تھے، اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کہ سامنے جو ہستی کھڑی ہے وہ کوئی اور نہیں اس کے چہیتے عزیز از جان بابا ہیں۔

”بابا....!“ وہ سکتی ہوئی وہاں سے تیزی سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی فاروق خان کے سینے سے لگی تھی، کتنا ہی وقت گزر گیا تھا اس کو ان کے سینے سے لگے، پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے۔

”بس میری جان! اتنا نہیں روتے۔“ وہ اس کا سر مسلسل سہلا رہے تھے۔

”بابا! میں نے آپ کو بہت یاد کیا ہے۔“

”آئی نو، مائی چائلڈ! مگر بہت بڑی مجبوری تھی جو ہمارے درمیان یہ فاصلے پیدا کر گئی تھی۔“

”ایسی بھی کیا مجبوری تھی بابا! کہ آپ مجھ سے مل بھی نہیں سکتے تھے اور نہ ہی فون پر بات کرتے تھے؟“ وہ بہت روٹھی ہوئی تھی۔

”اب تو میں آ گیا ہوں ناں، سب ٹھیک ہو گیا ہے، تم ساری فکریں چھوڑ دو۔“ انہوں نے انابیہ کو خود سے الگ کیا اور اس کے بہتے آنسو صاف کر کے شفقت کا اس کے سر پر بوسہ دیا تھا۔

”بابا! آپ نے سرد انکل کے پیسے واپس کر دیئے تھے؟“ اس کو اچانک یاد آیا تھا، تو بے اختیار سوال کر بیٹھی تھی، فاروق خان حیران ہو کر اس کو دیکھنے لگے تھے، پھر سید ابہتاج عالم کو دیکھا جو قریب ہی کھڑا تھا، خود سید ابہتاج عالم کو بھی انابیہ کے ایسے بے وقوفانہ سوال کی توقع نہیں تھی، اس نے فاروق خان کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ

اشارہ کیا، پھر انابیہ کو دیکھا تھا۔

”اب کیا سارے سوالات یہیں کھڑے کھڑے ہی کر لوگی؟ روزہ کھلنے والا ہے، جاؤ جا کر افطاری لگاؤ۔“

”ارے ہاں، میں تو بھول ہی گئی، بابا! آپ کا بھی روزہ ہو گا ناں، میں ابھی ٹیبل لگوائی ہوں۔“ وہ چہرہ صاف کرتی کچن کی سمت بھاگی تھی، بی جان کو بھی تو بتانا تھا کہ اس کے بابا آ گئے ہیں، وہ بہت زیادہ خوش تھی ان کی آمد پر، مسکراہٹ تو جیسے لبوں سے جا ہی نہیں رہی تھی۔

”انابیہ! سرد اصفہانی کے کروت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی میں چاہتا ہوں کہ وہ کچھ جانے، انابیہ بہت معصوم اور سادہ ہے، اس کا دل و دماغ بالکل صاف ہے آئینے کی طرح شفاف، میں نہیں چاہتا اس کا صاف و شفاف ذہن پر اگندہ ہو۔“ سید ابہتاج عالم نے انہیں تفصیل سے سمجھا دیا تھا۔

”دھینکس ابہتاج عالم! اگر آپ نہ ہوتے تو جانے کیا ہوتا، میری تو یہ سوچ کر ہی روح کانپ اٹھتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو بروقت وسیلہ بنا کر نہ بھیجتا ہماری مدد کے لیے تو سرد اصفہانی کیا کچھ نہ کر جاتا؟ میری پھولوں سی بیٹی کا کیا بنتا؟“ فاروق خان نے یہ سوچ کر ہی جھرجھری لی تھی۔

”اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں فاروق صاحب!“ سید ابہتاج عالم شرمندہ ہو کر دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

”نہیں ابہتاج! جو بچ ہے وہ بچ ہے، آپ میرے لیے فرشتہ بن کر آئے ہیں، ایک مسیحا ہیں میرے لیے، میری بیٹی کے لیے، میرے دل سے آپ کے لیے بہت دعائیں نکل رہی ہیں، اس کا اجر اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہاں میں دے گا۔“ فرط جذبات سے مجروح ہو کر فاروق خان نے سید ابہتاج عالم کا ہاتھ تھام لیا تھا، ان کی آنکھیں نمی سے بھر گئی تھیں۔

”ارے.... رے فاروق صاحب پلیز! آپ مجھے انسان ہی رہنے دیجئے۔“ سید ابہتاج عالم نے فاروق خان کا اپنے ہاتھ پر رکھا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”السلام وعلیکم!“ بی جان وہیں آ گئیں، انہیں انابیہ نے بتایا تو وہ سب کچھ چھوڑے ان کے استقبال کے لیے آئی تھیں۔ پھر ان لوگوں نے مل کر افطاری ایک ساتھ کی، فاروق خان بی جان کو بہت اچھے، سو بر انسان لگے، اچھی شخصیت کے مالک فاروق خان انہیں بہت پسند آئے تھے۔

”اب آگے کیا سوچا ہے آپ نے، انابیہ کو لے کر جائیں گے؟“ یہ چند جملے اس نے کس دل سے ادا کیے وہی جانتا تھا، وہ دشمن جاں اب اس کی رگ جاں بن چکی تھی، خود سے جدا کرنے کے بارے میں سوچتا ہی کس قدر سوہان روح لگ رہا تھا، اگر وہ چلی گئی تو زندگی کتنی خالی خالی ہو جائے گی، وہ بالکل جیسے ادھور سا ہو جائے گا، کیسے جی پائے گا وہ انابیہ کے بغیر، مگر فاروق خان سے کیا گیا وعدہ اس کی زندگی سے بڑھ کر تھا، وہ امانت میں خیانت کا متنی نہیں تھا۔

”ابہتاج! میں اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔“ فاروق خان کے لیے اس وقت بات کرنا مشکل تو تھا، مگر بات کرنا بھی ضروری تھا، کیونکہ یہ ان کی جیتی جان سے بھی عزیز بیٹی انابیہ کے مستقبل کا سوال تھا۔

”جی کیسے۔“ اس کا ایک ایک عضو سماعت بن گیا تھا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ آپ سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ اور آپ سے زیادہ بہترین جیون ساتھی مجھے انابیہ کے لیے کوئی نہیں ملے گا، میری زندگی بہل ہو جائے گی، میں ساری زندگی آپ لوگوں کا مشکور رہوں گا، اگر انابیہ کے نام

کے ساتھ ہمیشہ آپ کا نام جڑا رہا ہے، اس کے سر پر آپ کے نام کی چادر ڈلی رہے۔ اپنی خواہش، اپنے دل کی بات انہوں نے بی جان اور سید ابہتاج عالم کے گوش گزار کر دی تھی۔ سید ابہتاج عالم پر تو جیسے شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی کہ وہ کچھ بول ہی نہیں پارہا تھا، دل کی خوشی کے مارے ہستی دھڑکنیں معمول پر آ گئی تھیں، جبکہ بی جان نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا، وہ تو خود یہ بات فاروق خان سے کرنا چاہ رہی تھیں، مگر پہلے انہوں نے کر کے ان کی ساری فکریں دور کر دی تھیں۔

”فاروق پٹر! میں آپ سے یہی بات کرنا چاہتی تھی کہ مابیہ دھی کے بغیر میں نہیں رہ سکتی ہوں۔“ بی جان کی بات پر فاروق خان کو سکون ہوا تھا، انہوں نے سید ابہتاج عالم کو دیکھا، وہ خاموش تھا، کہیں وہ اس کے ساتھ نا انصافی تو نہیں کر رہے ہیں؟ وہ اپنی جلد بازی پر جی بھر کے شرمندہ ہوئے تھے۔

”ابہتاج! آئی ایم سوری، مجھے اتنی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا، پہلے آپ کی مرضی معلوم کرنی چاہیے تھی، اگر آپ کی مرضی نہیں ہے تو میں انابیہ کو آپ پر زبردستی مسلط نہیں کروں گا، آپ کی اولیت کو فوقیت دی جائے گی، لیکن اس بات سے بھی بے فکر رہیں، ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔“

”ارے، یہ آپ کیا بول رہے ہیں فاروق! ابہتاج تو کچھ بول، خاموش کیوں ہے؟“ بی جان بھی پریشان ہو گئی تھیں، اس کی خاموشی سے، جبکہ وہ خود بھی الگ گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔

”فاروق صاحب! میں تو بس یہی کہوں گا کہ انابیہ جس طرح آپ کے پاس رہی ہے اس سے کہیں زیادہ خوش رکھوں گا میں اُسے، اس بڑے سے محل کی ملکہ بنا کر رکھوں گا، انشاء اللہ کوئی کمی نہیں ہوگی۔“ کس قدر ہر سکون و سرشار ہوئے تھے وہ، خوشی کی مسکراہٹ ان کے لبوں سے پھوٹی تھی، بہت عزت و احترام سے دیکھا تھا انہوں نے سید ابہتاج عالم کو۔

”تو پھر ٹھیک ہے، اس عید پر ابہتاج اور انابیہ کی دھوم دھام سے ویسے کی تقریب ہے، میں ساری کسر، سارے ارمان نکالوں گی، اپنے بچے کی شادی پر۔“ بی جان نے محبت سے، جان نثار نظروں سے اپنے جگر گوشے کو دیکھا تھا۔ سید ابہتاج عالم کی روشن آنکھوں کی پتلیوں پر اس کا شرماتا، جھکتا چہرہ روشن ہو گیا تھا، عنابی گداز لبوں پر خود بخود مسکراہٹ در آئی، دل میں ایک میٹھی سی گدگدی سی ہونے لگی تھی۔

”بالکل بی جان! ہم یہ خوشی دھوم دھام سے منائیں گے، پھر میں نے سوچا ہے جج پر چلا جاؤں گا۔“ پردے کے پیچھے چھپی انابیہ اس فیصلے پر اپنے رب کا شکر ادا کرنے لگی، مگر سید ابہتاج عالم کا تصور میں سامنا ہونے پر ہی اس کی جان جانے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

سید ابہتاج عالم کے فیورٹ کلر بلیو اینڈ سی گرین امتزاج کے راجستھانی شرارے میں وہ کوئی آسمان سے اتری ہوئی حسین ترین حور لگ رہی تھی، شرارہ اس قدر بھاری تھا کہ وہ تھکنے لگی تھی، شرارے پر اتنا بھاری کام ہوا تھا، سونے کے تاروں سے نہایت باریک بھرا بھرا کام کروایا گیا تھا، مہنگی میچنگ جیولری ایک ہاتھ میں گولڈ اینڈ ڈائمنڈ کی چوڑیاں، دوسرے میں میچنگ کانچ کی چوڑیاں اس کی خرطی کلائی پر بہت جج دھج رہی تھیں، دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک جاتی سُرخ مہندی جس کا رنگ بہت گہرا آیا تھا، جسے سید ابہتاج عالم کی محبت سے مشروط کیا گیا تھا، ہاں میک اپ اس نے گھر میں ہی کروایا تھا، وہ بھی لائٹ میک اپ، بقول اس کے انابیہ کے حسن و خوبصورتی کو ظاہری میک اپ سے چھپا دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ قد آور آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھ رہی تھی، وہ اس قدر حسین ہے اس کا اندازہ تو اسے اس وقت ہوا تھا، مگر آج اس دلکش چہرے پر کسی کے عکس کی چمک تھی، جسے وہ آج پہچان گئی تھی، وہ کون سا جذبہ سر اٹھا رہا تھا، سب جان گئی تھی، یہی کہ اس کا دل صرف اور صرف سید ابہتاج عالم کی ہی مالا چھپتا تھا، سید ابہتاج عالم بیڈ روم میں داخل ہو چکا تھا، اس کی نظر پھولوں کی بیج سے جاتی اس جگہ ٹھہر گئی جہاں وہ دشمن جاں، وہ اپرا کھڑی تھی، سید ابہتاج عالم کتنی ہی دیر تک اس کا حسن اپنی نگاہوں سے دل میں اتار رہا تھا، وہ ابھی تک اس کی موجودگی سے بے خبر تھی، سید ابہتاج عالم ہولے ہولے سے چلتا ہوا اس کے بالکل پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور اس کے دونوں نازک شانوں پر اپنی مضبوط ہتھیلیاں رکھ کر اس کا رخ اپنی سمت موڑا تھا۔

انابیہ کا سانس جیسے رک سا گیا، دل کی دھڑکن مدھم مدھم سی ہونے لگی، ہر نی بڑی بڑی آنکھیں سختی سے میچ لیں، شکر گنی لبوں کو آپس میں اس طرح بھینچ لیا جیسے کچھ نہ بولنے کی قسم کھائی ہو، جھومر، ٹیکے، نتھ اور بڑے بڑے آویزوں میں اس کا ہوش بادل ہکتا حسن مزید دو آتشہ لگ رہا تھا، آج وہ مکمل اس کی دسترس میں تھی۔ سید ابہتاج عالم کو کتنے ہی پل اُسے بغور دیکھتے بیت گئے تھے، پھر رگ ظرافت پھڑکی، تو اس کے سندر چاند سے شرماتے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں بھرے اس پر جھکتا چلا گیا تھا۔ سید ابہتاج عالم کی اس بے ساختہ حرکت پر اس نے پٹ سے آنکھیں کھولی تھیں۔

”عید مبارک!“ مگر وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی تھی، بس ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

”کچھ بولو گی نہیں؟“ ایک سوال تھا جس پر اس نے نفی میں ادھر ادھر گردن ہلا دی تھی، وہ حیران ہوا۔

”کیوں؟“

”بی جان نے منع کیا ہے۔“ معصوم لب و لہجے میں کہتے ہوئے پلکوں کی باڈر لگ گئی تھی۔

”اور بی جان نے کیوں منع کیا ہے؟“

”وہ..... بی جان بول رہی تھیں، اگر میں نے کچھ کہا تو آپ ناراض ہو جائیں گے، غصہ کریں گے۔“ کس قدر معصومیت تھی اس میں، یہ تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بی جان کی ذمہ داری بات تک کو سمجھ نہ سکتی تھی۔ اس کی بات پر سید ابہتاج عالم کا زندگی سے بھرپور قہقہہ گونجا تھا۔

”آپ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے؟“

”میں بھلا اپنی جان سے ناراض ہو سکتا ہوں؟“ سید ابہتاج عالم نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور آہستگی سے اس کی نتھ اتار کر وہیں نیمل پر رکھ دی تھی۔

”تم نے تو ویسے ہی اپنی سادگی سے میرا سارا چین و سکون، دل کا قرار لوٹ لیا ہے، اب یوں جج دھج کر، بن سنور کر میرے سامنے آؤ گی تو میں مزید خود کو کیسے بچا سکتا ہوں؟“ اس نے آرام آرام سے اس کا ٹیکہ دھجھوڑا، بڑے بڑے آویزے اتار دیئے، بھاری دوپٹہ پنوں سے آزاد کر دیا تھا۔

”ارے تم خود اتنی سی جان ہو، بی جان نے بھی تمہیں تمہارے وزن سے زیادہ شرارہ پہنا دیا ہے، ایک کام کرو، وہاں ڈرینک روم ہے، وہاں چینیج کرو، میں تمہارا یہیں ویٹ کرتا ہوں۔“ انابیہ نے بڑی مشکل سے اپنا سانس بحال کیا اور اس کا حکم مانتے ہوئے بھاری وزنی شرارہ سنبھالتی وہ جانے لگی، مگر صوفے پر سے وہ دوپٹہ ضرور اٹھالیا جو سید ابہتاج عالم نے رکھا تھا، وہ اس کی اس حرکت پر دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔ وہ واش روم میں آئی، صاف چمکتا وائٹ ٹائلز سے مزین واش روم تک کو بہت خوبصورت بنایا ہوا تھا، سامنے ہی بینگر کی ہوئی پنک ناٹی نظر آ گئی، اس نے وہ بینگر اتار لیا تھا، مگر یہ کیا، بغیر سلوز کی اور ڈیپ گلاب جس پر دیدہ زیب ہلکی سی کڑھائی ہوئی تھی اس نے وہیں خود

کو بڑے سے مرر میں دیکھا تو شرم سے کٹ کر رہ گئی۔

”اُف اللہ.... اس خلیے میں ان کا سامنا کیسے کروں گی میں؟“ وہ سوچ کر ہی ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی کہ نظر اپنے شرارے کے دوپٹے پر پڑی، سکھ کا سانس لیتے ہوئے اس نے اپنا بھاری دوپٹہ اٹھایا اور اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا تھا، انا بیہ باہر آئی تو ڈھونڈتی نگاہوں نے اس کو تلاش کر لیا، وہ وہیں سنگل صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے صوفے سے ٹیک لگائے ہاتھ میں کوئی بک لیے دیکھ رہا تھا، بلیک تھری پیس سوٹ میں اس کی شخصیت کسی ریاست کے شہزادے سے کم نہیں لگ رہی تھی، جاذبِ نظر پرستیلیٹی، کھلتا ہوا سنہری رنگ، مضبوط قد و قامت، وہ یقیناً عمر میں اس سے دو گنا زیادہ تھا، مگر خود کو اس نے جس طرح مینٹین کر کے رکھا ہوا تھا، اپنی عمر سے دو گنا کم ہی لگتا تھا۔

”اگر وہ مجھے حسن کی ملکہ کہتا ہے تو وہ بھی تو کسی ریاست کا شہزادہ ہے، حسن و خوبصورتی میں یکتا“۔ آج پہلی بار اس نے سید ابہتاج عالم کو بغور دیکھا تھا، وہی اب اس کا سب کچھ تھا، اس کی زندگی، اس کی محبت..... ہاں وہ اس کی محبت تھا، بے پناہ چاہنے لگی تھی وہ سید ابہتاج عالم کو، مگر ایک جھجک پھر بھی مانع تھی، وہ اس سے بات کرنے کی، اس کے سامنے کھڑے رہنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

سید ابہتاج عالم کی روشن آنکھیں سامنے اُنھیں تو انا بیہ کو اپنی طرف ہی بغور دیکھتے پایا، پنک ناٹی جس پر اس نے اپنے ویسے کے دوپٹے سے خود کو چھپا لیا تھا، سید ابہتاج عالم اس کی شرم و حیا پر فریفتہ ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا، اور مضبوط قدم اس کی سمت بڑھاتا جا کر اس کے بالکل سامنے کھڑا ہوا تھا۔

”یہ کیا تم نے پھر اتنا بھاری دوپٹہ اوڑھ لیا؟“ اس نے اس پر سے وہ دوپٹہ کھینچ لیا، بغیر اُسے کوئی بھی مہلت دیئے انا بیہ کی تو جیسے جان پر ہی بن آئی، شرم و حیا سے وہ دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ سید ابہتاج عالم مبہوت ہو کر رہ گیا تھا، وہ دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

”پلیز! آپ مجھے اس طرح مت دیکھیں، میں مر جاؤں گی“۔ بے بسی سے بولتی ان ہر نی آنکھوں میں نمی سمٹ آئی، سید ابہتاج عالم اس کی بات پر ایک بار پھر سے جاندار قبہ لگا بیٹھا تھا۔ آج تو وہ بات بات پر ہنس رہا تھا اور اس کی جان نکال رہا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ! مائی سویٹ انوسینٹ وائف!“ اس نے انا بیہ کا سرخ و سفید بازو پکڑ کر اپنی سمت کھینچا اور خود میں سمو لیا تھا۔

”یہ عید میرے لیے بہت حسین ہے، ہمیشہ یادگار رہے گی، مجھے میری عبادتوں و ریاضتوں کا پھل اس قدر حسین ملے گا، میں سوچ بھی نہیں سکتا، اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے“۔ اس کے سینے میں چہرہ چھپائے انا بیہ کو سید ابہتاج عالم نے بغور دیکھتے ہوئے اس کی پیشانی پر اپنا دہکتا لمس چھوڑ دیا تھا۔

”اب خدا کے لیے اتنی دیر ہو گئی، مگر ابھی تک مجھے میرا جواب نہیں ملا ہے“۔ انا بیہ نے سوالیہ لرزتی پلکیں اوپر اٹھائیں۔

”عید مبارک!“ پھر سے دھیرے سے سرگوشی ہوئی تھی۔

”آپ کو بھی خیر مبارک!“ شرمیلیں مسکراہٹ شگرفی لبوں پر تھی۔ پھر سے وہ خود کو اس کی مضبوط پناہوں میں چھپا گئی تھی، سید ابہتاج عالم نے اس کے گرد اپنی گرفت مزید تنگ کر دی، وہ جتنا سمنٹی جا رہی تھی، سید ابہتاج عالم اس کو اتنا ہی سمنٹا جا رہا تھا۔

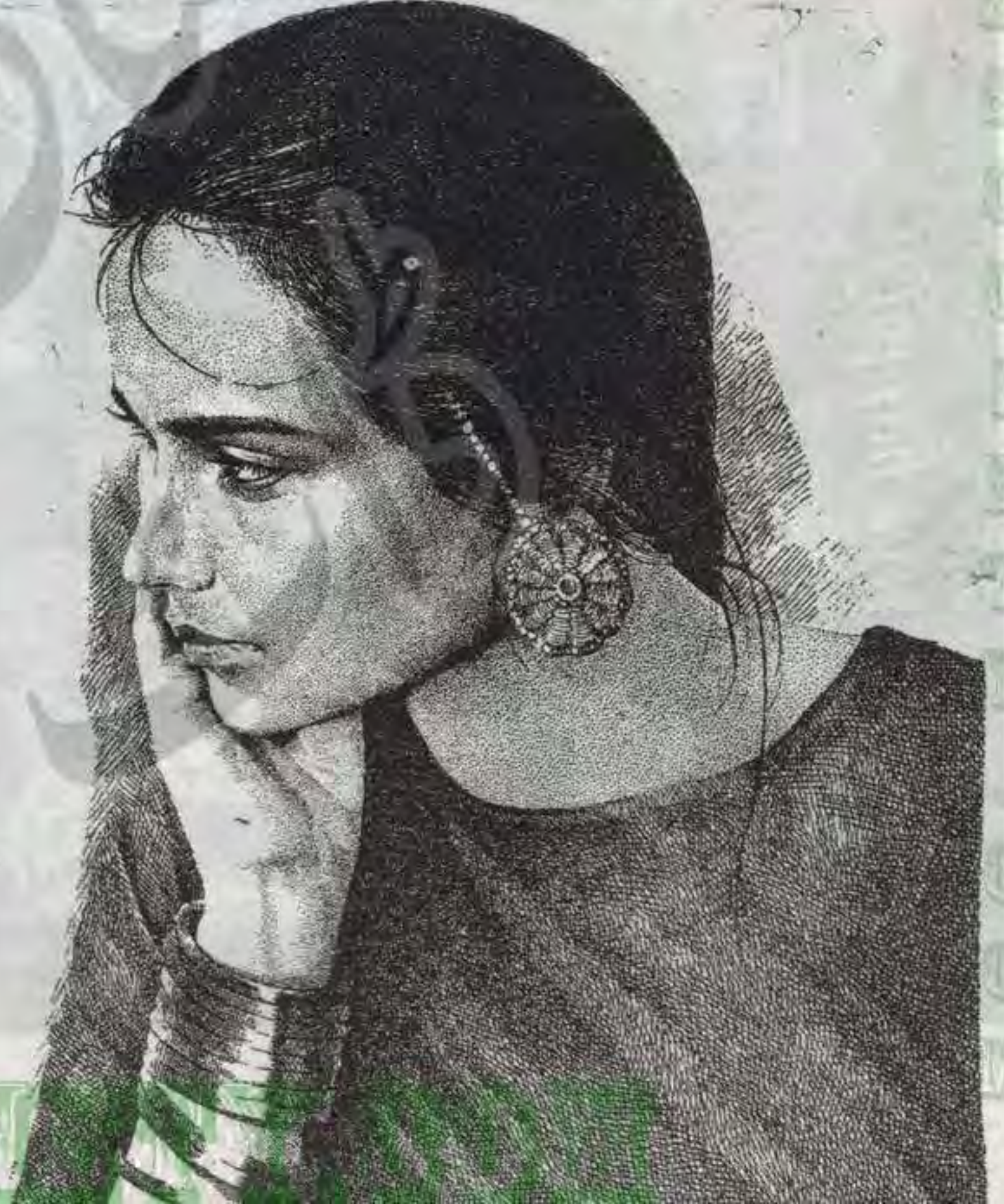
☆.....☆.....☆

لبنی عبید

ناولٹ

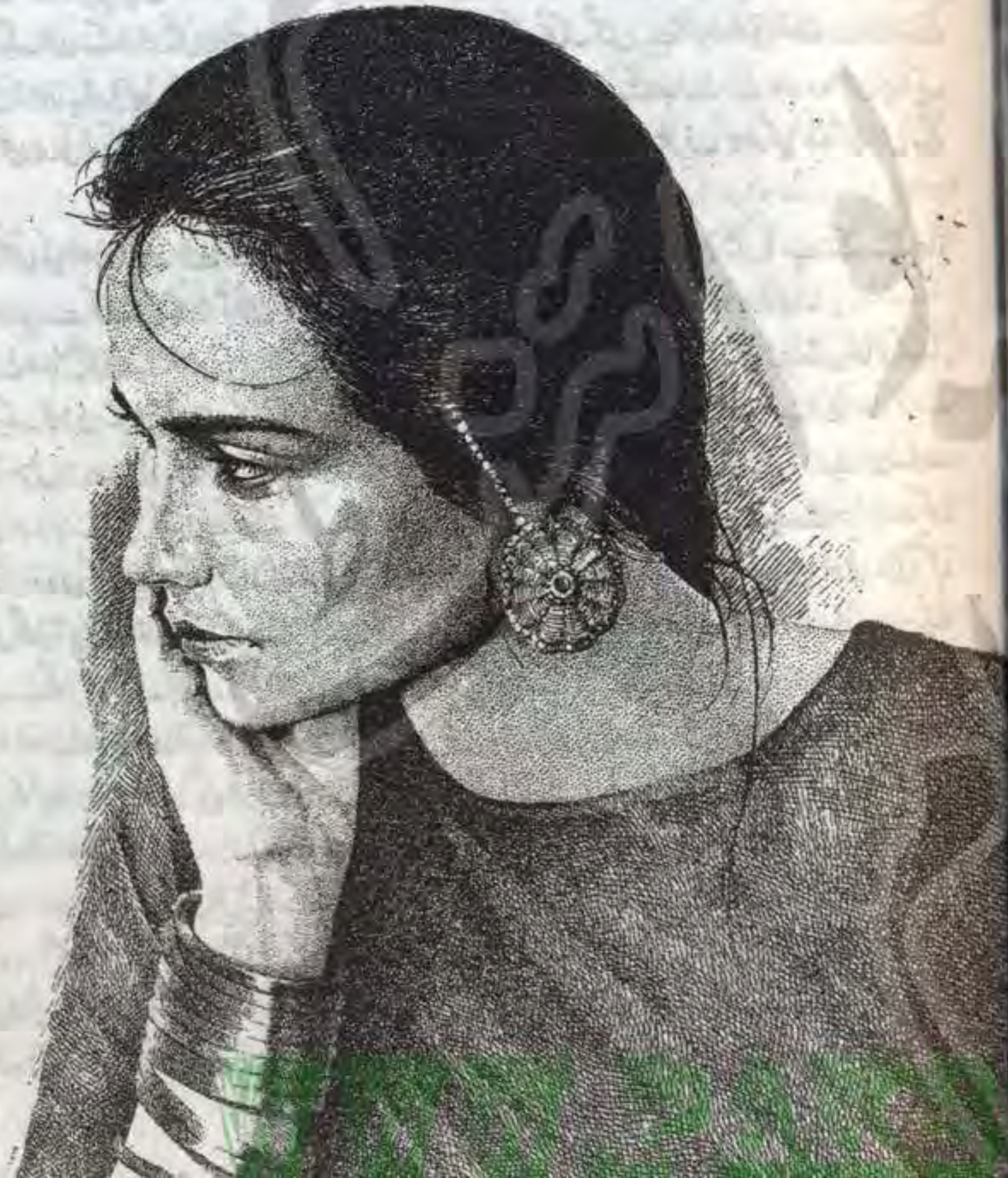
طلسمی رحمانی راتیں

سرد ہوا کے یک بستہ جھونکے لٹوں کو چھو کر گزرتے میں وہ اکیلی بیٹھی اداس نظریں لئے کسی کو تلاشتی ہوئی
تو اندر تک ٹھنڈک کی اک لہر دوڑ جاتی 'سنان رات' آنکھیں کسی کے دیدار کی تمنائی کسی کی آمد کی منتظر نظر



دور تک جاتی پھرنا امید واپس لوٹ آتی 'دسمبر کی یہ رات' اپنے اندر بہت سے راز چھپائے اسے ہی تک رہی تھی اس کی تنہائی پر چوٹ کر رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہاں گئی وہ تیری خوشی 'شوخی' 'شرارت' ٹھنکتی ہوئی ہنس جلتی رنگ سے بچ اٹھتے تھے صبا میں ایک ارتعاش سا برپا ہوا تھا 'سرد ہوا کے جھونکے کو اپنے اندر تک اتارنا اور ایک ہی سانس میں ان کا لطف لینا وہ سر جھکائے اپنی ہی کسی یاد میں ارد گرد سے بے نیاز اس اداسی تنہائی کے خول میں سمٹ آتی یہ سرد ہوا اور یہ مناظر اس کے تنہائی کے ساتھی ٹھہرے۔

"کیا ہو گیا حوریہ.....؟ میں تم سے مخاطب ہوں۔" منزل نے اسے کندھے سے ہلا کر کہا۔
"نہیں کچھ نہیں بس ایسے ہی۔" حوریہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا۔
"اچھا یہ بتاؤ ارتضیٰ بھائی کب لینے آرہے ہیں تمہیں.....؟" منزل نے کھڑکی بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ارتضیٰ کے نام پر حوریہ کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے ارتضیٰ کی طرف سے ملنے والے دکھ 'تکلیف' سب ہی یکدم یاد آ گئے۔
لیکن یہ زخم تو خود اس نے اپنے لئے چن لئے تھے



اپنی ہی غلط حرکتوں کی وجہ سے اور مجبور کیا ارتضیٰ کو کہ وہ اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک روارکھے۔

”ہاں وہ آفس کے کام میں بڑی رہتے ہیں میں خود ہی چلی جاؤں گی ڈرائیور چھوڑ دے گا۔“ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ ارتضیٰ اسے قطعی لینے نہیں آئے گا پر سب کے سامنے اسے اپنے رشتے کا بھرم تو رکھنا تھا وہ گھر جانا نہیں چاہتی تھی، لیکن مجبور تھی کہ کب تک وہ یہاں اپنے میکے میں رہتی، مئی پاپا، مزل سے تو اس نے کچھ بھی شیئر نہیں کیا تھا، خود ہی اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھی۔

”کیا ہوا مزل! ارتضیٰ آئے گا حوریہ کو لینے.....؟“ شائستہ بیگم نے اسے سیزہیاں اترتے ہوئے دیکھ کر پوچھا، فاروق بیگم ان کے برابر میں براجمان تھے۔ ”نہیں مئی! حوریہ ڈرائیور کے ساتھ جائے گی کہہ رہی ہے کہ ارتضیٰ بھائی کو کچھ مصروفیات ہیں۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں ارتضیٰ کی مصروفیات سے واقف ہوں میں تم ایسا کرو حوریہ سے کہو میں چھوڑ آؤں گا اسے۔“ فاروق بیگم نے صلاح دی۔

فاروق بیگم گاڑی میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے وہ مئی اور مزل سے گلے لگ کر اپنے اندر اٹھنے والے طوفان کو دبانے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑی مشکلوں سے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا، گاڑی میں چپ چاپ بیٹھی رہی گھر آچکا تھا، فاروق بیگم نے اترنے کا اشارہ کیا، اس نے گھر کی طرف نظر دوڑائی اس کا یہاں آنے کا قطعی ارادہ نہ تھا، سو مجبوراً وہ اتری، فاروق بیگم کو اندر آنے کو کہا، دونوں اندر کی طرف بڑھ گئے، ملازمہ نے دیکھا تو سلام کیا۔

”شیراں! صاحب کہاں ہیں آگئے آفس سے.....؟“ وہ ابھی ملازمہ سے ارتضیٰ کے بارے میں پوچھ رہی تھی جب ہی وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا، فاروق بیگم کے گلے لگ کر بڑے تپاک

سے ملا، وہ شاید آفس سے ہی آ رہا تھا، حوریہ کو اس شخص کے دوغلے پن پر بڑی حیرت ہوئی، وہ اندر تک تپ کر رہ گئی، کچھ لوگ کیسے ہوتے ہیں جو اپنے چہروں پر طرح طرح کے نقاب لگائے پھرتے ہیں کہ دوسرا بندہ تو بے وقوف ہی بن جائے، پاپا کو کیا معلوم کہ سامنے بیٹھا شخص کتنا بڑا اداکار ہے، کچھ دیر فاروق بیگم اور ارتضیٰ بیٹھ کر باتیں کرتے رہے، وہ اپنے کمرے میں آگئی جب فاروق بیگم جانے لگے، تو وہ انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئی، ساتھ میں ارتضیٰ بھی کھڑا تھا ان کے سامنے تو ایسا رویہ رکھے ہوا تھا کہ جیسے ان دونوں کے مابین بہت اچھے تعلقات ہوں اس لئے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان دونوں کے بیچ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے، ازدواجی تعلقات نہ ہونے کے برابر تھے، ان کے جانے کے بعد وہ اس پر ایک نگاہ غلط ڈال کر اندر کی طرف بڑھ گیا، وہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔

”آپ فریش ہو جائیں میں آپ کے لئے کھانا لگواتی ہوں۔“ ساتھ ہی چلتے ہوئے کہا۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔“ وہ اسے درشتگی سے جواب دیتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ حوریہ ارتضیٰ کے رویے سے بہت دلبرداشتہ رہنے لگی تھی وہ اس سے سیدھے منہ بات کرنا گوارہ نہیں کرتا تھا، وہ گھر میں بور ہی ہوتی رہتی تھی، ارتضیٰ کو اس کی کوئی فکر نہ تھی کہ وہ اپنا سارا دن کیسے گزارتی ہے کیا کرتی ہے؟ بور تو نہیں ہوتی، وہ ان شوہروں کی طرح نہ تھا جو بیویوں کا خیال رکھتے ہیں، قدر کرتے ہیں وہ تو حوریہ کی بے قدری کیا کرتا تھا، اس سے بے خبر رہتا تھا، انجان بنا رہتا تھا کہ اس کے ساتھ اس گھر میں ایک وجود اور موجود ہے، وہ ایسا کیوں کرتا تھا، خود سے کرتا تھا یا جان بوجھ کر۔

”ان کاغذات پر تم سائن کر دو، ویسے مجھے دوسری شادی کرنے کے لئے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں

ہے، پر ابھی تک تم میری بیوی ہو تو اتنا حق تو بنتا ہے تمہارا۔“ ارتضیٰ اس سنگ دلی سے بول رہا تھا کہ حوریہ چکر کر رہ گئی۔

”آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں پلیز ایسا نہ کریں مجھے اتنی بڑی سزا مت دیں۔“ وہ التجائی لہجے میں گڑگڑانے لگی۔

”میں جو کر رہا ہوں مجھے پتہ ہے میں ٹھیک کر رہا ہوں اور تم سے کیا امید رکھوں حوریہ بیگم! جو آپ نے کیا ہے نا اس کے لئے یہ سزا بہت کم ہے۔“ وہ تو اس پر طنز کے تیر ہی برسانے لگا۔ اتنا کہہ کر اس نے لائٹ آف کی اور لیٹ گیا، حوریہ بے آواز اپنے آنسو بہاتی رہی، پر حوریہ کو اب تنہائی میں رہنے کی عادت ہو گئی تھی، سب کچھ سہنے کا اس نے ارادہ کر لیا تھا۔

صبح وہ اس سے پہلے بیدار ہو گئی تھی، ارتضیٰ کی آنکھ کھلی کروٹ لے کر دیکھا تو وہ کمرے میں موجود نہ تھی، پر ان پیچرز پر اس کے سائن دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک پھٹکی سی مسکراہٹ آگئی، وہ فریش ہو کر نیچے آیا تو ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ رکھا تھا، حوریہ اس کی ہر چیز کا خیال رکھتی تھی اس کے تمام کام بخوبی انجام دے رہی تھی، پر ارتضیٰ اس کے کام میں صرف نقص ہی نکالتا تھا، ایک بیوی کی کیا ذمہ داری ہوتی ہے وہ نبھار ہی تھی، جبکہ ارتضیٰ اپنی ذمہ داری نبھانے سے قاصر تھا۔

”پتہ ہے حوریہ! مئی پاپا نے تمہاری شادی ارتضیٰ بھائی کے ساتھ طے کر دی ہے، مجھے تو ارتضیٰ بھائی بہت اچھے لگتے ہیں اور وہ تمہارے ساتھ کتنے اچھے لگیں گے۔“ مزل اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی، حوریہ یکدم سنائے میں آگئی۔

”کیا کہا تم نے مجھ سے پوچھے بغیر مئی پاپا نے میرا رشتہ طے کر دیا، اس ارتضیٰ سے جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے، وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا ہے۔“ اس کا غصہ سے برا حال تھا۔

”پر حوریہ! مئی پاپا نے کچھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے،

وہ عرفان انکل کے بیٹے ہیں اور پاپا اور عرفان انکل کتنے اچھے دوست ہیں، عرفان انکل بھی چاہتے ہیں۔“ مزل کو حوریہ کا منع کرنا کچھ اچھا نہ لگا۔

”نہیں میں مئی پاپا سے خود بات کروں گی، مجھے اس سے شادی نہیں کرنی ہے۔“ وہ ایک حتمی فیصلہ کر کے ابھی شائستہ بیگم کو حوریہ کے انکار کا پتہ چلا تو وہ تو آگ بگولا ہو گئیں۔

”تم ہوش میں ہو کیا کہہ جا رہی ہو اگر تمہارے پاپا نے سن لیا تو جانتی ہو کیا ہوگا۔“

”مما! مجھے اپنی مرضی سے زندگی جینے کا حق ہے۔“ وہ ان سے زبان چلانے لگی۔

”حوریہ! ہم نے تمہیں اتنی آزادی دی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم زندگی کے اتنے بڑے فیصلے بھی خود کرتی پھرو۔“ وہ اپنی بیٹی کی اس حرکت و جرات پر حیران تھیں، حوریہ نے بھی ان سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

”ہم نے بھائی اور بھائی صاحب کو ہاں کہہ دی ہے اب انکار کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے اور یہ فضول کی ضد چھوڑو سمجھیں تم۔“ وہ اسے اپنا حکم سنا کر چلی گئیں وہ سر تھام کر رہ گئی۔

”شارق! میرے پاپا نے میری شادی اپنے دوست کے بیٹے سے طے کر دی ہے۔“ وہ اپنے کانچ کے فرینڈ شارق کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھی تھی، اور تمام روداد جھکی نظروں سے سنارہی تھی، شارق سے اس کی دوستی تھی اور وہ کلاس فیلو بھی تھے، شارق نے اپنی چکنی چڑی باتوں سے حوریہ کو اپنا اسیر کر لیا تھا، اس کی نظر تو صرف اس کی دولت پر تھی، وہ تو کئی اور افیئر چلا چکا تھا، جس سے بے خبر تھی حوریہ اس جیسی معصوم لڑکی کو وہ اپنے جال میں پھنسانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہ اس کی محبت کو سچ سمجھ بیٹھی تھی۔

”تو یار! کچھ کرو میں تمہارے بغیر نہیں رہ پاؤں گا۔“ شارق بے تابی سے بولا۔

”میں کیا کروں شارق! میں مجبور ہوں۔“ حوریہ نے اواسی سے کہا۔

”اچھا تم ایک کام کرو تمہارے پیرنس جہاں کہتے ہیں وہیں شادی کر لو تھوڑے دن تک تو تم اپنے شوہر سے لڑنا جھگڑنا حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ وہ تمہیں طلاق دینے پر راضی ہو جائے پھر تم میرے پاس چلی آنا تمہارے لئے تو میرے تمام دروازے کھلے ہیں۔“ وہ اسے انتہائی گھٹیا مشورہ دینے لگا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے کیا کہہ رہے ہو یہ.....؟“ حوریہ کو اس کی بات سن کر اندر تک جھرجھری آگئی۔

ارتضیٰ آج بہت دنوں بعد ریسٹورنٹ میں آیا تھا پر جب وہ اندر داخل ہوا تو اس کی نظر حوریہ پر پڑی وہ دنیا جہاں سے بے خبر شارق سے باتوں میں مگن تھی ارتضیٰ اسے کسی غیر لڑکے کے ساتھ دیکھ کر اپنی مٹھیاں بھینچ گیا بہر کیف وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے آگے بڑھا سخت طیش کے عالم میں اس نے حوریہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے کھڑا کر دیا حوریہ تو اسے وہاں دیکھ کر ایک دم بھونچکا سی رہ گئی شارق بھی یکدم گھبرا اٹھا۔

”اے مسٹر! یہ میری بیوی ہے آئندہ اب میں تمہیں اس کے ساتھ نہ دیکھوں۔“ شارق تو ارتضیٰ کی اتنی دم دار شخصیت دیکھ کر ڈر ہی گیا وہ سمجھ گیا کہ یہی ارتضیٰ ہے۔ ارتضیٰ حوریہ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے گاڑی تک لایا فرنٹ ڈور کھولا اور اسے دھکا دے کر دروازہ بند کر دیا پھر ڈرائیور تک سیٹ سنبھال لی وہ گاڑی بہت ہی تیز ڈرائیو کر رہا تھا حوریہ پہلے تو اس سے ڈرتی رہی پر پھر ہمت کر کے اس نے بات شروع کی۔

”شارق میرا کلاس فیلو ہے وہ مجھے پسند کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے مجھ سے اور میں بھی اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں آپ سے نہیں۔“

”جسٹ شٹ اپ حوریہ!“ وہ دھاڑا حوریہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا وہ اندر تک لرز کر رہ گئی۔

”تمہیں تو کوئی پرواہ نہیں ہے اپنے والدین کی عزت کی پر مجھے ہے اور جیسا میرے والدین کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا ان کی عزت کو تمہاری طرح مٹی میں نہیں ملا سکتا ہوں۔“ وہ یہ بول کر خاموشی سے آگے کی طرف دیکھنے لگا۔

”پر میں آپ سے شادی نہیں کروں گی میں کبھی آپ کو اپنا شوہر نہیں مانوں گی کیونکہ آپ میں اور شارق میں بہت فرق ہے وہ عورتوں کی عزت کرنے والا ایک اچھا انسان ہے۔“ وہ بھی اس سے ہار مانتے والی نہ تھی۔

”اچھا انسان.....“ وہ یہ کہہ کر استہزائیہ ہنسی ہنسا۔

”یہ تو وقت بتائے گا۔“ گھر آ چکا تھا وہ اسے اتار کر چلا گیا جبکہ حوریہ اڑتی ہوئی دھول کو دیکھتی رہ گئی۔

عرفان صاحب اور ان کی بیگم زرمینہ اپنے ارتضیٰ کی شادی پر بہت خوش دکھائی دے رہے تھے زرمینہ بیگم تو حوریہ کی بلائیں ہی لئے جا رہی تھیں۔

”کتنی پیاری لگ رہی ہے نامیری بہو۔“ انہوں نے شائستہ بیگم سے کہا وہ بھی مسکرا دیں حوریہ اس پر بیٹھی بس اپنے سپنوں کے ٹوٹ جانے کا ماتم ہی منانے لگی دل چاہ رہا تھا اٹھ کر بھاگ جائے یہاں سے پہلو میں بیٹھے ہوئے ارتضیٰ سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ شادی کی رسومات سے فراغت ملی تو زرمینہ بیگم نے حوریہ کو کمرے میں لے جا کر بیٹھا دیا سو مجبوراً ارتضیٰ کو بھی جانا پڑا وہ وہاں موجود نہ تھی بلکہ واش روم سے چپچپ کر کے باہر نکلی تھی ارتضیٰ کو اس سے اسی بات کی توقع تھی وہ بہت تھک چکا تھا اس لئے فریض ہو کر بیڈ پر ہی لیٹ گیا۔

”آپ یہاں لیٹیں گے تو میں کہاں لیٹوں گی.....؟“ وہ اسے بیڈ پر ہی لیٹا دیکھ کر بولی۔

”یہ میرا کمرہ ہے میں تو یہیں سوؤں گا بہر حال تمہیں جہاں ایڈجسٹ ہونا ہے ہو جاؤ اوکے۔“ کہہ کر

کروٹ بدل کر لیٹ گیا وہ بھی بہت تھک چکی تھی تب اس نے یہ اطمینان کر لیا کہ وہ سوچکا ہے تو وہ بھی بیڈ کے کونے پر ہی لیٹ گئی بیڈ کے علاوہ اسے کہیں اور نیند نہیں آتی تھی وہ بے خبر گہری نیند سو گئی صبح جب آنکھ کھلی تو اس نے نظر دوڑائی ارتضیٰ اٹھ چکا تھا وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ گئی کمرے میں زرمینہ بیگم داخل ہوئیں اسے اٹھتا دیکھ کر مسکرائیں حوریہ کو کچھ شرمندگی محسوس ہوئی کہ وہ اتنی دیر تک سوئی رہی۔

”بیٹا! اٹھ جاؤ میں تم لوگوں کے لئے ناشتہ لگواتی ہوں۔“ ارتضیٰ بھی آچکا تھا وہ ان دونوں کو دیکھ کر بولیں ارتضیٰ اسے نظر انداز کر کے شیشے کے پاس کھڑے ہو کر پال بنا کر چلا گیا حوریہ اپنی اس بے قدری پر کھول کر رہ گئی۔ وہ نیچے آئی انکل آئی اور ارتضیٰ کو بیٹھے پایا وہ سب اس کا انتظار کر رہے تھے اس نے عرفان انکل کو سلام کیا انکل آئی کے ساتھ تو حوریہ پہلے ہی سے اچھی طرح ملتی تھی اب تو بات ہی کچھ اور تھی پر سامنے بیٹھے شخص پر جب نظر اٹھی اس نے منہ بنا کر نظریں نیچی کر لیں ارتضیٰ نے باقاعدہ یہ سب نوٹ کیا۔

”اچھا بیٹا! اب کل کی فلائٹ ہماری ہے۔“ زرمینہ بیگم نے ارتضیٰ کی طرف دیکھ کر اطلاع دی۔

”اور ویسے بھی طلال بھی نہ آسکا تمہاری شادی میں بزنس میں جوتا بازی تھا۔“

”ہاں ممّا! طلال کی تو خوب خبر لوں گا میری شادی میں نہیں آسکا اب اسے کہئے گا کہ شادی میں نہیں آیا تو اب تو آجائے اور ویسے بھی شادی آپ لوگوں نے اتنی ارجنٹ کر دی۔“ ارتضیٰ حوریہ کی جانب گن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

عرفان صاحب اور زرمینہ بیگم اپنے چھوٹے بیٹے طلال کے ساتھ امریکا میں ہی شفٹ تھے ارتضیٰ بھی ان کے ساتھ ہی رہتا تھا پر وہ اب پاکستان میں ہی اپنا بزنس سنبھالے ہوئے تھا عرفان صاحب کا امریکا سے اپنا بزنس وائسٹاپ کرنے کا ارادہ تھا اور

مستقبل میں پاکستان میں شفٹ ہونے کا ارادہ تھا ارتضیٰ بھی کافی فورس کر چکا تھا بہر کیف عرفان صاحب اور زرمینہ بیگم امریکا روانہ ہو چکے تھے اور حوریہ کو اب پھر سے وہی بوریت رہنے لگی تھی ارتضیٰ اسے گھرا کر بھول ہی چکا تھا حوریہ می پاپا سے تو کچھ کہہ نہ سکتی تھی کہ ارتضیٰ سب کے سامنے تو ایسے جتنا تھا کہ ان کے درمیان واقعی اچھے تعلقات ہیں اور اکیلے میں پھر وہی لائق انجان بن جاتا تھا فاروق بیگ شائستہ بیگم ان دونوں کی طرف سے مطمئن تھے۔ حوریہ کی بھی کوئی زندگی تھی وہ اسے مسلسل انگور کئے جا رہا تھا اور آج دوسری شادی کی بات کہہ کر تو وہ اسے صدمے کی کیفیت میں ڈال گیا تھا حوریہ اپنے ساتھ ہونے والے انجام کی ذمہ دار خود تھی سو وہ خاموشی سے بھگت رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

آج شام میں جب وہ منزل کے ساتھ شاپنگ پر گئی تو اسٹاپ پر گاڑی رکھی اس نے یوں ہی نظر دوڑائی تو کچھ دور گاڑی میں ارتضیٰ کسی لڑکی کے ساتھ خوشگوار موڈ میں دکھائی دیا اس نے منزل کی طرف دیکھا وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی وہ نہیں دیکھ پائی تھی سگنل کھل چکا تھا اور ارتضیٰ کی گاڑی آگے بڑھ گئی تھی اور شاپنگ پر آ کر قدرے اس کا موڈ بحال تھا اب بگڑ چکا تھا وہ منزل کو گھر ڈراپ کر کے گھر آگئی اور اپنے روم کالاک لگا کر بیڈ پر گر کے بے تحاشہ رونے لگی عرفان صاحب اور زرمینہ بیگم چلے گئے تھے تو ارتضیٰ اب دوسرے کمرے میں ہی شفٹ ہو گیا تھا ان دونوں کے سامنے تو مجبور تھا ایک کمرے میں رہنے پر حوریہ نے آنسوؤں کی صورت اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا اب وہ انھی منہ دھویا اور اپنا حلیہ درست کیا اور نیچے آگئی وہ ارتضیٰ کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی وہ اسے بتا دینا چاہتی تھی کہ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے یہ سب کرنا اتنا سہل نہ تھا وہ بمشکل اس کی طرف آئی۔

”آپ کے لئے کھانا لگواؤں.....؟“ وہ نظریں جھکائے پوچھ رہی تھی، ارتضیٰ نے کچھ چونک کر اسے دیکھا، اترا ہوا چہرہ سوچی سوچی آنکھیں جیسے وہ بہت دیر تک روئی ہو وہ اسے صرف دیکھ کر رہ گیا۔

”ہاں لگواؤں میں آتا ہوں۔“ جب اس نے کہا تو وہ وہاں سے چلی گئی، پر حوریہ کا چہرہ ارتضیٰ کو بے چینی میں ڈال گیا، وہ ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھی، ارتضیٰ ایک اچھتی ہوئی نظر اس پر ڈال کر بولا۔

”تمہارے چہرے کو کیا ہوا، اتنا اترا ہوا ہے جیسے تم بیمار ہو۔“ اس کا انداز کریدنے والا تھا۔

”نہیں تو وہ میری کل رات نیند پوری نہیں ہوئی تھی ناں تو اس وجہ سے۔“ حوریہ ایک دم گڑبڑا گئی تھی۔

”حوریہ! کہیں تمہیں یہ بات تو پریشان نہیں کر رہی کہ میں تمہاری جگہ کسی اور کو دے رہا ہوں، دوسری شادی کر رہا ہوں۔“ اس نے طنزیہ کہا، حوریہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔

”آپ اتنے خوش فہم کب سے ہو گئے اور ایک بات یاد رکھیں کہ آپ چاہے کتنی شادیاں کر لیں مجھے اس سے کیا۔“ غصے سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ ارتضیٰ نے بڑے غور سے اس کے لال ہوتے چہرے کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

”پر کیا کروں مجبور ہوں میں شادی تو میں شانزے سے ہی کروں گا، وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوگی، تم تو ناکام ہو گئی ہو، پر فکر نہ کرو ملنے آتا رہوں گا تم سے اور شانزے کو اپنے ساتھ کہیں اور رکھوں گا۔“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا، وہ صرف اسے دیکھ کر وہاں سے چلی گئی، ارتضیٰ کچھ خاص انداز نہ لگا پایا کہ آخر وہ کیا چاہتی ہے وہ سر جھٹک کر کھانا کھانے لگا۔

آج شام سے ہی موسم ابر آلود تھا، لگتا تھا کہ جیسے بہت زور سے بارش آنے والی ہو رات میں وہ اپنے کمرے میں ہی تھی، جب ہی بہت زور سے بجلی کڑکنے کی آواز آئی، وہ اتنی رات میں بجلی کڑکنے سے ڈر رہی گئی تھی،

وہ بہت ڈرتی تھی جب اس طرح بجلی کڑکنے کی آواز آتی، منزل تو اس کا مذاق اڑاتی کہ کیا بچوں کی طرح ڈرتی رہتی ہو، گھر پر تو منزل اس کے ساتھ ہی ہوتی تھی، وہ خوف زدہ تب بھی ہوتی تھی، پر آج وہ اس کمرے میں اکیلی تھی، خوف سے کانپ رہی تھی، کھڑکی سے بجلی کی چمک آتی تو وہ مزید خوفزدہ ہو جاتی، اس لئے اس نے کمرے کی لائٹ آن کر دی، اب وہ بیڈ پر بیٹھی آنکھیں بند کر کے بارش کے رکنے کا اور آواز کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

”شیراں! بی بی کہاں ہیں.....؟“ ارتضیٰ نے ملازمہ سے اس کے بارے میں پوچھا۔

”صاب جی! وہ تو اپنے کمرے میں ہوں گی۔“ اسے قطعی معلوم نہ تھا کہ بی بی کہاں ہیں، وہ تو خود اپنے کوارٹر میں جا رہی تھی اتنی تیز بارش جو ہو رہی تھی۔

”اچھا تم بھی جاؤ اور دروازہ لاک کر لینا ٹھیک ہے۔“ ارتضیٰ شیراں کو ہدایت دیتا ہوا حوریہ کو دیکھنے کے لئے اس کے کمرے تک آیا، اس کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی، اس نے ناب گھمائی تو دروازہ کھل گیا تھا، اندر سے لاک نہیں لگا تھا وہ اندر کی طرف بڑھ گیا تھا،

بیڈ پر وہ جس طرح بچوں کی طرح بیٹھی تھی کوئی بھی اسے دیکھ کر ہنس پڑتا، وہ اپنی ہنسی دباتے ہوئے آگے بڑھ اور کندھا ہلا کر اسے آواز دی بے اختیار ہی حوریہ کسی اپنے پاس موجود پا کر اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کے گلے سے لگ گئی، وہ اس وقت محفوظ پناہ گاہ چاہتی تھی، اتنی خوف زدہ تھی کہ اسے پتہ تک نہ چلا کہ وہ کس کے گلے سے لگ گئی ہے، دوسری طرف ارتضیٰ اس کے اس طرح اچانک ہی گلے لگ جانے پر حیرانگی کی زد میں تھا، حوریہ کا دل اسے ایک لطیف سا احساس بخش رہا تھا، دل میں ایک ٹھنڈی چھاؤں کا احساس ہوا تھا، وہ بمشکل اسے خود سے الگ کر کے پوچھنے لگا۔

”کیا ہوا حوریہ! تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو.....؟“ مجھے اس بارش اور بجلی کے کڑکنے سے بہت

”جی! شاید آج بھی ہو۔“ شیراں وہاں کھڑی ارتضیٰ سے بات کرنے لگی، وہ جا چکی تھی اور اس نے شیراں کو بھی آواز دے کر کچن میں بلا لیا تھا، ارتضیٰ کے لبوں پر مدہم تبسم بکھر گیا۔

”حوریہ! آج رات کی فلائٹ سے طلال آ رہا ہے تم ایسا کرو ایک کمرہ سیٹ کروادو۔“ وہ لاؤنج میں آئی تو ارتضیٰ نے اس سے کہا۔

”جی! اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ کہہ کر مڑ گئی تھی جبکہ ارتضیٰ اسے ہی دیکھ رہا تھا، سوچ رہا تھا آخر کیا ہے اس کے دل میں کیا کرنا چاہتی ہے وہ ایسا کیوں کر رہی ہے، بہر کیف رات میں طلال آیا تو بھائی کے گلے لگ گیا اور شکوہ بھی کر ڈالا کہ اس کے بغیر اس نے شادی کر لی، حوریہ سے بھی ملا، ارتضیٰ کے کان میں جا کر اس نے سرگوشی کی۔

اس طرح پاس آ کر اتنے حق سے گلے لگ جانا، اسے اندر تک شانت کر گیا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر ارتضیٰ بڑے ہی موڈ میں تھا، وہ بڑی ہی محبت بھری اور شرارتی نظروں سے حوریہ کو اپنی نظروں کے حصار میں لئے ہوئے تھا، حوریہ اس کی نظروں کی پیش محسوس کر رہی تھی، اس نے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی، پہلے ہی وہ حماقتیں کر چکی تھی، ارتضیٰ جانتا تھا کہ حوریہ اس سے شرمندہ ہے، ندامت اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ لی تھی، اگر وہ خود پہل کر لیتی تو ارتضیٰ کو زیادہ خوشی ہوتی، وہ جانتا تھا کہ جب اس نے دوسری شادی کا ذکر حوریہ سے کیا تھا تو کس طرح اس نے ری ایکٹ کیا تھا اس نے کچھ ظاہر نہ کیا، پر وہ اس کا رویہ محسوس کر چکا تھا۔

”شیراں! کل جیسی بارش کا امکان ہے کیا آج بھی کل کی بارش میں تو واقعی کچھ خاص تھا۔“ وہ شیراں سے مخاطب تھا، پر دیکھ حوریہ کی طرف رہا تھا، حوریہ اس کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکی تھی اس لئے ارتضیٰ کو دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

”پتہ نہیں صاب جی! شاید آج بھی ہو۔“ شیراں وہاں کھڑی ارتضیٰ سے بات کرنے لگی، وہ جا چکی تھی اور اس نے شیراں کو بھی آواز دے کر کچن میں بلا لیا تھا، ارتضیٰ کے لبوں پر مدہم تبسم بکھر گیا۔

”جی! اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ کہہ کر مڑ گئی تھی جبکہ ارتضیٰ اسے ہی دیکھ رہا تھا، سوچ رہا تھا آخر کیا ہے اس کے دل میں کیا کرنا چاہتی ہے وہ ایسا کیوں کر رہی ہے، بہر کیف رات میں طلال آیا تو بھائی کے گلے لگ گیا اور شکوہ بھی کر ڈالا کہ اس کے بغیر اس نے شادی کر لی، حوریہ سے بھی ملا، ارتضیٰ کے کان میں جا کر اس نے سرگوشی کی۔

اس طرح پاس آ کر اتنے حق سے گلے لگ جانا، اسے اندر تک شانت کر گیا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر ارتضیٰ بڑے ہی موڈ میں تھا، وہ بڑی ہی محبت بھری اور شرارتی نظروں سے حوریہ کو اپنی نظروں کے حصار میں لئے ہوئے تھا، حوریہ اس کی نظروں کی پیش محسوس کر رہی تھی، اس نے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی، پہلے ہی وہ حماقتیں کر چکی تھی، ارتضیٰ جانتا تھا کہ حوریہ اس سے شرمندہ ہے، ندامت اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ لی تھی، اگر وہ خود پہل کر لیتی تو ارتضیٰ کو زیادہ خوشی ہوتی، وہ جانتا تھا کہ جب اس نے دوسری شادی کا ذکر حوریہ سے کیا تھا تو کس طرح اس نے ری ایکٹ کیا تھا اس نے کچھ ظاہر نہ کیا، پر وہ اس کا رویہ محسوس کر چکا تھا۔

”شیراں! کل جیسی بارش کا امکان ہے کیا آج بھی کل کی بارش میں تو واقعی کچھ خاص تھا۔“ وہ شیراں سے مخاطب تھا، پر دیکھ حوریہ کی طرف رہا تھا، حوریہ اس کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکی تھی اس لئے ارتضیٰ کو دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

”پتہ نہیں صاب جی! شاید آج بھی ہو۔“ شیراں وہاں کھڑی ارتضیٰ سے بات کرنے لگی، وہ جا چکی تھی اور اس نے شیراں کو بھی آواز دے کر کچن میں بلا لیا تھا، ارتضیٰ کے لبوں پر مدہم تبسم بکھر گیا۔

”حوریہ! آج رات کی فلائٹ سے طلال آ رہا ہے تم ایسا کرو ایک کمرہ سیٹ کروادو۔“ وہ لاؤنج میں آئی تو ارتضیٰ نے اس سے کہا۔

”جی! اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ کہہ کر مڑ گئی تھی جبکہ ارتضیٰ اسے ہی دیکھ رہا تھا، سوچ رہا تھا آخر کیا ہے اس کے دل میں کیا کرنا چاہتی ہے وہ ایسا کیوں کر رہی ہے، بہر کیف رات میں طلال آیا تو بھائی کے گلے لگ گیا اور شکوہ بھی کر ڈالا کہ اس کے بغیر اس نے شادی کر لی، حوریہ سے بھی ملا، ارتضیٰ کے کان میں جا کر اس نے سرگوشی کی۔

اس طرح پاس آ کر اتنے حق سے گلے لگ جانا، اسے اندر تک شانت کر گیا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر ارتضیٰ بڑے ہی موڈ میں تھا، وہ بڑی ہی محبت بھری اور شرارتی نظروں سے حوریہ کو اپنی نظروں کے حصار میں لئے ہوئے تھا، حوریہ اس کی نظروں کی پیش محسوس کر رہی تھی، اس نے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی، پہلے ہی وہ حماقتیں کر چکی تھی، ارتضیٰ جانتا تھا کہ حوریہ اس سے شرمندہ ہے، ندامت اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ لی تھی، اگر وہ خود پہل کر لیتی تو ارتضیٰ کو زیادہ خوشی ہوتی، وہ جانتا تھا کہ جب اس نے دوسری شادی کا ذکر حوریہ سے کیا تھا تو کس طرح اس نے ری ایکٹ کیا تھا اس نے کچھ ظاہر نہ کیا، پر وہ اس کا رویہ محسوس کر چکا تھا۔

”شیراں! کل جیسی بارش کا امکان ہے کیا آج بھی کل کی بارش میں تو واقعی کچھ خاص تھا۔“ وہ شیراں سے مخاطب تھا، پر دیکھ حوریہ کی طرف رہا تھا، حوریہ اس کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکی تھی اس لئے ارتضیٰ کو دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

”پتہ نہیں صاب جی! شاید آج بھی ہو۔“ شیراں وہاں کھڑی ارتضیٰ سے بات کرنے لگی، وہ جا چکی تھی اور اس نے شیراں کو بھی آواز دے کر کچن میں بلا لیا تھا، ارتضیٰ کے لبوں پر مدہم تبسم بکھر گیا۔

”حوریہ! آج رات کی فلائٹ سے طلال آ رہا ہے تم ایسا کرو ایک کمرہ سیٹ کروادو۔“ وہ لاؤنج میں آئی تو ارتضیٰ نے اس سے کہا۔

”جی! اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ کہہ کر مڑ گئی تھی جبکہ ارتضیٰ اسے ہی دیکھ رہا تھا، سوچ رہا تھا آخر کیا ہے اس کے دل میں کیا کرنا چاہتی ہے وہ ایسا کیوں کر رہی ہے، بہر کیف رات میں طلال آیا تو بھائی کے گلے لگ گیا اور شکوہ بھی کر ڈالا کہ اس کے بغیر اس نے شادی کر لی، حوریہ سے بھی ملا، ارتضیٰ کے کان میں جا کر اس نے سرگوشی کی۔

اس طرح پاس آ کر اتنے حق سے گلے لگ جانا، اسے اندر تک شانت کر گیا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر ارتضیٰ بڑے ہی موڈ میں تھا، وہ بڑی ہی محبت بھری اور شرارتی نظروں سے حوریہ کو اپنی نظروں کے حصار میں لئے ہوئے تھا، حوریہ اس کی نظروں کی پیش محسوس کر رہی تھی، اس نے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی، پہلے ہی وہ حماقتیں کر چکی تھی، ارتضیٰ جانتا تھا کہ حوریہ اس سے شرمندہ ہے، ندامت اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ لی تھی، اگر وہ خود پہل کر لیتی تو ارتضیٰ کو زیادہ خوشی ہوتی، وہ جانتا تھا کہ جب اس نے دوسری شادی کا ذکر حوریہ سے کیا تھا تو کس طرح اس نے ری ایکٹ کیا تھا اس نے کچھ ظاہر نہ کیا، پر وہ اس کا رویہ محسوس کر چکا تھا۔

”واؤ بھائی! بھائی تو بہت زبردست ہیں۔“ جس پر ارتضیٰ کا ایک جاندار قہقہہ بلند ہوا اور حوریہ کھڑی دونوں بھائیوں کی گفتگو سے نروس سی ہو گئی، طلال بہت کم پاکستان آتا تھا اس بار وہ بہت عرصے بعد پاکستان آیا تھا، پروہ جلد ہی سب سے گھل مل جاتا تھا یہ ہی وجہ تھی کہ وہ حوریہ سے ایسے بات کر رہا تھا کہ جیسے ان میں بہت اچھی بات چیت ہو، اور حوریہ کو بھی اس سے بات کرنے میں اب جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی، طلال نے آتے ہی حوریہ سے دوستانہ رویہ اپنا لیا تھا، حوریہ طلال سے بات کرتے ہوئے مسکراتی اس سے مذاق کرتی، جب کہ ارتضیٰ دیکھتا تو اسے دیکھ کر رہ جاتا۔

”ایک میں ہی ہوں جس سے تم بات کرنا پسند نہیں کرتیں۔“ وہ افسردہ سا ہو کر سوچتا۔

”اب طلال کی موجودگی میں تم اپنے کمرے میں نہ سوؤ تو اچھا ہے، ورنہ ہم دونوں کو الگ الگ کمروں میں دیکھ کر طلال کو کچھ غلط محسوس نہ ہو، اور میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ جب تک طلال ہے، تم میرے کمرے میں ہی رہو۔“ وہ کہہ کر رکنا نہیں چلا گیا تھا، پیچھے کھڑی حوریہ کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوا تھا، اسے کمرے میں جانا پڑا وہ بیڈ پر نیم دراز کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا، اور کمرے میں آتے ہوئے اس نے اسے دیکھ لیا تھا، پھر بھی کتاب پڑھنے میں مشغول رہا۔

”مجھے بیڈ کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی آپ ایسا کریں کہ صوفے پر سو جائیں۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”واہ محترمہ! یہ مت بھولیں کہ آپ میرے کمرے میں ہیں اور مجھے ہی صوفے پر سونے کا بول رہی ہیں۔“ وہ تو اس کی بات پر حیران ہی ہو گیا۔

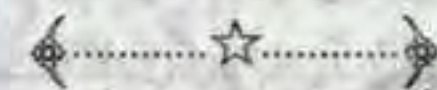
”تو پھر میں آپ کے ساتھ اس بیڈ پر نہیں سو سکتی۔“ اس نے صاف انکار کیا۔

”بے فکر ہو کر سو جاؤ، جیسا تم سوچ رہی ہو ویسا

نہیں ہے، مجھے تم میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے، کجا کر تمہیں ہاتھ بھی لگاؤں۔“ کہہ کر لائٹ آف کر کے لیٹ گیا تھا۔

حوریہ اپنی اتنی تذلیل پر اپنا غصہ ضبط کر کے وہیں اس کے برابر میں لیٹ گئی، جب صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ ارتضیٰ کے بالکل قریب تھی، اس کے ہاتھ پر اس کا سر رکھا ہوا تھا، وہ ایک عجیب سے احساس میں گھر گئی، ارتضیٰ کے بدن سے اٹھتی خوشبو اسے مد ہوش کے جا رہی تھی، اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ سو رہا تھا۔ انہی ہوئی ستواں ناک، کسرتی جسم وہ اسے دیکھے گئی، دل اس کے پہلو میں لیے رہنے کی ضد کرنے لگا، وہ گہری نیند میں تو تھا تو کیا فرق پڑتا اگر وہ اسی طرح لیٹی رہے نہیں پھر وہ اس ڈر سے کہیں وہ اٹھ نہ جائے فوراً ہی اٹھ بیٹھی پر بے اختیار ہی وہ اسے دیکھے جا رہی تھی اور بے اختیار ہی اس نے ارتضیٰ کے گال پر اپنے لب رکھ دیئے اور تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی، ارتضیٰ جو کہ سو رہا تھا سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا اس کے اس انداز پر آنکھیں کھول کر اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر بڑی دلچسپی سے مسکرا اٹھا۔

”یہ پاگل لڑکی واقعی پاگل کر دے گی مجھے۔“ اس نے خود سے سرگوشی کی۔ وہ حوریہ کی بے تابیاں اور حماقتوں سے بہت لطف اندوز ہوتا اور یہ چاہتا تھا کہ حوریہ پورے دل سے بغیر کسی خوف کے، ندامت کے اس کے قریب آئے نہ کہ ڈر ڈر کے۔



آج دوپہر کھانے پر فاروق بیگ نے حوریہ پر ارتضیٰ، طلال کو مدعو کیا، طلال کی وجہ سے وہ اتنے سالوں بعد پاکستان آیا تھا، طلال فاروق بیگ اور شائستہ بیگم سے پر تیا کہ انداز سے ملا، گھر میں تو آنا واقعی رونق لگی ہوئی تھی، حوریہ کا موڈ قدرے بہتر تھا وہ اپنے آپ کو خوش محسوس کر رہی تھی، جبکہ طلال منزل کی معصومیت، پاکیزہ صورت میں الجھ کر رہ گیا۔

منزل، ارتضیٰ کی کسی بات پر مسکرا رہی تھی جب ہی ارتضیٰ نے دیکھا کہ طلال کتنے جذب سے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔

”بس کر بھائی! اتنا نہ گھور وہ جا چکی ہے۔“ اس نے اس کی محویت کو توڑا، طلال تھوڑا جھل ہو کر مسکراتے لگا۔

”ہوں..... تو ایسے کیوں دیکھے جا رہا تھا منزل کو۔“ ارتضیٰ نے طلال کو چھیڑتے ہوئے ہنکارہ بھرا۔

”کچھ نہیں بھائی! آپ بھی۔“ وہ سر ہلا کر منع کرنے لگا۔

”تو کیا میں آئی، انکل سے بات کروں کہ میری سالی صاحبہ میرے بھائی کا دل لے گئی ہے۔“ ارتضیٰ نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

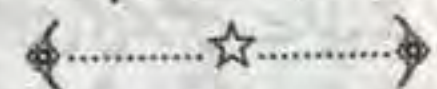
”کیا بھائی۔“ طلال ایک دم اچھل پڑا، پھر بعد میں خود ہی کھسیا گیا۔

”ہاں بیٹا! بات تو چلائی پڑے گی تمہاری، اتنی بے قراری دیکھ کر ممما، پاپا کو بھی بتانا پڑے گا، اب جلد از جلد اپنے بیٹے کو تھکڑی لگا دیں۔“

”کیا باتیں ہو رہی ہیں.....؟“ منزل ان دونوں کو خوفزدہ دیکھ کر وہیں چلی آئی۔

”کچھ نہیں سالی صاحبہ! بس کچھ ایسے ہی۔“ ذو معنی بات کہہ کر ارتضیٰ طلال کی طرف دیکھنے لگا، منزل کے یہاں آنے پر اس کے چہرے پر خوشی کی ایک رفق دوڑ گئی۔

”چلیں تو یہاں کیوں کھڑے ہیں، وہاں چل کر بیٹھیں، حوریہ نے چائے بنادی ہے۔“ اس نے ڈانٹنگ روم کی طرف اشارہ کیا اور آگئی، جبکہ ارتضیٰ طلال کو دیکھ کر ابرو اچکا کر اسے آگے بڑھنے کا کہنے لگا۔



پہلے ارتضیٰ نے عرفان صاحب اور زرینہ بیگم سے طلال اور منزل کے رشتے کے بارے میں بات کی، وہ تو بہت خوش تھے کہ اگر طلال راضی ہے تو انہیں کوئی اعتراض نہ تھا، وہ حوریہ جیسی بہو پا کر مطمئن تھے، منزل

انہیں پسند بھی تھی، عرفان صاحب نے فاروق بیگ سے منزل کا رشتہ مانگ لیا، فون پر ہی انہوں نے بات کی، فاروق بیگ، شائستہ بیگم حیران بھی تھے اور خوش بھی انہیں دوسرا داماد بھی اچھا مل رہا تھا، وہ اپنے رب کے شکر گزار تھے۔

عرفان صاحب نے فاروق بیگ سے کہہ دیا تھا کہ وہ مستقل ہی پاکستان شفٹ ہوں گے، تب ہی طلال اور منزل کی شادی کریں گے، حوریہ خوش تھی کہ اس کی بہن کو اتنا اچھا جیون ساٹھی ملا، عرفان صاحب نے طلال اور منزل کو اپنے ساتھ ہی جہاں انہوں نے بنگلہ لیا تھا، اپنے ساتھ رکھا، جبکہ ارتضیٰ کا اپنا خود کا گھر تھا، اس لئے وہ ملنے آ جایا کرتا تھا، طلال منزل کو پا کر بے حد خوش تھا اور منزل بھی دونوں ہی شادی کے بعد مختلف جگہوں پر گھومنے گئے، طلال اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا، اس کی ہر خواہش کا احترام کرتا، دونوں کی ازدواجی زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ حوریہ منزل سے جب طلال کے بارے میں سنتی کہ وہ کتنا چاہتا ہے تو اسے اس کی قسمت پر رشک آتا، اور وہ اس کی دائمی خوشیوں کی دعا کرتی، جبکہ ارتضیٰ تو شادی کے بعد اسے گھومنے تو دور کہیں شاپنگ پر بھی نہیں لے کر گیا تھا، وہ تو شاید اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا، اور اپنی محبت شانزے کو پانا چاہتا تھا، متنی سوچیں اسے مزید دکھی کر دیتی تھیں، اسے اپنا آپ بے مایہ سا لگتا وہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ وہ ارتضیٰ کی بیوی کے درجے پر فائز ہو اور ارتضیٰ نے بھی تو اب تک اسے بیوی کا درجہ نہیں دیا تھا، اس سے وہ یہ ہی مطلب نکال پاتی وہ اپنی ہی خود ساختہ سوچوں میں الجھی رہتی۔

”ارے شانزے! ہم ساتھ چل تو رہے ہیں پھر باقی باتیں بعد میں کریں گے۔“ وہ موبائل پر بات کرتا کمرے میں آیا اور کمرے میں آ کر والٹ اور گاڑی کی چابی اٹھانے لگا، ایک نظر حوریہ پر ڈالی جو کرسی پر بیٹھی سوچوں میں گم نظر آئی وہ بات ختم کر کے اس کی

طرف بڑھا۔

”حوریہ! میں شہر سے باہر جا رہا ہوں دو دن کے لئے، تم ایسا کرنا یا تو می کو یہاں بلا لینا یا پھر وہاں چلی جانا۔“

”جی اچھا۔“ وہ صرف اتنا کہہ کر چپ ہو گئی وہ اسے اس قدر سوچوں میں گم دیکھ کر اس سے پوچھ بھی نہ سکا کہ وہ ایسے کیوں بیٹھی ہے اسے بزنس کے سلسلے میں ارجنٹ جانا تھا، جانا ضروری تھا اس لئے بعد میں بات کرنے کے ارادے سے وہ کمرے سے نکل گیا۔ حوریہ ارتضیٰ کو فون پر شانزے سے بات کرتے ہوئے اور ساری گفتگو سن چکی تھی۔

”شانزے تو وہی تھی جس سے شادی کرنے کے لئے ارتضیٰ نے کہا تھا، وہ میری محبت ہے اور اس سے ہی میں شادی کروں گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ارتضیٰ اگر شہر سے باہر گئے ہیں تو وہ بھی ساتھ ہوگی، ہو سکتا ہے انہوں نے اب تک شادی بھی کر لی ہو اس لئے تو ارتضیٰ دن بدن کتنے خوش نظر آ رہے ہیں، اپنی محبت کو پالیا ہوگا، کتنی خوش نصیب ہے شانزے کہ اسے ارتضیٰ کی محبت مل گئی ہے اور ایک میں ہوں، جس نے خود ہی سب کچھ گنوا دیا، اب شاید اسی طرح مجھے ساری زندگی گزارنی ہوگی ایسے ہی اکیلے۔“ کیا ہو گیا تھا اسے کیا وہ ارتضیٰ سے محبت کرنے لگی تھی اور جتنی محبت وہ کرنی تھی بدلے میں اس سے بھی ایسی محبت چاہتی تھی، پر وہ ایسی خواہش کر کے خاموش ہی ہو سکتی تھی اسے ارتضیٰ سے محبت، توجہ نہیں مل سکتی تھی، سوچتے سوچتے اس کا ذہن نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا چلا گیا تھا، اس کا ذہن منہ ہی سوچ رہا تھا۔

☆.....☆

”میری جان جانا، پیاسی زمین منتظر تمہاری راہ نکلتی، نظریں بچھائے امیدیں لگائے تڑپتی ہوئی، سسکتی ہوئی تمہارے دیدار کی تمنائی تمہیں پانے کی خواہش تمہاری نظر الفت کی شیدائی کہ آؤ آکر ایسے

برس جاؤ کہ تم بن تو ادھوری ہے یہ ناممکن ہے میرے ہم نفس آکر اپنی محبتوں کی بارش سے اسے سیراب کر دو، زندگی سنوار دو مکمل کر دو اپنے پیار کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں سے معطر کر دو۔“ ارتضیٰ کب سے حوریہ کے بارے میں سوچ رہا تھا، اس کا اداس سوچوں میں الجھا ہوا کچھ سوال کرتا ہوا چہرہ بار بار نظروں کے سامنے گھومنے لگا، وہ اس سے دور آ کر اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا، ایک بل کے لئے بھی اس کی یاد سے غافل نہ رہ سکا، کچھ سوچ کر وہ موبائل پر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

ارتضیٰ کے جانے کے بعد حوریہ کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا، کھانا بھی اس نے برائے نام کھایا اور کسی کو بلانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی، وہ اپنی کیفیت کسی پر آشکار نہیں کرنا چاہتی تھی، اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر دن گزار رہی تھی، شیراں سے تھوڑی بات کر لیتی تو دل بہل جاتا، دوپہر کا وقت تھا، وہ شیراں سے بیٹھی باتیں کر رہی تھی کچھ پرانے کپڑے تھے اور کچھ سامان وہ شیراں کو دے رہی تھی جسے لے کر وہ بہت خوش ہو رہی تھی، اس کی خوشی دیکھ کر حوریہ کو بھی اندرونی خوشی مل رہی تھی، تب ہی فون کی بیل بج اٹھی، شیراں نے فون اٹھا لیا۔

”بی بی جی! صاحب جی کا فون ہے۔“ اس نے حوریہ کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ فون کرے گا، پر وہ ریسپور ہاتھ میں پکڑ کر شیراں کو جانے کا اشارہ کرنے لگی، شیراں تمام سامان لے کر چل دی۔

حوریہ نے اس کی آواز سن کر اسے سلام کیا، اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی، ارتضیٰ سے کیا بات کرے ایسے کوئی دوستانہ تعلقات تو نہ تھے، پر دوسری طرف ارتضیٰ کا اس قدر ہشاش بشاش موڈ محسوس کر کے حوریہ اور شک کی گہرائی میں جا گری۔

”حوریہ کیسی ہو، تمہارے موبائل پر کب سے ٹرائی

کر رہا ہوں، پر تم ریسپونڈ نہیں کر رہی تھیں اس لئے میں نے گھر کے نمبر پر کیا ہے۔“ دوسری طرف اس کی آواز بالکل دوستانہ تھی۔

”ٹھیک ہوں، کوئی کام تھا کیا کیسے فون کیا.....؟“ اس نے بہت روکھے انداز میں پوچھا۔

”کیوں کسی کام کے لئے فون کیا جاتا ہے کیا.....؟ میں تمہیں فون نہیں کر سکتا۔“ ارتضیٰ اس کی اتنی بے نیازی پر تپ ہی گیا۔

”اچھا مجھے تم سے یہ پوچھنا تھا کہ تمہارے لئے کیا لاؤں.....؟ ویسے تو میں لاؤں گا پر تم سے پوچھنا ضروری سمجھا، تم اپنی پسند بتاؤ۔“ ارتضیٰ حوریہ کو یہاں آ کر واقعی مس کر رہا تھا، پر حوریہ کے اتنے روکھے پھیکے انداز پر وہ جیسے افسردہ ہوا۔

”مجھے کچھ نہیں چاہئے میرے پاس سب موجود ہے، اب میں فون رکھ رہی ہوں، مجھے بہت کام ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بچ دیا، ارتضیٰ اس کے رویہ پر اندر سے غم و غصے سے کھول کر رہ گیا، کہاں وہ اس سے اتنے دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا اور حوریہ نے تو اسے جھاڑ ہی دیا۔

”بڑے آئے کہ کیا لاؤں تمہارے لئے وہاں سے اپنی بیوی کے ساتھ عیش کر رہے ہوں گے اور سوچا ہوگا کہ مجھے کچھ لا کر دے دیں گے تو احسان بھی ہو جائے گا، فرض بھی پورا ہو جائے گا۔“ وہ اپنے شک کی بناء پر بغیر سوچے سمجھے یہ حرکت کر بیٹھی، پھر خود ہی اپنی گود میں سر دے کر بری طرح رو دی، جبکہ ارتضیٰ یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ حوریہ نے ایسا کیوں کیا.....؟

☆.....☆

اتنی بہادر تو نہ تھی کہ ارتضیٰ کے جانے کے بعد اس بڑے سے گھر میں اکیلے ہی رہ جاتی اس نے زرینہ بیگم کو اپنے پاس بلا لیا تھا، ٹھیک دو دن بعد وہ لوٹ آیا تھا، ماما کو گھر پر دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ حوریہ نے ماما کو گھر بلا لیا تھا، مطلب نہ

تو وہ اپنے گھر گئی نہ ہی ماما کے وہ سوچتا ہوا مسکراتا ہوا می کو سلام کرنے لگا، زرینہ بیگم نے ڈھیر ساری دعائیں دے کر اس کے ماتھے کو چوم لیا، وہ دشمن جاں اسے کہیں نظر نہ آئی، جس نے اسے اتنا بے قرار کر رکھا تھا اور ٹھیک طرح بات نہ کر کے بے قراری اور بڑھادی تھی۔

”جاؤ بیٹا! ہاتھ منہ دھو لو پھر کھانا کھا لینا۔“ انہوں نے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا آگے کی طرف بڑھ گیا، جہاں اسے وہ دشمن جاں نظر آ گئی، وہ ڈرینگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں کو برش کر رہی تھی اسے دیکھ کر ٹھگی پر نہ تو اس نے اس کی طرف دیکھا اور نہ کوئی کوشش کی، بے نیازی سے کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی، ارتضیٰ نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میں دو دن بعد گھر آیا ہوں اور تم ہو کہ نہ سلام نہ دعا، میں تمہارا شوہر ہوں۔“ وہ اسے اپنی طرف کر کے بولا حوریہ نے اس کے ہاتھ یکدم جھٹک دیئے۔

”کیوں آپ بلا وجہ یہ ڈھونگ رہا ہے ہیں، کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں آپ.....؟ مجھے آپ دھوکہ نہیں دے سکتے، آپ جتنے شریف دکتے ہیں اتنے ہیں نہیں، بزنس کا تو بہانہ ہے آپ اس شانزے جسے اپنی محبت کہتے ہیں اس کے ساتھ ہی گئے تھے، شادی تو کر لی ہوگی، اور اس کے ساتھ خوش بھی ہوں گے تو پھر مجھے کیوں بے وقوف بنا رہے ہیں.....؟ مجھے آپ کی کسی قسم کی خیرات نہیں چاہئے سمجھے آپ.....؟“ وہ غصے سے کہہ کر وہاں سے نکل گئی، ارتضیٰ حیرت در حیرت کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرا۔

”تو کیا حوریہ جل رہی تھی کہ میں شانزے کے ساتھ گیا تھا۔“ اس نے شادی کے پیرز پر سائن ضرور کروائے تھے پر وہ بھی حوریہ کا رے ایمیشن دیکھنے کے لئے جب تو کوئی رد عمل سامنے نہ آیا پر آج آ گیا تھا، ارتضیٰ حوریہ کی جلن پر اندر تک مسرور ہو گیا، یعنی واقعی حوریہ نے بھی اسے اتنا ہی یاد کیا جتنا اس نے اسے کیا تھا،

مطلب صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔
ارتضیٰ کے لئے یہ سوچ بے حد خوشگوار تھی، ڈھکے چھپے
لفظوں میں رویوں میں وہ اظہار کر گئی تھی پہل وہ کر چکی
تھی، اب باری ارتضیٰ کی تھی وہ مسکراتے ہوئے نیچے کی
طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆

رات کے کھانے کے بعد وہ ماما کو گھر چھوڑنے
چلا گیا، جبکہ حور یہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی، وہ
جب ماما کو چھوڑ کر گھر لوٹا تو کمرے میں گیا وہ اس کے
کمرے میں موجود نہ تھی، اپنے کمرے میں تھی وہ کچھ
سوچتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا،
کمرے میں داخل ہو کر لاک لگا لیا، وہ جو سونے والی تھی
اسے وہاں دیکھ کر اٹھ بیٹھی، ارتضیٰ بڑے دھڑلے سے
آگے بڑھا اور بیڈ پر براجمان ہو گیا وہ اسے اس طرح
دیکھ کر یکدم پیچھے ہٹی۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ.....؟ جائیں اپنے
کمرے میں، میں سونا چاہتی ہوں ویسے ہی اتنا تھک گئی
ہوں۔“ وہ غصہ کرتے ہوئے بولی۔

”کہو تو تمہاری تھکن اتار دوں۔“ وہ اسے وارفتگی
سے دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ اس کی بات سمجھ کر یکدم
غصہ سے اٹھ بیٹھی، پروہ بھی اسے بخشنے والا نہ تھا، آج تو
وہ اسے چھوڑنے والا نہ تھا، وہ اس کے گرد حصار بنا کر
کھڑا ہو گیا، وہ اس کی اس قدر قربت اور اس پر اس کی
برداشتی ہوئی شوخی، شرارت، معنی خیز باتوں سے گھبرا اٹھی،
پرفیوم کی مہک اس کے نتھنوں میں جا کر روح تک کو
سرشار کر رہی تھی۔

”نہیں میرے راستے سے۔“ وہ اسے دھکا دے کر
ہٹانے کی ناکام کوشش کرنے لگی، پروہ چٹان کی طرح ٹس
سے مس نہ ہوا۔

”کیوں کر رہے ہیں آپ یہ سب، کیوں مجھے تنگ
کر رہے ہیں.....؟“ وہ غصے سے بولی اور جا کر بیڈ پر
ڈھسے گئی۔

ارتضیٰ اب اسے اس طرح نہیں دیکھ سکتا تھا، اس
کے تمام دکھ درد سمیٹ کر اس پر اپنی چاہت کی انہما
کر دینا چاہتا تھا۔

”جب آپ نے دوسری شادی کر لی ہے اور اب
آپ خوش بھی ہیں تو میرے پاس کیوں آتے ہیں بار
بار۔“ وہ سر جھکائے جھکائے بولی ساتھ ہی دو تین آنسو
بھی دامن میں ٹوٹ کر گرے وہ آگے بڑھا اس کے
برابر بیٹھ گیا۔

”تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں نے شادی کر لی یا
حور یہ! میں نے تم سے سائن کیوں کروائے تھے، اس
لئے کہ تم مجھے منع کرو، روکو، پر تم نے ایسا نہیں کیا، پر آج
تمہاری جلن دیکھ کر میں سب سمجھ گیا ہوں، تم کیا کہتی
ہو کہ میں تم سے انجان تھا، نہیں انور ضرور کرتا تھا پر
انجان نہ تھا، تم کتنا ترپتی رہیں کتنا اپنے آپ کو دکھ دیتی
رہیں اندر ہی اندر تم سب برداشت کرتی رہیں میں سب
جانتا ہوں۔“ وہ اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ کا دباؤ
دے کر بولا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسوؤں کو اپنی
انگلیوں کی پوروں سے چھنے لگا۔

”تو اس کا مطلب ہے آپ نے شادی نہیں کی
ہے اور وہ شانزے.....؟“ وہ اپنی بات حیرانگی سے
ادھوری چھوڑ گئی۔

”شانزے سے میری ایسی کوئی بات نہیں ہے، ہم
کالج کے فرینڈ ہیں، پر کیا ہے کہ شانزے کو صرف اپنی
دوست کی حد تک ہی رکھا ہے، کیونکہ اس کے پیچھے بھی
ایک وجہ ہے اس دل میں ایک حسین مورتی کی صورت
ہے جو برسوں سے قبضہ کئے ہوئے ہے، کسی کا ہونے
نہیں دیا اس نے مجھے۔“ وہ معنی خیزی سے کہہ رہا تھا،
حور یہ نہ سمجھ آنے والی کیفیت سے دوچار تھی، بلا کی حیرانگی
تھی اس کی آنکھوں میں۔

”یار! کسی اور کی نہیں تمہاری بات کر رہا ہوں۔“
ارتضیٰ نے اس کی حیرانگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔
”جھوٹ بول رہے ہیں آپ ایسے کیسے ہو سکتا ہے

کہ آپ مجھ سے.....؟“ وہ بات ادھوری چھوڑ گئی دل اس
کی بات پر یقین نہ کر سکا۔

”حور یہ! ممی پاپا نے مجھ سے پوچھ کر ہی تمہارے
گھر میرے لئے پرپوزل دیا تھا میری ہی پسند اور
چاہت تھی کہ تم ہی سے میری شادی ہو، پر جب تمہیں
اس لڑکے کے ساتھ دیکھا اور پھر تمہارا مجھ سے شادی نہ
کرنے کا فیصلہ مجھے بہت ہرٹ کر گیا تھا، سارے
جذبات پر اوس پڑ گئی تھی، میں سوچ کر حیران تھا کہ تم ایسا
کیسے کر سکتی ہو۔“ وہ سچائی سے اسے آگاہ کر رہا تھا، جبکہ
حور یہ ندامت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنی جا رہی
تھی، نظریں ہی ملانے کے قابل نہ تھی وہ ارتضیٰ سے وہ
اس کی ندامت کو محسوس کر گیا تھا۔

”پر چھوڑو ان باتوں کو میرے لئے یہ ہی بہت
ہے کہ تم میری بیوی ہو، میری دسترس میں ہو، میں تمہیں
اچھی طرح جانتا ہوں، تم نے وہ سب ضد میں آ کر
کیا تھا، تھوڑی ضدی قسم کی ہونا تم ہیں ناں.....؟“ وہ
جھک کر اس سے استفسار کرنے لگا۔ حور یہ بے آواز
آنسو بہاتی رہی، سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ ارتضیٰ جیسے عظیم
انسان کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے، وہ تو کہیں سے بھی اس
کے قابل نہ تھی اپنی تمام بے وفانہ حرکتیں سوچ کر وہ
مزید پچھتاوے میں گھر گئی۔

”کچھ بولو حور یہ! اے تم کیوں ان آنسوؤں کے
سیلاب میں مجھے ڈبونا چاہتی ہو، تمہارا کیا ارادہ
ہے.....؟“ وہ اسے ٹھوکا دے کر بولا۔

”میں آپ کے قابل نہیں ہوں ارتضیٰ۔“ وہ
پچکیوں سے روئی ہوئی بولی۔

”حور یہ! کیا کہہ رہی ہو تم ہی تو میرے قابل ہو
جاناں.....؟“ ارتضیٰ نے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا،
حور یہ کے رونے میں مزید روانی آ گئی۔

”بس اب ایک آنسو بھی نہ دیکھوں تمہاری
آنکھوں میں۔“ انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی ارتضیٰ کے
کہنے پر واقعی اس کے رونے میں کمی آ گئی۔

”ارتضیٰ! میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں، آپ
کو پہچان نہ پائی اور الٹا آپ پر شک کر بیٹھی مجھے معاف
کر دیں۔“ وہ واقعی بے حد شرمندہ تھی۔

”ایک شرط پر معاف کروں گا، تم یہ بلا وجہ بار بار
آنسو نہ بہاؤ، سمجھیں پاگل تمہیں معافی مانگنے کی ضرورت
نہیں ہے۔“ اس نے ایک دم بات ہی ختم کر ڈالی، حور یہ
اسے صرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھ کر رہ گئی تب ہی
ارتضیٰ نے اس کا چہرہ اوپر کر کے کہا۔

”یہاں میری آنکھوں میں دیکھو تم نے تو پہلے
ہی اتنے دن ضائع کر دیئے ہیں، اب تم سے تمام
حساب برابر کرنے ہیں۔“ ارتضیٰ نے اس کے سر پر
اپنا سر مار کر کہا جس پر حور یہ روئی آنکھوں سمیت
مسکرا دی، اس کے دل سے ایک بوجھ سرک گیا، سکون
ہی سکون چاروں طرف پھیل گیا۔ حور یہ ارتضیٰ کے
سینے سے جا لگی اور طمانیت سے آنکھیں موند لیں،
ارتضیٰ بھی اسے اپنے ساتھ لگائے سرور سا تھا پراک
شرارت سو جھی اسے۔

”حور یہ! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ دوسری شادی کی
اجازت تو تم نے دے دی ہے کیوں نہ کر لوں.....؟“ وہ
جو آنکھیں موندے اس کی دھڑکنوں کو محسوس کر رہی تھی
جھٹکے سے سراٹھا کر بولی۔

”کیا.....؟“ ارتضیٰ کا قبضہ بڑا ہی جاندار تھا، وہ
اس کی شرارت سمجھ کر خفگی سے منہ پھیر گئی۔

”وہ کیا ہے کہ ایک پاگل لڑکی ہے جو اس دل میں
بڑے ہی ظالمانہ طریقے سے گھر آئی ہے، بہت ظلم کرتی
ہے مجھ پر تھوڑی سی پاگل ہے، پر مجھے جان سے زیادہ
عزیز ہے۔“ حور یہ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور
اپنے پیار کا اظہار کر دیا۔ جس پر ارتضیٰ حور یہ پر اپنی
محبتوں کے پھول کھلاتا چلا گیا۔

آج برسوں کی بنجر زمین سرسبز و شاداب ہو گئی دھند
کے بادل چھٹ گئے اور ہر سو شگفتگی بکھر گئی۔

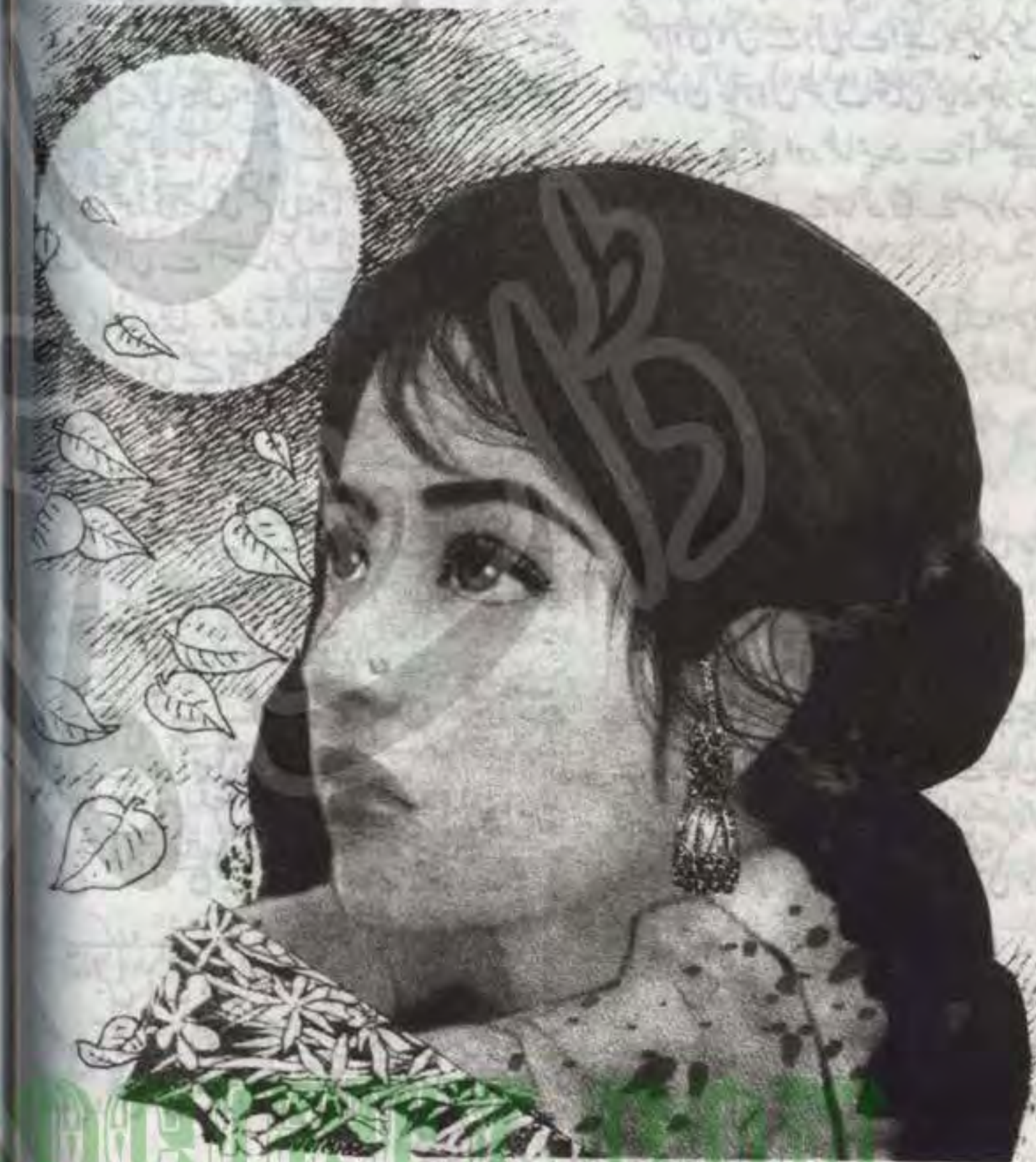
☆.....☆

ثوبیہ ملک

افسانہ



”غزوہ بیٹا! اپنی چال ڈھال بدلو بیٹا ہم شریف
لوگ ہیں ہمیں یہ رکھ رکھاؤ زیب نہیں دیتا یہ جو تم نہ
جانے کیا الم غلم پہنتی ہو مجھے بالکل پسند نہیں ہے لہذا
وہی اچھا ہوتا ہے جو مکمل طور پر ڈھانپ سکے کل کو مجھے



تمہاری شادی بھی کرنی ہے۔“ وہ غصے سے بولیں۔
”افوہ امی! ایک تو آپ کی ان دقیقہ نوسی باتوں سے
بہت تنگ ہوں اور میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ شادی میں
صرف طلحہ سے کروں گی اور اس کے علاوہ کسی اور کا
سوچنے کا بھی مت۔“ وہ اٹل لہجے میں بولی۔
”اس کے چال چلن دیکھے ہیں تم نے صرف
دولت ہے اس کے پاس اور تہذیب تو چھو کر بھی نہیں
گزری۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔
”امی پلیز! میں محبت کرتی ہوں اس سے اور وہ بھی
صرف مجھے چاہتا ہے۔“ اس کے لہجے میں ایک ضد تھی۔

”تو پھر اس کو بولو کہ رشتہ بھیجے تاکہ میں تمہارے
فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہو سکوں۔“ وہ دلبرداشتہ
لہجے میں بولیں۔
”اچھا ٹھیک ہے آج میں اس سے بات کرتی
ہوں۔“ وہ خوشی سے سرشار ہو کر بولی۔
وہ نک سب سے تیار ہو کر جیسے ہی آفس پہنچی تو نہ
جانے کتنے لوگوں کی نگاہوں نے اسے دیکھا لیکن وہ
سب سے بے نیاز طلحہ کے آفس چلی آئی۔
”ہائے! طلحہ کیسے ہو.....؟“
”کچھ دیر پہلے تو ٹھیک نہیں تھا پر اب ٹھیک ہوں



اور آج تو لگتا ہے مجھے مارنے کے لئے آئی ہو بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔" ظلم کے ایسے ہی الفاظ تو اسے کسی اور جہاں لے جاتے تھے۔

”اچھا بس بہت لگا لیا کھن آج آپ کو فائل کرنا
ہی ہوگا کہ کب اپنی امی کو میرے گھر بھیج رہے ہیں۔“
”میری جان! بہت جلد۔“

”اچھا ٹھیک ہے میٹا“۔ وہ نیم رضامندی سے بولیں۔

سے غرائی۔
 ”مطلب تو صاف ہے کہ اب میں تمہیں ایسے نہیں
 جانے دوں گا، صرف کچھ ٹھننے میرے ساتھ تم جو کہو گی
 میں دینے کے لئے تیار ہوں۔“

آفس پہنچی تو ایک خوبصورت سی لڑکی کو طلحہ سے باتیں کرتے ہوئے پایا وہ پوچھنا تو چاہتی تھی لیکن چپ ہو گئی۔ جیسے ہی وہ لڑکی طلحہ کے آفس سے باہر آئی وہ اس کے پاس چلی آئی۔

”طلحہ! یہ لڑکی کون ہے.....؟“

”اچھا وہ..... یار میری کزن ہے آج کل پاکستان آئی ہوئی ہے تو میرا آفس دیکھنے چلی آئی۔ وہ خوشی سے بتانے لگا۔

”تو آپ کیوں اتنا فرینک ہو رہے ہیں اس کے ساتھ۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”یار! چھوڑو اسے اور آج شام تم میرے ساتھ شاپنگ پر چلو پھر بتاؤں گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے اس وقت تو مجھے بہت سارا کام کرنا ہے پہلے وہ تو مکمل کر لوں پھر چلیں گے۔“

”لیکن سنو! یہ آج تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے اور اوپر سے اتنا بڑا دوپٹہ پوری داوی اماں لگ رہی ہو۔“ وہ اسے ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں دیکھ کر حیرت سے بولا۔

”نہیں طلحہ! اس دوپٹے کو پہن کر تو میں خود کو مکمل محسوس کر رہی ہوں ایسا لگ رہا ہے جیسے اس سے پہلے میں ویران صحرا میں کھڑی تھی۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”اچھا یار! بس کرو میرا موڈ خراب مت کر ڈ پھر شام کو ملتے ہیں۔“ وہ نہ سمجھتے ہوئے جھنجھلا کر بولا۔

☆.....

فائل مکمل کر کے وہ طلحہ کے آفس اسے دینے جانے لگی ابھی وہ دروازہ کھولنے ہی لگی تھی کہ اپنے نام کی بازگشت پر وہیں رک گئی۔

”یار طلحہ! تو تو کہہ رہا تھا کہ تیری گرل فرینڈ بڑی ماڈرن ہے پر یار وہ تو وہی مشرقی عورت کا روپ دھارے ہوئے تھی پر ہے بہت خوبصورت میری بھی بات کر کیا پتا مان جائے۔“ اس کی بات پر طلحہ ہنسا تھا وہ جو کوئی بھی تھا اس کی ذات کے پر خچے اڑا رہا تھا۔

”یار! کب تک بے چاری کو سبز باغ دکھائے گا۔“ بتا شادی کب کرے گا اس سے۔ اس کا دوست رازداری سے بولا۔

”پاگل سمجھا ہوا ہے کیا میرے لئے وہی رہ گئی ہے کیا نہ جانے کون سا گناہ چھپانے کے لئے یہ روپ دھار لیا ہے اب ایسی لڑکی جس کو نہ جانے کتنے مرد دیکھتے ہوں وہ میری بیوی بنے گی جو اپنے جسم کی نمائش کرتی ہو اور میری بانہوں میں بغیر کسی رشتے کے آتی ہو وہ لڑکی میری شریک سفر تو دور کی بات اسے اپنے گھر کی ملازمہ بھی میں نہ رکھوں۔“ وہ نفرت اور حقارت سے بولا۔

اور بھی وہ لوگ نہ جانے کیا کہہ رہے تھے لیکن وہ تو اپنی ذات کی کرچیوں کو کھرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

”کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا نہیں میں ہی قصور وار تھی جو خدا کو بھول گئی تھی جس نے واضح اپنی کتاب میں فرمایا کہ ”اپنے ستر کو ڈھانپ کر رکھو۔“ نہ جانے کتنی دیر وہ وہاں کھڑی رہی پھر ایک مضبوط فیصلہ کر کے وہاں سے چلی آئی۔

گھر آ کر وہ کتنی دیر روتی رہی اور اس کو طلحہ کے ساتھ گزرے وہ لمحے یاد آنے لگے جس میں وہ بغیر کسی رشتے کے اس کے ساتھ ڈانس پارٹی میں ہوتی لیکن آج اس پر آگہی کا در کھل گیا تھا اور وہ جان گئی تھی کہ عورت چار دیواری میں ہی محفوظ ہوتی ہے اور والدین ہمیشہ اولاد کا اچھا ہی سوچتے ہیں کیونکہ وہ باہر کی دنیا کو بہتر طریقے سے جانتے ہیں۔

”امی! آپ رشتے والی کو کہہ دیجئے گا کہ کل وہ لڑکے کے گھر والوں کو لے آئے۔“

”پر بیٹا تم تو طلحہ.....“

”نہیں امی! اب اور نہیں پلیز مجھ سے کوئی سوال نہ کیجئے گا۔“ وہ ماں تھیں سمجھ گئیں لیکن خوش تھیں کہ ان کی بیٹی لوٹ آئی تھی اور گہری دلدل میں پھنسنے سے بچ گئی تھی۔

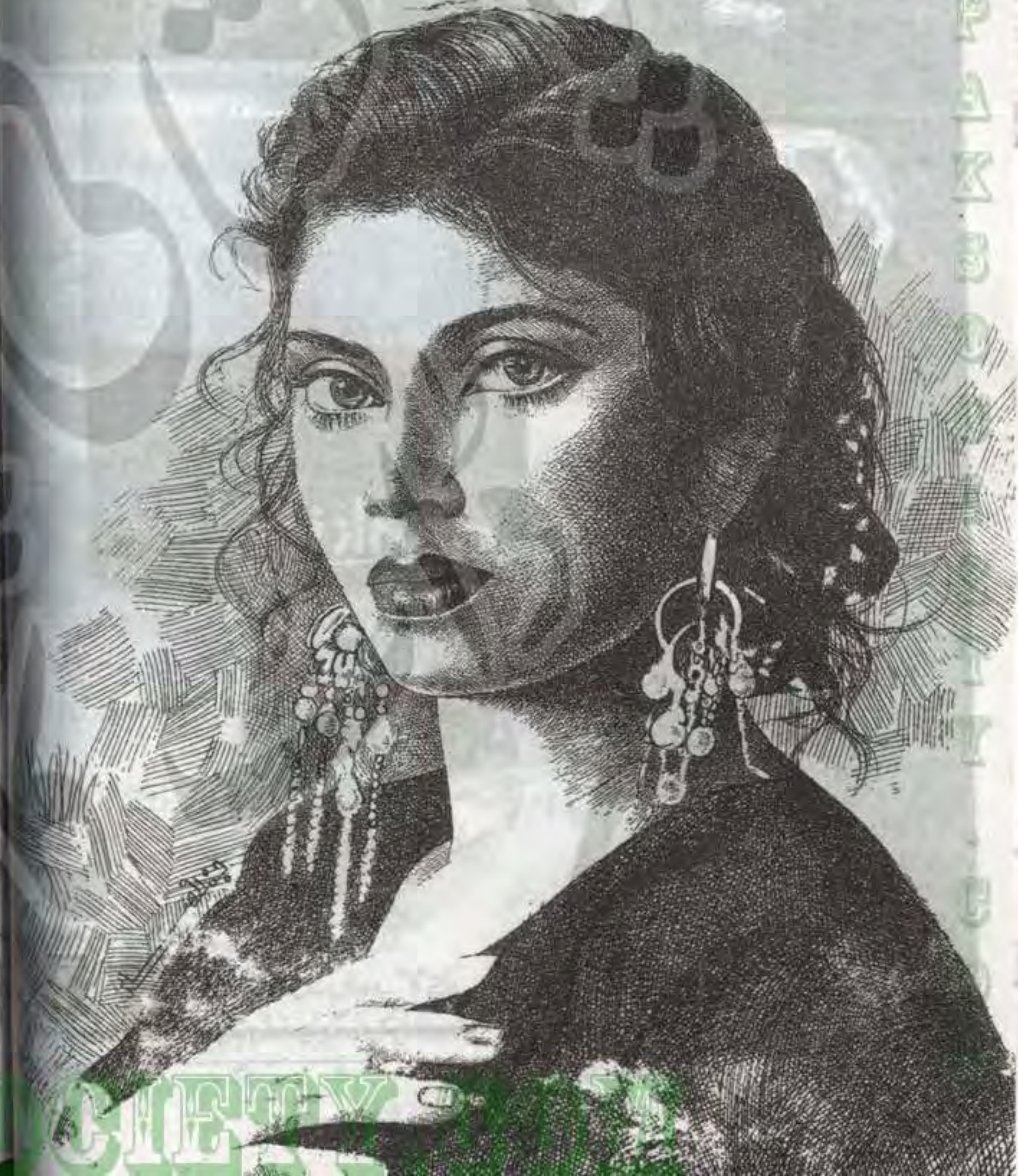
☆.....

شازیہ مصطفیٰ عمران

قسط نمبر 16۔

سلسلے وار ناول

کبھی عیشہ ہو تو پتہ چلے



”سب ہو جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ“۔ اس نے امی کے ہاتھ تھامے اور مسکرا کے مطمئن کیا وہ سمجھتا تھا، وہ ماں ہیں بچوں کی فکر تو انہیں رات دن تھی، جب سے ابو اس دنیا سے گئے تھے، دہری ذمہ داری ان پر آ گئی تھی، وہ تو بھلا ہو روحیل سکندر کا انہوں نے اسے اپنی کمپنی پر جاب میں لگا لیا تھا۔

”اریشماء کی منگنی وغیرہ ہو گئی ہے؟“ امی کو یکدم ہی یاد آیا اور موضوع بھی بدل دیا۔

”جی“۔ وہ خفیف سا ہو کر رہ گیا۔

”کیسے لوگوں میں ہوئی ہے؟“

”ان کے چاچو کے بیٹے ہیں، اس سے ہوئی ہے“۔ وہ نگاہ بھرا ہوا تھا، وہ جب جا رہا تھا، صرف اتنا بتا کر گیا تھا اریشماء کی منگنی کا فنکشن ہے۔

”کتنی پیاری بچی ہے، مجھے تو وہ شروع سے اچھی لگی ہے، مگر میں صرف اس لیے چپ رہی کہ ہم اس کے مقابلے کے نہیں تھے“۔ انہیں یہ دکھ و ملال تھا۔

”امی! ایسی باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جس کا ہمیں سب کچھ علم ہو تو، اور پھر وہ بہت خوش ہے اپنی منگنی سے“۔ حمدان نے نگاہیں پُرا کر کے انہیں یقین دلایا جبکہ حقیقت تو صرف وہی جانتا تھا کہ اریشماء کتنی اس منگنی سے خوش ہے، سب کچھ کل اسے واضح ہو گیا تھا، اور تیمور اور اس کی امی کی گفتگو بھی وہ سن چکا تھا، اس کی خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ روحیل سکندر پر حیرانگی بھی تھی، وہ اپنے بھائی کی فیملی سے واقف نہیں تھے جو جانتے بوجھتے ہوئے اپنی اکلوتی بیٹی کو وہاں جھونک رہے ہیں۔

”ہوں....“ امی بھی جیسے اس کا چہرہ پڑھ چکی تھیں، وہ بے زار ہو رہا تھا۔

”حمدان! خود سے آنکھیں پُرا کرنا اور خود کو جھٹکنا بہت مشکل ہوگا، وہ تمہارے سامنے آتی رہے گی، اور تمہاری سماعتوں میں تیمور کی اور اس کی امی کی گفتگو سنائی دیتی رہے گی، اگر تم بتاؤ گے نہیں تب بھی تمہیں ہی دکھ ہوگا، جانتے بوجھتے تم نے اسے غلط لوگوں میں جانے دیا، بعد میں تو تم اور بے گل اور بے چین ہو جاؤ گے، تیمور کا کردار تمہارے سامنے آ گیا ہے، اور تیمور اریشماء سے بالکل مخلص نہیں ہے، اور اس کی امی.... ان کے چہرے پر تو لالچ ہی نظر آ رہا تھا، روحیل سکندر کی محبت اور سادگی کو وہ لوگ لوٹنے چلے ہیں اور ان کی اکلوتی بیٹی شادی کے بعد تو اور دکھی ہو جائے گی، جب روحیل سکندر کا کیا ہوگا؟“

اس نے اپنا سر تھام لیا، وہ کسی بھی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا، اگر بتاتا تو اریشماء پھر اس کی آس لگائے گی اور تیمور سے الگ دشمنی ٹھن جائے گی، اور ویسے بھی وہ اریشماء کو جیسے جیتنا چاہتا ہو، صرف ضد ہے۔ روحیل سکندر کل کتنے خوش تھے، وہ یہ سب بتا کر ان کی خوشیاں چھین لے گا۔

”نہیں، میں کچھ نہیں بتاؤں گا“۔ یکدم ہی دل کی آواز کو دبا کر خود سے ہمکلام ہوا۔

”مجھے کیا، کسی سے بھی اس کی شادی ہو، میں کون ہوتا ہوں اس کا اچھا بڑا سوچنے والا؟“ وہ اپنے دل کی نفی کئے جا رہا تھا، اس نے اپنے ذہن و دل کو جھٹک تو دیا تھا، مگر اندر کی بے چینی اور بے گلی ابھی بھی تھی۔ اریشماء کو وہ چاہنے لگا تھا، اس کے لیے اپنے دل میں بہت خوبصورت جذبات رکھتا تھا، کل اس کا سوگوار حسن بھی نمایاں لگ رہا تھا، اس کے انداز میں ایک وقار تھا، مقابل اس سے متاثر ضرور ہوتا تھا، ہر ایک سے عجز و انکساری سے ملتی تھی، مگر کل وہ اس کی سمت تک نہیں آئی، پوری غفلت اور ناراضی دکھا رہی تھی، وہ بھی کیا کرتا، اپنی پوزیشن جانتا تھا، وہ اس کا ہاتھ تھامنے کا حق بھی نہیں رکھتا تھا، وہ چاہے اس سے ناراض رہے، کچھ بھی کرے، وہ اس پر توجہ تک نہیں دے گا۔

☆.....☆.....☆

شیپا کالج سے آ کر کھانے کے بعد سونے لیٹ گئی تھی، سمد کارٹون لگا کے بیٹھی تھی، وہ اپنے روم کی صفائی میں لگی تھی، جب سے شادی ہوئی تھی، مکمل طریقے کی صفائی آج کر رہی تھی، ورنہ روز کی معمول کی طرح صفائی کرتی تھی۔

”بیٹا! کب سے لگی ہو صفائی میں، ختم کرو اور اپنا خلیہ بھی ٹھیک کر دو“۔ حمیرا بیگم اندر چلی آئیں، وہ چیزوں پر سے ڈسٹنگ کر رہی تھی، سینک بھی کچھ چینج کر دی تھی، بیڈ تو سینٹر میں ہی تھا، ٹیبل اور چیئرز کو ہٹا کے کونے کی طرف سیٹ کر دیا تھا، اس طرح بیڈ اور وارڈروب کا راستہ کشادہ ہو گیا تھا، ڈیشان وہیں بیٹھ کر اپنی پڑھائی وغیرہ کرتا تھا۔

”ہو تو گئی ہے، یہ دھول صاف کر رہی تھی“۔ مسکرا کے بتایا۔

”جلدی سے سب سمیٹو، مجھے تمہارا یہ خلیہ دیکھ کر گھبراہٹ ہو رہی ہے، اور ہاں، کھانا بھی کھا لو جلدی سے، صبح سے ناشتے پر ہی چل رہی ہو“۔ انہوں نے پیار بھرے لہجے میں اسے ہدایت دی، وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھیں، حرما کا اسی لیے تو یہاں دل لگ گیا تھا، اگر ڈیشان کی امی اکھڑی ہوتیں تو اس کا گزارہ کیسے ہوتا؟

”اور ہاں تمہارے سر بھی مجھ سے کئی دفعہ پوچھ چکے ہیں“۔ جاتے جاتے وہ پلٹی تھیں۔

”ابو کو آج صبح ناشتہ دینے کے بعد پھر ان کے سامنے میں گئی نہیں ہوں، وہ جب ہی پوچھ رہے ہوں گے“۔ کپڑاواش روم میں ڈالا۔

”جس دن سے تم آئی ہو شہران اور ان کی لڑائیوں میں کی آگئی ہے، تمہارا لحاظ کرنے لگا ہے شہران تو“۔

”جی اسی لیے کچھ بولتا بھی نہیں ہے“۔ حرما کو بھی خوشی تھی ڈیشان کے بہن بھائی اس کی عزت بھی کرتے تھے اور لحاظ بھی، شہران کبھی کبھی روڈ ہو کر بولتا تھا مگر حرما ایسے بن جاتی جیسے وہ کوئی نوٹس ہی نہیں لے رہی ہو، شیپا کے ایڈیشن پر اس کی دوبارہ ہمت نہیں پڑتی تھی کچھ بولنے کی، اور حیرانگی کی بات یہ تھی کہ اس نے 5 ہزار واپس بھی نہیں لئے تھے جبکہ وہ دے بھی رہی تھی۔

ڈیشان کے آنے کا ٹائم بھی ہو گیا تھا، فوراً وارڈروب سے کپڑے نکالے، استری کرنے کا بھی ٹائم نہیں تھا، واش روم میں نہانے گھس گئی، آج تو روم کی ہر چیز چمکا دی تھی۔ ڈیشان آیا تو روم کا نقشہ بدلا دیکھ کر حیران رہ گیا، ہر چیز کو صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔

”واؤ!“ وہ دھڑ سے بیڈ پر لیٹا۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی، سمجھ گیا تھا حرما نے آج پورا دن روم کو صاف کرنے میں ہی لگا لیا تھا، وہ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ حرما لائٹ پر پل کاشن کے پرنڈ کپڑوں میں غسل کر کے نکلی، اسے دیکھ کر جھجک کے رہ گئی، بیڈ سے دوپٹہ اٹھایا، بالوں میں تولیہ لپیٹا ہوا تھا۔

”لگتا ہے آج دل لگا کے صفائی کی ہے“۔ ڈیشان کی پٹ سے آنکھیں کھل گئی تھیں۔ وہ تولیہ سے بالوں کو خشک کرنے لگی، ڈیشان اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”آپ نے اتنی کتابیں پھیلا کے رکھی ہوئی تھیں، میں نے سب نکال کے رکھی ہیں، دیکھیں رکھنے والی ہیں تو رکھیں ورنہ کسی کو دے دیں، کام آ جائیں گی اُس کے“۔ اس نے ٹیبل پر اشارہ کیا۔ ڈیشان کی نگاہ اس کے سر پر پڑی اور وہ جود میں الجھ رہی تھی، کچھ سرور سا بھی طاری ہو رہا تھا، مگر وہ خود کو مضبوط بنا کے بیٹھا ہوا تھا۔ روم میں ڈسٹنگ ٹیبل کے نام پر کچھ نہیں تھا، وارڈروب پر ممر لگا تھا، اس کے آگے کھڑی بالوں میں برش پھیر رہی تھی، حرما کی پشت اس کی طرف تھی۔

”ہوں.... دے دوں گا“۔ آنکھیں اس نے جیسے تھک کر بند کر لی تھیں، اگر زیادہ دیر تک حرما کو دیکھتا رہا تو وہ بہک نہ جائے اور وہ اپنے وعدے سے پھرنا بھی نہیں چاہتا تھا، پہلے حرما کی خواہش کا اسے احترام تھا۔

”ہوں.... گرنے سے کام نہیں چلے گا“۔ وہ ڈیشان کے اطمینان پر تیز لہجے میں گویا ہوئی، اور اس کے قریب آ کے بیٹھ

گئی، جب سے دونوں میں وہ شرائط طے ہوئی تھیں، حرام کو اس کے قریب بیٹھنے میں جھجک بھی نہیں ہوتی تھی، ورنہ پہلے درہ کر اسے مخاطب کرتی تھی۔

”پھر کیا کروں؟“ اس نے جیسے لاچاری ظاہر کی۔

”آپ نے میری بات کو اہمیت نہیں دی، مثال رہے ہیں۔“

”حرام! کیا ہو گیا ہے، میں نے نارمل لہجے میں کہا ہے، دے دوں گا، ابھی تو کالج سے آیا ہوں، تم کیا چاہتی ہو، ابھی اٹھ کر چلا جاؤں؟“ آج اس کے لہجے میں سختی اور جھنجھلاہٹ تھی۔ حرام جزبزی ہو کر بیڈ سے اٹھ گئی، اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا، وہ تھکا ہوا آیا تھا، آتے ہی پیچھے نہیں لگنا چاہیے تھا۔

”سوری!“ بس اتنا کہا اور روم سے چلی گئی۔

”لو شروع ہو گئی نئی کہانی، محترمہ ناراض ہو کر گئی ہیں۔“ وہ بھی اٹھا روم سے باہر آیا، وہ ابو کے روم میں تھی، پتا نہیں ان سے کیا باتیں کر رہی تھی۔

”امی! آج کیا بنا تھا؟“ وہ بچن میں چلا آیا، حمیرا بیگم محمد احمد کے لیے چائے بنا رہی تھیں۔

”آج حرام دن بھر کام میں لگی ہوئی تھی، اس نے سبزی بنا کے رکھ دی تھی صبح ہی۔“

”پھر سبزی؟“ پتلی کا ڈھکن کھول کے دیکھا لوکی تھی۔

”فرتج میں یہی تھی، اس نے بنا کے رکھ دی، ابھی اس نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے، تم دونوں ساتھ مل کر کھانا کھا لینا۔“ حمیرا بیگم نے سالن کی پتلی کے نیچے برز جلا دیا۔

”میری تو بھوک ہی اڑ گئی ہے۔“ وہ منہ بتانے لگا۔

”جو بھی بنا ہے صبر شکر کر کے کھالیں، لوکی حضور کو بہت پسند تھی، یہی سوچ کر کھالیا کریں۔“ حرام نے اس کی بات سن لی تھی۔

”لوکی کے ساتھ گوشت بھی ڈالا جاسکتا تھا۔“ وہ اس کا تپا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔ حمیرا بیگم چائے بنا کے دونوں کو ابھٹا ہوا چھوڑ کے بچن سے نکل گئیں، حرام فرتج سے آٹا نکال کے لائی۔

”فرتج میں آج گوشت نہیں تھا، گھر کا سارا سودا سلف ختم ہو گیا ہے۔“

”شہران سے بوتلیں، وہ لے کر آتا ہے۔“ وہ اسے روٹیاں بناتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”اس سے اگر کچھ منگواؤ، رات میں گھر میں گھستا ہے، ہم انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔“ وہ بتانے لگی۔

”کل میں اور امی خود لینے جائیں گے، آپ بتائیے، آپ کو تنخواہ کب تک ملے گی؟“ اس نے پوچھا۔

”ابھی تو ایک ہفتہ باقی ہے۔“ حرام نے سالن پلیٹ میں نکالا، گرم روٹی چنگیر میں رکھی اور اسے کھانے کا اشارہ کیا۔

”یار! میری بھوک اڑ گئی ہے۔“ وہ منہ بسور رہا تھا۔ حرام نے سالن کی پلیٹ اٹھائی، روٹی بھی ہٹائی، ذیشان حیرانگی سے دیکھنے لگا۔

”ٹھیک ہے، جائیے جہاں آپ کو اچھا ملے۔“ وہ رکھائی سے گویا ہوئی۔ برز بند کیا، آٹا صاف کیا، اپنا کھانا ٹرے میں لگایا۔

”مجھے یہاں کے علاوہ اچھا مل بھی نہیں سکتا۔“ حرام کی پشت سے حصار باندھ دیا، وہ تو بوکھلا گئی۔

”کیا کر رہے ہیں، یہ بچن ہے۔“ ہڑبڑا کے اسے دور کرنے لگی۔

”یہ بتاؤ ناراض ہو گئی ہو مجھ سے؟“

”کوئی بات پر؟“ وہ جیسے کچھ بھی نہیں۔

”میں نے روم میں تمہیں سختی سے جو کہا تھا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ ٹرے اٹھانے لگی۔

”چلیے لاؤں گے آجائے کھانا کھانے، دیکھئے میں نے کباب بھی تل لئے ہیں۔“ وہ دکھانے لگی، تاکہ ذیشان کا موڈ اچھا ہو جائے۔

”ارے لڑکی، کب تک ٹی وی دیکھو گی، پانچ بجنے والے ہیں، اٹھو ٹیوشن کی تیاری کرو۔“ حرام نے بسمہ کے چپٹ لگائی، جو کارٹون لگا کے بیٹھی ہوئی تھی، سیونٹھ میں تھی۔

”ابھی دس منٹ ہیں۔“

”چلو اٹھو، بند کرو، بیگ ریڈی کرو، ورنہ کتابوں کو روتی ہو، یہ نہیں مل رہی، وہ نہیں مل رہی۔“ حرام نے ٹی وی ہی آف کر دیا۔

”بھابی پلیز.....!“

”نہیں، اٹھو بسمہ! پانچ بجنے والے ہیں۔“ ذیشان نے بھی پیار سے سمجھایا۔

”ہاں، پتا ہے آپ دونوں مجھے خود جان کے یہاں سے ہٹا رہے ہیں، تاکہ آپ دونوں اکیلے رہ سکیں۔“ وہ غصہ میں پیر پختی ہوئی چلی گئی، وہ دونوں ہی مسکرانے لگے۔

”آج کل کے بچے بھی کتنے تیز ہو گئے ہیں۔“ ذیشان نے لقمہ منہ میں رکھا۔

”آپ کی یہ بہن تو کچھ زیادہ ہی تیز ہے۔“ دونوں آنے سے سامنے بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔

”ہمارے بچے تو پتا نہیں کتنے تیز ہوں گے۔“ ذیشان نے معنی خیزی سے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھا۔

”جی پتا نہیں۔“ وہ سرخ پڑ گئی۔

”بہت دن سے لیل ماہ نہیں آئی ہے۔“ حرام نے موضوع بدلا۔

”یونیورسٹی جاتا تھا، مل لیتا تھا، اب ملاقات ہی نہیں ہوتی ہے۔“

”پتا نہیں کیوں نہیں آ رہی ہے؟“ حرام کو فکر بھی ہو رہی تھی، کیونکہ اس دن تو وہ اتنی تیزی سے گئی تھی، زیادہ باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا، کچھ وہ شہران سے بھی گھبرا رہی تھی، یہ اس نے نوٹ کیا تھا۔

”لا سب سے کہو وہ لیل ماہ کو بول دے کے تم بلا رہی ہو۔“

”ہوں..... یہی سوچ رہی تھی، بسمہ سے کہلوادیتی ہوں، یہ کہہ دے گی۔“ کھانے سے فارغ ہوئی۔

”بسمہ بہت ناراض ہو کے گئی ہے۔“ ذیشان نے یاد دلایا۔

”ہوں..... مجھ سے زیادہ ناراض ہوتی ہے، اسے دیکھتی ہوں، کہیں چلی نہیں گئی ہو۔“ وہ ٹرے اٹھا کے کھڑی ہو گئی، ذیشان بھی چیخ کر روم میں چلا گیا، اس کا بھی موڈ فریش ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

گھر میں اس کے رشتے کی باتیں ہو رہی تھیں، بس اتنی اس کے کانوں میں پڑی تھی، لڑکے کا اپنا چائیز ہوٹل ہے، اور اس کے اوپر گھر، اور پانچ گاڑیاں ہیں، دو تین بنگلے ہیں، فیملی امریکہ میں سیٹل ہے، ابو چکے چکے امی سے باتیں کر رہے تھے، مگر امی کے چہرے پر وہ خوشی کے رنگ نہیں تھے، بھابی بھی بیٹھی ہوئی سن رہی تھیں، لیل ماہ کو یہ حیرانگی تھی کہ یہ اتنا امیر کبیر رشتہ اس کے لیے کیسے آ گیا؟ مگر وہ مطمئن بھی تھی کہ شہران سے تو جان چھوٹ جائے گی، اس اجد، جنگلی سے ہر حرکت

کی امید تھی، اور وہ اپنے باپ کی عزت اور شرافت پر داغ نہیں لگانا چاہتی تھی، اسے تو ابو سے پتا نہیں کیوں اتنا بے رحم تھا۔

”شام میں ٹھیک سے تیار ہو جانا، کچھ لوگ دیکھنے آرہے ہیں۔“ امی کے لہجے میں کوئی خوشی نہیں تھی، وہ چونک گئی تھی۔ ”امی! کون ہے لڑکا؟“ لیل ماہ کو گھبراہٹ بھی ہونے لگی۔ پتا نہیں کس کا رشتہ اس کے لئے آیا ہے، جو اتنی خاموشی سے سب ہو رہا تھا، بھابی سے کچھ پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی، کیونکہ وہ طنزیہی اتنے کرتی تھیں بندہ اپنا سامنے لے رہا جاتا تھا۔

”تمہارے ابو نے نامی گرامی آدمی کا رشتہ قبول کیا ہے، تمہیں وہ دیکھے گا۔“ امی کے لہجے میں ترشی اور طنز تھا۔

”امی! آخر بات کیا ہے؟ مجھے بتائیے تو۔“ وہ بھی فکر مند سی ہو گئی۔

”کوئی بات نہیں ہے، تم تیار ہو جانا، چھ بجے تک آئیں گے وہ لوگ۔“ وہ اس سے نگاہ تک پڑ رہی تھیں۔ لیل ماہ اور زیادہ ٹینشن ہو گئی، امی اُسے نال کے چلی گئی تھیں، وہ اتنی بے بس اور مغموم ہو گئی تھی، کوئی بھی تو اس کے پاس نہیں جس سے اپنی ٹینشن شیر کرتی، لایہ نے بھی کھلایا تھا کہ حرمانے اسے بلایا ہے، مگر وہ وہاں بھی نہیں گئی تھی، اس کی سب سے بڑی وجہ شہران تھا، اس کی اوجھی حرکتیں اس کا خون کھولا دیتی تھیں، اس لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس کا سامنا ہی نہیں کرے گی، یونیورسٹی بھی کم کم جاری تھی، اس انتظار میں تھی کہ ایگزیم ہوں اور اس کی بڑھائی ختم ہو، تاکہ شہران سے پیچھا چھوٹ جائے، جب آتے جاتے اس پر نظریں نہیں پڑیں گی، مگر پچھلے تین دن سے گھر میں اس کے رشتے کی بات ہو رہی تھیں، اور آج امی نے کہا وہ لوگ دیکھنے آرہے ہیں۔ امی کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا جیسے ابو نے رشتہ طے کر دیا، صرف دیکھنے کی فارمیسی رکھی گئی تھی۔ پورا دن پریشان رہی، شام میں پنک جا رجٹ کا پرنٹ سوٹ پہن لیا، لائٹ میک اپ بھی کیا، وہ لوگ وقت کے اتنے پابند تھے، چھ بجتے ہی آگئے تھے۔

”لیل ماہ! آ جاؤ ڈرائنگ روم میں۔“ بھابی اسے بلانے آئی تھیں، مگر ان کا چہرہ سنجیدہ تھا۔

”بھابی! کتنے لوگ ہیں؟“ جھکتے ہوئے پوچھا۔

”تین لڑکے ہیں، ایک وہ جس سے تمہارا رشتہ ہو رہا ہے، ایک بہن ہے، اور بھانجا ہے۔“ وہ اتنی ہی تفصیل بتا سکی۔

بھابی کے ساتھ جھکتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئی، آتے ہی نگاہ وائٹ میض شلوار میں بلیوس وائٹ ڈاڑھی میں بزرگ ہستی پر نگاہ پڑی، اس نے ہی اُلٹا سلام بھی کیا۔ لیل ماہ کی سمجھ کام نہیں کر رہی تھی، بھانجا تو اتنا چھوٹا ہے، پھر رشتہ کس ہو رہا ہے؟

”آؤ آؤ، ہمارے پاس بیٹھو۔“ بہن نے اپنے پاس صوفے پر جگہ بنا کر اسے بٹھایا۔ ابو بھی سامنے ہی بیٹھے تھے، لیل ماہ کو سب کے سامنے شرم بھی آرہی تھی۔ ان خاتون نے چند ہزار کے نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھے، دو سونے کے مونے کڑے پہنائے۔

”بھائی صاحب! اب آپ ہمیں نکاح کی تاریخ دے دیں، کیونکہ منیب کو امریکہ بھی جانا ہے، کیوں منیب! اگلا تو ٹھیک ہے؟“ انہوں نے دو باتیں ایک ساتھ ہی کر دیں۔ منیب صاحب نے پہلو بدل کر ہوں کہہ کر سر ہلایا۔ لیل ماہ جیسے پہاڑ آن گرا ہو، وحشت سے آنکھیں پھٹ گئیں، مگر نگاہ جھٹ جھکا بھی لی، ہاتھ پیروں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ہونٹوں پر چیونٹیاں رہنے لگی تھیں، وہ پیسے اور کڑے اسے آگ لگ رہے تھے، نوٹ اس کے ہاتھ سے گر گئے، جو امی نے بھابی سے بغور دیکھ لیا تھا، امی نے بھابی کو اشارہ کیا، وہ لیل ماہ کو اٹھا کے لے گئی تھیں۔ لیل ماہ سر تھام کے بیڈ پر اوندھی رہ گئی تھی، یہ کیا کر رہے تھے اس کے ابو؟ اپنی عمر کے شخص سے اس کا رشتہ طے کر دیا تھا۔

”ابو! آگے کسی کی چلی ہے؟“

”مگر بھابی! یہ شخص ابو کی عمر کا ہے۔“ وہ رونے لگی۔

”کیا کریں؟ میں نے بھی کہا، امی نے بھی کہا، ہمیں ڈانٹ دیا، اب کیا کر سکتے ہیں؟“ وہ تو ویسے بھی کب کسی کے لیے فکر مند ہوتی تھیں، انہیں کیا، مندی کسی سے بھی شادی ہو۔ لیل ماہ تو اپنے گھومتے سر کو تھام کے بیٹھ گئی، کڑے اُتار کے بچے کے نیچے رکھ دیئے۔

”یہ کرنے جا رہے تھے ابو، آپ کی طرح اس کے ساتھ بھی ایسا ظلم، نہ اُٹکتے بن رہی تھی نہ نکلتے، اگر انکار کرے گی تو گھر میں ہنگامہ ہوگا، اور وہ شہران.... اسے تو موقع مل جائے گا، پھر ابو کہیں آپ کی طرح اس کے ساتھ بھی وہی سب نہ کریں۔“ اسے خوف سے پسینے آنے لگے۔

”اگر اس شخص سے اس کی شادی ہو گئی تو ساری زندگی وہ اسے شوہر کا درجہ نہیں دے سکے گی، اپنے سے بڑی عمر کا شخص.... کیسے رہے گی؟“ رونا بھی نہیں چاہتی تھی اور رونا آ بھی رہا تھا، اپنی بے بسی، بے وقعتی پر، ابو کو ذرا بھی اپنی بیٹیوں کا احساس نہیں تھا، وہ شروع سے اپنی مرضی مسلط کرتے آرہے تھے۔

”امی!.... امی اندر آئیں تو ان سے لپٹ گئی۔“

”امی! میرا قصور کیا ہے، کیوں کر رہے ہیں ابو ایسا؟“ اس کے آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے، امی بھی تو رو رہی تھیں، وہ تو خود ابو کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں، ایک بیٹی کا غم تو دل سے لگائے ہوئے تھیں، دوسری بیٹی کا غم بھی ان پر آن پڑا تھا، کتنی بحث کی تھی اس رشتے پر، مگر ابو نے ان کی ذرا نہیں سنی تھی۔

”صبر کرو میری بیٹی! تمہارے باپ ہیں، کوئی بُرا تھوڑی کر رہے ہیں، اتنا اچھا رشتہ ہے، خوش رہو گی۔“ انہوں نے اپنے آنسو پونچھے۔

”امی! یہ آپ کہہ رہی ہیں؟“ وہ تو متوحش زدہ سی رہ گئی۔

”اور کیا بولوں؟ میری اگر چلتی تو میری بڑی بیٹی کے ساتھ وہ ظلم نہ ہوتا، جواب دوسری کے ساتھ بھی ہونے والا ہے، میں کیا بول سکتی ہوں؟ میں تو گوشتی، بہری ہوں، جس کی کوئی عزت وقعت ہی نہیں ہوتی ہے۔“ وہ بھی اتنی مضطرب اور مغموم تھیں۔

”امی! کچھ تو بولیں، یہ دو گنی عمر کا شخص.... اسے کیا مار پڑی تھی شادی کی؟ اور یہ ابو کو کرایا کہاں سے؟“ اس کی تو عقل دنگ تھی، اتنا امیر کبیر رشتہ ابو کو ملا کہاں سے؟ وہ حرما کی شادی سے اتنے بدظن ہو گئے تھے، وہ اسے بھی کہیں بھی ٹھکانے لگانا چاہتے تھے۔

”پتہ نہیں کہاں لکرایا، میں نے زیادہ پوچھا تو غصہ ہونے لگے۔“

”امی! میں مرجاؤں گی، نہیں کر سکتی میں اس شخص سے شادی۔“ وہ امی کے گلے لگ کر اتار روئی، امی بھی گھبرا گئیں، ان کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ صرف برداشت کر رہی تھیں، ارباز بھائی بھی ابو کے آگے زیادہ نہیں بول رہے تھے، کیونکہ ابو کا غضبناک غصہ وہ سب ہی بچپن سے دیکھتے آرہے تھے۔ پوری رات اس نے روتے دھوتے آنکھوں میں گزاری، کسی طرح بھی وہ حرما کو بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی، مگر شہران کا سوچ کر رڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ جاتی تھی۔

”شہران احمد! ایک تم نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے، کیسے میں جاؤں آپ سے ملنے؟“ کروٹیں بدل بدل کر ہڈیاں دکنے لگی تھیں، کبھی اٹھ کر بیٹھتی، تو کبھی لیٹ جاتی، اسی بے خبر سو رہی تھیں۔ جب سے منیب الرحمن کو دیکھا تھا، اس کی

حالت عجیب ہو گئی تھی، لمبی واڑھی، لمبے چوڑے توانا بڑے میاں تھے، دانت پیس کر اندر کے انتشار کو روکا۔

☆.....☆.....☆

فان کلر کی لمبی سی ایمبرائیڈری شرٹ پر سی گرین ٹراؤزر اور دوپٹہ سلیقے سے شانوں پر ڈالے وہ ہر ممکن لگ رہی تھی، ایک دفعہ بھی اس نے حمدان پر نگاہ نہیں ڈالی تھی، مگر حمدان استغنیامیہ نگاہوں سے اسے جانچ رہا تھا، وہ خود کو اس سے بے نیاز ظاہر کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی، مگر انداز میں اس کے ابھی بھی ایسا احساس تھا جو وہ حمدان کی جانب بھی متوجہ تھی، ریو الونگ چیئر پر بیٹھی تیزی سے لیپ ٹاپ پر اس کی انگلیاں حرکت کر رہی تھیں، جبکہ وہ سامنے والی چیئر پر لب بھینچے ہوئے بیٹھا تھا، گرے پیٹ پر بلیو شرٹ میں ڈیسٹ سا لگ رہا تھا۔

”حمدان احمد! آپ نے وزٹ کیا ایریا کا؟“ اریشما نے خود کو ہنوز مصروف ظاہر کر کے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نگاہ مرکوز رکھی۔

”سرنے کہا تھا پہلے پروجیکٹ کو ٹیلی کر لیں، پھر ہی میں وزٹ بھی کروں گا۔“ آہستگی سے گویا ہوا۔

”ہوں...“ اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور سائیڈ پر کھڑکادیا۔

”ایسا کرتے ہیں آج ہی ہم دیکھنے چلتے ہیں، کیونکہ وہاں سے کافی زور دیا جا رہا ہے کہ کام شروع کروادیا جائے، ہمارا لاسٹ پروجیکٹ کامیاب رہا ہے، اسلام آباد میں تو دھوم مچ گئی ہے۔“ اریشما کو خوشی ہو رہی تھی کیونکہ حمدان کی ساری محنت جو رنگ لائی تھی، ڈیڈی نے اس پر سب کچھ چھوڑا ہوا تھا۔ اریشما اس سے بڑے پروفیشنل انداز میں گفتگو کر رہی تھی، چہرے پر اس کے ذرا بھی ملال یا دکھ کا شائبہ تک نہیں تھا، اس دن منگنی والے دن کتنی تکیں اور ناراض ہو رہی تھی، تیمور سے الجھنا تک اس نے دیکھا تھا جب وہ انگوٹھی پہنا رہا تھا، اریشما کے تاثرات بالکل سرد تھے۔

”مسٹر حمدان! میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں۔“ اریشما اسے یوں خود کو تنکٹا پا کر ٹو کے بنانہ رہ سکی۔

”جی، جی۔“ جھینپ کے پہلو بدل کے رہ گیا، لب بھینچ کے اسے تاثرات نارمل کیے ورنہ اریشما جواب میں کچھ اور نہ سمجھ لے، مگر حمدان کا دل بھی بے چین اور پریشان تھا، اریشما کی زندگی کا فیصلہ بہت غلط بندے کے ساتھ ہو رہا تھا، تیمور پر اسے پہلے ہی شک تھا اور اس دن کے بعد سے تیمور اسے اور بُرا لگنے لگا تھا۔

”ابھی چلتے ہیں۔“ اریشما اپنا سیل اٹھانے لگی۔

”میڈم! کل چلیں گے، آج میں ساری رپورٹس تیار کر لیتا ہوں، تاکہ جب ہم وہاں وزٹ کریں گے تو ہمیں مسئلہ نہیں ہوگا۔“ اس نے بڑے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔

”ہوں... یہ بھی ٹھیک ہے۔“ وہ بھی سر ہلانے لگی۔

”رپورٹس ساری تیار کر دیجئے گا، میں پھر رات میں دیکھ لوں گی، جب اسی میلو چیک کروں گی تو۔“ وہ مسکرائی۔ حمدان کو اریشما کے اطمینان بھرے چہرے پر حیرانگی ہو رہی تھی، اتنی خوش کیوں ہے، جبکہ وہ چاہتا ہے اپنی منگنی سے ذرا خوش نہیں ہے، تیمور بھی اسے آفس میں ابھی تک نظر نہیں آیا تھا، وہ چیئر کھڑکے کھڑا ہو گیا، اریشما کی نگاہوں نے اس کا طواف کیا، وہ اتنا بڑا سوچ اور متفکر سا بھی لگ رہا تھا، مگر کس وجہ سے؟ یہ وہ بھی نہیں جانتی تھی۔

”حمدان! ایک منٹ۔“ اس نے پکار لیا۔ حمدان کے قدم رک گئے مگر وہ مڑا نہیں، ساتویں منظر تھیں وہ وہ اس سے کہتی ہے۔

”آپ کچھ پریشان ہیں؟ جب سے میں آئی ہوں آپ کو میں نے گہری سوچ میں ہی دیکھا ہے۔“ وہ تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی، اس سے محبت کرتی تھی، حمدان کی حرکات و سکنات پر سب نگاہ ہوتی تھی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر رُک گئیں، ڈور کھول کے روم سے جانے لگا۔

”بلیز بات تو سنئے!“ اریشما نے پھر پکارا۔

”مجھے رپورٹس ریڈی کرنی ہیں۔“ نروٹھے پن سے گویا ہوا۔ وہ جزبزی ہو گئی، حمدان نے سرد مہری کی حد کی ہوئی تھی، منگنی کے بعد سے اریشما آفس بھی آج ہی آئی تھی، وہ تین چار دن سے آفس بھی نہیں آرہی تھی۔

”حمدان احمد! پتا نہیں تمہیں میرے جذباتوں کی رسائی کب ہوگی، یہاں میں تمہاری محبت میں ڈوبتی جا رہی ہوں، اور مجھے تم سے دیوانگی کی حد تک عشق ہو گیا ہے، تم مجھ سے جتنا دور بھاگ رہے ہو میں تمہارے اتنا ہی قریب آرہی ہوں۔“ وہ روم میں ٹہلنے لگی، حمدان کو وہ ہر وقت سوچتی رہتی تھی۔

”مجھے خبر ہے تم ایک دن مجھے خود سے پکارو گے، یہ میں نے سوچ رکھی ہوئی ہے، محبت تو نفرت کو بھی کاٹ دیتی ہے اور دیکھنا میری محبت اتنی سچی اور پاک ہے حمدان! تمہیں جیت لے گی۔“ آنکھیں بند کر کے جذب سے سوچا۔ تیمور کو وہ بھول کے بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی، منگنی ہونے کے بعد بھی اس کا دل تیمور کی جانب مائل نہیں ہوا تھا، سچی جان کا چاپ لوسی والا انداز، اس کا تو خون کھولا دیتا تھا، ڈیڈی یہ رشتہ ہونے پر بہت خوش تھے۔ انٹرکام کی بیل پر اس کی سوچوں اور خیالوں کا سلسلہ ٹوٹا۔

”اوکے اوکے، آتی ہوں۔“ حمدان کو جواب دے کر اس نے ریسپورر کھا اور اس کے روم میں آ گئی۔

”اب کیا مسئلہ ہو گیا؟“ اریشما نے اسے کمپیوٹر کے آگے یوں پریشان دیکھا۔

”آپ اگر یہاں بیٹھ کر مجھے تھوڑا گائیڈ کر دیں گی، تو مجھے آسانی سے سب یاد رہے گا۔“ وہ مانیٹر پر نگاہ جمائے گویا ہوا۔ اریشما حیران رہ گئی، حمدان نے آج یوں پہلی دفعہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کی جگہ دی تھی، وہ بولے جا رہا تھا اور اریشما خواب کی سی کیفیت میں آ گئی تھی، حمدان اتنا پیارا لگ رہا تھا، دل کر رہا تھا اس کا ماتھا چوم لے۔

☆.....☆.....☆

صبح سے اس نے مشین لگائی ہوئی تھی، گھر کے کپڑے بہت جمع ہو گئے تھے، شیا تو پڑھائی میں مصروف ہو گئی تھی، حرما، اس سے تو ویسے بھی زیادہ کام نہیں کرواتی تھی، حمیرا بیگم کہتی بھی تھیں۔

”کب سے کپڑے دھو رہی ہو، ذیشان کے آنے کا ٹائم ہے، جاؤ تم نہاؤ اور کپڑے بدل لو۔“

”ای! یہ آخری چکر ہے، اس کے بعد میں نہاؤں گی۔“ بالٹی اٹھا کر اوپر زینہ چڑھنے لگی، اسی وقت شہران نے بالٹی اس کے ہاتھ سے لے لی، وہ حیران سی اسے دیکھنے لگی، کیونکہ آج سے پہلے کبھی اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔

”آپ سارے کپڑے بالٹی اور ٹب میں جمع کر دیں، میں اوپر لے جاؤں گا۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔ حرما تو بے نشینی سے اسے دیکھ رہی تھی، آج شہران انسانوں کی طرح باتیں جو کر رہا تھا، ورنہ تو اس کا منہ سیدھا ہوتا ہی نہیں تھا، بالٹی لے کے وہ زینہ چڑھ گیا تھا۔

”شکر ہے خیال تو آیا، ورنہ تو لڑنے مرنے پر تیار رہتا ہے۔“ حمیرا بیگم کو بھی شہران کی خوش کن تبدیلی اچھی لگی۔ حرما نے جھگڑا سر ہلایا اور باقی کے کپڑوں کا پانی نکالنے لگی، وہ سارے کپڑے اوپر لے گیا تھا، حرما نے بھی مشین وغیرہ دھونے کے بعد اوپر جا کر سارے کپڑے تار پر پھیلا دیئے تھے، اسی وقت اس نے نگاہ اٹھا کر اپنی چھت کی طرف دیکھا، وہاں سناٹا تھا، لیل ماہ کو دیکھنے اور ملنے کا کب سے دل چاہ رہا تھا، مگر وہ بھی پتا نہیں کیوں نہیں آرہی تھی، لائبرے سے کھلا بھی دیا تھا، اتنا تو اسے بھی پتا تھا لیل ماہ یونیورسٹی بھی نہیں جا رہی ہے، مگر کیوں نہیں جا رہی، یہ بات اسے ٹھیک نہیں لگ رہی تھی، ذہن بہت بو جھل ہو گیا تھا، تین بچے والے تھے، نہا کر وہ لگی تھی، بالوں کو تو لیے سے خشک کر رہی تھی، ذیشان اندر آیا وہ دیکھ کر

جھجک گئی، دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر ڈالا، ذیشان کی نگاہوں میں اس کے لیے ہمیشہ پیار چھلکتا تھا، حرما کو اس کا بھی خیال آتا تھا، اسے حق سے ابھی تک محروم کیا ہوا تھا، وہ اس کی محبت اور وارفتگی سب محسوس کرتی تھی، مگر وہ بھی مجبور تھی، اپنے ماں باپ تو اسے نہیں بھولے تھے۔

”کیا ہوا، طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ فکر مندی سے اس کے قریب بیٹھی۔ وہ سیدھا لیٹا ہوا تھا، آنکھیں اس نے بند کر لی تھیں، دونوں ہاتھوں کو ماتھے پر جوڑ کر رکھا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ اتنا ہی گویا ہوا۔

”پھر خاموش کیوں ہیں؟“ حرما کو اس کی خاموشی پر بھی فکر ہوتی تھی۔

”پورے تین پیر یڈ پیر دیا ہے، سر میں درد ہو رہا ہے، پلیز! میرے سر میں ہاتھ چلا دو اپنی انگلیوں سے۔“ حرما اس کی نئی فرمائش پر استغیاب انداز میں اس کے چہرے کو جانچنے لگی، اس نے ابھی تک ایسا کچھ نہیں کروایا تھا۔

”کیسے؟“ وہ جھکتی، شرماتی پوچھنے لگی۔

”ایسے۔“ حرما کا ہاتھ پکڑ کے سر میں چلانے لگا۔

”ایسے ہی کرتی رہو، مجھے کچھ سکون مل جائے گا۔“

”تیل کا مساج کروں؟“ اسے یکدم یاد آیا۔

”نہیں یار! مجھے تیل سے الجھن آتی ہے، تم ایسے ہی کرتی رہو، تھوڑی دیر میں اٹھ کر نہاؤں گا۔“ وہ تکیہ ڈیل کر کے لیٹا۔

”میں اپنے بال سیٹ کے آتی ہوں۔“ گیلے بال بار بار آگے آرہے تھے، وہ کچھ لگانے اٹھ گئی۔ ذیشان نے اسے بغور دیکھا، کاسنی کاٹن کے انیمیر ایچڑری والے سوٹ میں اس کی شہابی رنگت چمک رہی تھی، حرما کو دیکھ کر اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا کتنا مشکل ہوتا تھا۔ وہ جھکتی حیا کے حصار میں ڈوبی اس کے سرہانے بیٹھی، ذیشان نے آج پہلی دفعہ ایسا کوئی کام کہا تھا، ورنہ وہ تو اپنے کام تک نہیں کرواتا تھا۔

”لیل ماہ بہت دن سے نہیں آرہی ہے۔“

”مجھے بھی نظر نہیں آئی، ورنہ ضرور میں تو ساتھ لے آتا۔“ ذیشان کی آنکھوں میں سرور سا طاری ہونے لگا تھا، حرما کی موی انگلیوں نے اسے بے سندھ کر دیا تھا۔

”لائیہ سے کہلوایا؟“

”کئی دفعہ کہلوایا چکی ہوں پتا نہیں کیا بات ہے؟ لیل ماہ آ کیوں نہیں رہی ہے، میرا تو دل گھبرانے لگا ہے۔“ انگلیاں چلاتے چلاتے اس کے ہاتھ رک گئے۔

”گھبرانے کی کیا بات ہے، ہو سکتا ہے پڑھائی کی وجہ سے مصروف ہو۔“ ذیشان کو اس کے مغموم لہجے پر فکر ہوئی۔

”لائیہ بتا رہی تھی وہ یونیورسٹی بھی نہیں جا رہی ہے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ ہنس سوج انداز میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ حرما کو چھ ماہ یہاں ہو گئے تھے اور وہ ابھی تک گھر سے باہر نہیں گئی تھی، اپنا گھر دیکھے ہوئے بھی لگتا تھا مدت گزر گئی ہے۔

”تم تیار ہو جاؤ۔“

”کہاں جانا ہے؟“ وہ حیرانگی سے پوچھنے لگی۔

”آج تمہیں میں تمہاری امی کے پاس لے چلتا ہوں۔“

”جی۔۔۔۔۔؟“ وہ تو چونک گئی۔

”ہاں حرما! یہ ضروری ہے، کیونکہ تم جب تک خود پہل نہیں کرو گی، یہ دوریاں ایسی ہی رہیں گی، تم وہاں جا کر پتا تو کر سکتی ہو۔“

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں، یاد ہے ابو نے کیا کہا تھا؟“ وہ افسردگی سے گویا ہوئی۔

”سب یاد ہے، مگر اب تم وہ کرو گی جو میں کہوں گا، ورنہ یہ جنگ ایسے ہی چلتی رہے گی۔“ ذیشان مصمم ارادہ باندھ چکا تھا، کسی طرح بھی اسے یہ غلط فہمی دور کرنی تھی۔

”ابو آپ کو اور مجھے گھر میں داخل تک نہیں ہونے دیں گے۔“ اسے ڈر ستانے لگا۔

”تم چلو تو، یہ سب ہم وہاں جا کر دیکھیں گے۔“ اس نے حرما کی خوف سے بھری آنکھوں میں دیکھا، وہ اسے چھ ماہ میں اور زیادہ پیاری لگنے لگی تھی، اور وہ تکلیف میں رہے ایسا وہ نہیں چاہتا تھا، کچھ تو ایسا کرنا تھا کہ وہ اپنے والدین سے اور بہن بھائی سے مل جائے، ورنہ تو وہ گھٹ گھٹ کے مر جائے گی۔

☆.....☆.....☆

مصباح کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی، درمیان میں چھ مہینے تھے، امی نے تیاریاں شروع کر دی تھیں، تھوڑا تھوڑا وہ پہلے سے ہی تیار کر کے رکھتی جا رہی تھیں، کپڑے اور برتن کی خریداری کر رہی تھیں، حمدان کی خواہ میں انہوں نے کیٹیاں بھی ڈالی ہوئی تھیں، جو انہیں وقت پر مل گئی تھیں، حمدان نے بھی کچھ پیرس بینک میں جمع کیا ہوا تھا، اس لیے امی تسلی سے ہو گئی تھیں۔

”بیٹا! تم نے تو آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“ امی نے اسے گلے لگا کے پیار کیا، پنک جاڑ جٹ کے پرنسپلین لائن سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی، حمدان نے کن آنکھوں سے دیکھا۔

”میں تو سمجھی مگنی کروا کے ہمیں بھول گئی ہیں۔“ مصباح نے بھی معنی خیزی سے اسے جھٹرایا۔

”مگنی۔۔۔۔۔ اوہنہ۔۔۔۔۔ ایسے کسی ملک کے شہزادے سے نہیں ہوئی ہے کہ میں آپ سب کو بھول جاؤں۔“ وہ مگنی کے ذکر پر کڑوی ہو گئی۔ حمدان نے پہلو بدلا، ٹی وی کے جٹلو سرچ کئے جا رہا تھا، اور تاثر ایسے دے رہا تھا وہ اریہ شماء کی طرف متوجہ ہی نہیں ہے۔

”بھائی جان تو بتا رہے تھے، بڑی زبردست مگنی ہوئی ہے، آپ نے ہمیں نہیں بلایا۔“ وہ منہ بسور کے شکوہ کرنے لگی۔

”جب میں ہی خوش نہیں تھی، بلا کے کیا کرتی؟ حمدان تو بہتر جانتے ہیں۔“ اس نے حمدان کو ہی مخاطب کر لیا، وہ گڑبڑا کے اسے حیرانگی سے دیکھنے لگا، اریہ شماء کے تیور آج اسے خاصے بدلے بدلے نظر آرہے تھے۔

”آپ کی شادی کب تک ہوگی؟“

”یہ تو مجھے بھی نہیں پتا، ہاں البتہ تیور سے تو بالکل بھی نہیں ہوگی۔“ لہجے میں یقین اور وثوق بھرا تھا۔ حمدان اور مصباح دونوں ہی چونک کر حیرانگی سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگے، وہ مسکرا رہی تھی، نگاہوں میں حمدان کے لیے بہت کچھ تھا۔

”پھر یہ مگنی کیوں کی؟“ وہ بے ساختہ گویا ہوئی۔

”ڈیڈی کی خواہش تھی اس لیے کر لی، آگے میری جو خواہش ہے وہ ہوگی۔“ لہجے میں معنی خیزی تھی۔ حمدان پہلو بدل کے اٹھ گیا، کیونکہ اریہ شماء مسلسل اسے ہی دیکھے جا رہی تھی اور مصباح کے سامنے اسے یہ سب بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، اریہ شماء میں پہلے جیسی جھجک نہیں رہی تھی، بلکہ وہ حمدان کو ہر وقت زچ کرنے کے چکر میں ہی لگی رہتی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

100 اگست 2012ء

”جانے کیوں مجھے خود سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔“ حمدان اپنے روم میں آ گیا، دل کی دھڑکنیں اریشما، اریشما کی پکار کر رہی تھیں، مگر وہ پکار پر کان نہیں دھرتا چاہتا تھا، اگر ایک دفعہ بھی اس نے رخ دے کر اس سے بات کر لی تو وہ خوش فہمی کا شکار ہو سکتی ہے۔ وہ مصباح کے ساتھ کچن میں لگی رہی اور حمدان اپنے روم میں ہی رہا۔ آٹھ بجے عدین گھر میں آیا تو ایک بالچل سی ہی ہوئی، کیونکہ وہ اریشما کو دیکھ کر زیادہ چمکتا تھا، حمدان کو یہی سب ناگوار گزرتا تھا، مگر وہ عدین سے بھی کچھ نہیں کہتا تھا، کہ اریشما سے بات چیت نہیں کیا کرے۔

”بھائی جان! کھانا لگ گیا ہے آجائے۔“ مصباح اسے بلائے چلی آئی، وہ موبائل کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ موبائل بیڈ پر ڈالا اور باہر آ گیا، ڈرائنگ روم میں کارپٹ پر دسترخوان لگا کے کھانا لگایا ہوا تھا، اریشما پنک جارحٹ کے دوپٹہ میض اس پر پلین ٹراؤزر میں اپنی سادگی میں بھی انفرادیت رکھتی تھی، آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی، بے تکلفی سے پلیٹ میں سالن نکال رہی تھی، اس پر تو بھولے سے بھی نگاہ نہیں ڈال رہی تھی۔

”ارے مصباح! گیلری میں کپڑے پڑے ہیں، بارش شروع ہو گئی ہے۔“ امی نے اپنے روم سے باہر کا جائزہ لیا، پھر سردی میں ایک دفعہ بارش ضرور ہوتی تھی، اور سردی کی لہر میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

”اوہ نو..... بارش شروع ہو گئی؟“ اریشما پریشان ہو گئی۔

”ارے اریشما باجی! آرام سے، آپ کے پاس گاڑی ہے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔“ عدین نے اسے اطمینان دلایا۔ حمدان نے اس کے چہرے پر فکر و پریشانی دیکھ لی تھی، کھانے سے بھی ہاتھ روک لیا تھا۔

”بیٹا! آپ کھانا تو کھاؤ، بارش کوئی تیز نہیں ہو رہی ہے، رُک جائے گی۔“ امی نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

مصباح سارے دھلے ہوئے کپڑے اٹھا کے بیڈ پر ڈال آئی تھی، حمدان کو اریشما پر اس لمحے بہت پیار آ رہا تھا، وہ کن آنکھوں سے کئی دفعہ اسے دیکھ چکا تھا، جب سے تیمور سے مل گئی ہوئی تھی وہ بے کل سا بہت ہو گیا تھا، اس کی نگاہ اریشما کی نازک انگلیوں پر پڑ رہی تھی، وہ بڑے بے تکلف انداز میں کھانا کھا رہی تھی۔ عدین کی لقمے بازی بھی جاری تھی، وہ مسکرا کے جواب دے رہی تھی، کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو اریشما نے جانے کے لیے اپنا شولڈر بیگ اٹھالیا۔

”اریشما باجی! بارش تیز ہونے لگی ہے، رُک جائے تو چلی جائے گا۔“

”بالکل بھی نہیں رکوں گی، کیونکہ می بہت پریشان ہو جاتی ہیں اور پھر یہ بارش مجھے نہیں لگتا رکنے والی ہے۔“ اس نے رُکنے سے صاف انکار کر دیا۔ سردیوں کی بارش کا بھی کچھ پتا نہیں ہوتا، دوپہر سے موسم ابرا آلود ہو رہا تھا، آٹھ بجے بارش شروع ہوئی تھی۔

”میں ساتھ چلتا ہوں۔“ حمدان اپنا پرہمن کے چلا آیا۔ سب نے ہی متحیر زدہ ہو کر دیکھا، جو پہلے کی نسبت خوشگوار موڈ میں بھی لگ رہا تھا۔

”مجھے کہیں کام سے بھی جانا ہے، آپ کے ساتھ ہی نکل جاؤں گا، کیونکہ بارش میں بائیک پھسلنے کا ڈر رہتا ہے۔“ اس نے خود ہی توجہ پیش کی۔ حمدان نے آج سے پہلے کبھی اریشما سے لفٹ تک نہیں لی تھی، نہ کوئی احسان، اچانک ہی اس میں یہ خوش کن تبدیلی.... اسے حیرت و انبساط میں مبتلا کر رہی تھی، عدین کی معنی خیز نگاہوں سے بچتا وہ گیٹ کھولتا باہر نکل گیا۔

”یہ بارش میں سورج کہاں سے نکلا تھا؟“

”بارش میں سورج کب نکلتا ہے؟“ مصباح نے اس کی تصحیح کی۔

”یار! اپنے برادر کا موسم اتنا خوشگوار کیسے ہو گیا؟“ اس کی تو سماعت اور بصارت یقین نہیں کر رہی تھی۔

”اچھا زیادہ فضول مت بولو۔“ امی نے اسے ٹوکا۔ اریشما مسکرا کے اجازت لے کر چلی آئی، وہ گاڑی کے پاس ہی کھڑا تھا، بارش کی ٹیڑجی جاری تھی، گواتی تیز نہیں تھی مگر موسم میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی، وہ بلیو اپر کی پاکٹ میں دونوں ہاتھ ڈالے اس کا منتظر تھا۔

”گاڑی آپ ڈرائیو کریں گے یا میں ڈرائیو کروں؟“ ڈرائیونگ ڈور کھولتے ہوئے مخاطب ہوئی۔ حمدان نے جابی اس کے ہاتھ سے لے لی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، اتنے قریب آنے پر اریشما تو بوکھلا گئی، بھیننی بھیننی پر فیوم کی مہک ناک کے نتھنوں میں گھسی، تو سرور سا طاری ہو گیا، وہ چپ چاپ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی، حمدان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی ہمریٹ کیا، ایک نگاہ اس پر بھی ڈالی، وہ کچھ نروس سی ہو رہی تھی۔

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے حمدان کے لب آپ ہی آپ مسکرا بھی رہے تھے، آج دل نے اس پر قبضہ جمالیا تھا، وہ اپنے اندر کے احساس کو نہیں روک سکا تھا، اتنے دنوں سے محبت کو دبا کے بیٹھا ہوا تھا، آج چاروں خانے چت کر دیا تھا، جب محبت کو محسوس کیا تو سب کچھ کتنا اچھا لگ رہا تھا، سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں تھی، بارش کی وجہ سے ٹریفک کا رش بھی تھا، ہلکی ہلکی بارش سردی کی شدت میں اضافہ ہی کرنے لگی۔

”آپ کی شادی کب تک ہے؟“ حمدان کا غیر متوقع سوال، اس نے فہمائشی انداز میں ناگواری کا اظہار کیا۔

”کیا ہوا؟“ حمدان جھینپ گیا۔

”میں کچھ دیر پہلے آپ کے گھر میں بتا چکی ہوں، کب ہوگی، آپ بھی وہاں موجود تھے۔“ اریشما سر تاپا سٹلگ ہی گئی۔

”یہ تو پوچھ رہا ہوں، کب ہوگی، اور تیمور سے کیوں نہیں ہوگی؟“

”مستکی تیمور سے ہوئی ہے، شادی بھی اُسی سے ہوگی، یہ تو آپ بھی جانتی ہیں۔“ وہ اسے تنگ کر کے محظوظ ہو رہا تھا۔

”شٹ اپ، مجھے اتنا مجبور نہیں کریں کہ میں اپنے اوپر قابو نہیں پاسکوں، حمدان احمد میں نے تم سے پیار کیا ہے، تمہارے علاوہ میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی، اور اگر میرے قریب کوئی آئے گا تو وہ آپ ہوں گے۔“ گاڑی اس کے بنگلے کے باہر رُک گئی تھی، اسٹریٹ پر اندھیرا تھا، پھر بارش کی وجہ سے سناٹا تھا۔

”یہ بے وقوفی ہے۔“ اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔ پھر تو اریشما خود پر قابو نہیں رکھ سکی، حمدان کے گلے لگ کر اسے وارنٹی سے پیار کرنے لگی، حمدان تو بوکھلا ہٹ کا شکار ہو گیا، اس پر تو لگتا تھا، محبت و عشق کا جنون سوار ہو گیا تھا، حمدان کے چہرے کی ایک ایک چیز کو اس نے چوم لیا تھا، اور حمدان پر نشہ سوار ہو گیا، آج وہ اسے جھڑک کیوں نہیں سکا، اریشما کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر محبت کی بارش کر دی۔ گاڑی میں دونوں بالکل خاموش تھے، صرف سانوں کا شور تھا، دماغ نے سوچ لیا تھا، اریشما تیمور کی نہیں ہو سکتی، وہ اسے غلط ہاتھوں میں نہیں جانے دے گا، اریشما سے اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ گاڑی نے جھک مارا، وہ حواسوں میں لوٹ آئی، عجیب وحشت زدہ سی حمدان کو دیکھنے لگی۔

”آپ کا گھر آ گیا ہے۔“ وہ مخاطب ہوا۔ اریشما اپنے خیالوں میں سفر کر رہی تھی، چہرہ پسینے پسینے ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

لیل ماہ کی حیرت سے آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، وہ تو گیٹ بند کرنے آئی تھی، بارش کی ٹیڑجی سے گھر تک گندہ ہو گیا تھا، وہ دونوں اندر کھڑے تھے، جبکہ لیل ماہ کی اتنی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ ان دونوں کو اندر آنے کو کہتی، مگر اس لمحے ان دونوں کی آمد نے اسے جیسے ڈھارس دے دی، اب وہ تنہا نہیں تھی۔

”اندرو تو بلاؤ، ہماری یہاں قلفی جمانی ہے یا فالودہ بنانا ہے؟“ ذیشان نے شوشی سے کہہ کر اس کے آگے ہاتھ لیا۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

مقررہ ماہ نامہ ایم ریلڈ آرہا ہے

ایم ریلڈ میں پراسرارچی کہانیاں اور ایک ایسا سلسلہ جس میں ہر قاری

شامل ہو سکتا ہے یعنی ایک سچا، چھوٹا سا پراسرار واقعہ آپ بھی لکھیں

اور بہت کچھ

ڈینٹل نیوز، ہیلتھ نیوز، بیوٹی ٹیپس، نیو باورچی خانہ

روحانی آیات علاج

اور وہ کچھ جو اس سے پہلے آپ نے نہیں پڑھا

تمام ایجنٹس اپنی کاپی بک کروائیں پہلا آرڈر آنے پر 5 کاپی فری

صرف ایک بار پھر بار بار

ماہ نامہ ایم ریلڈ کی خط و کتابت کا پتہ

129D. Block II Pechs Karachi Phone: 02134535726

تو چادر سنبھالتی ہوئی اندر بھاگی تھی، سب ہی وہاں موجود تھے، ابو، ار باز بھائی، بھابی سب ہی اسے دیکھ کر چونک گئے۔
”امی.....!“ وہ امی سے لپٹ گئی جبکہ ذیشان نروس سا ان سب کے درمیان کھڑا تھا، ابو نے سپاٹ انداز میں دونوں کو دیکھا، مگر منہ سے الفاظ ادا نہیں کیے۔

”حرام! آپ سب کو بہت یاد کر رہی تھی، میں اسے خود لایا ہوں زبردستی، یہ آپ سب کے ڈر کی وجہ سے نہیں آ رہی تھی جبکہ ڈر کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے، یہ اس گھر کی بیٹی ہے۔“ ذیشان نے پُر اعتماد انداز میں آواز کو مضبوط بنا کے وضاحت دی۔ ابو اُٹھ کر اندر چلے گئے جبکہ ار باز بھائی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، شکر تھا، انہیں کچھ تو خیال آیا۔ لیل ماہ کے گلے لگی تو اور رونا آیا۔

”میری آپ سب کو ذرا بھی فکر نہیں؟“ حرمانے رو کے شکوہ کیا۔
”کیا کریں، تمہارے باپ کی ضد کے آگے ہم تو مجبور تھے، میرا کلیجہ تو پھٹا جا رہا تھا، کتنا عرصہ ہو گیا ہے اپنی بچی کو دیکھے ہوئے۔“ امی نے اسے دوبارہ لپٹا کے پیار کیا۔
”دیکھیں ار باز بھائی! جو کچھ بھی ہوا، اسے بھول جائیے وہ سب غلط فہمی میں ہوا ہے۔“ ذیشان نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہم تو ابو کے آگے مجبور ہیں۔“ ار باز بھائی کو حرمانے کا رونا پریشان کر رہا تھا، ان کی بہن کے ساتھ زیادتی ہی ہوئی تھی، مگر وہ جوان کی بیوی چڑھا رہی تھیں وہ اس پر ہی یقین بھی کر لیتے تھے۔ حرمانے کو لے کر لیل ماہ اندر چلی گئی تھی، اسے بھی تو وہ ظلم کی داستان سنانی تھی، دوسرا ظلم کیا ہونے والا تھا، حرمانے کو تو ہزار وار لٹ کا جھٹکا لگا تھا۔
”یہ ابو کو کیا ہو گیا ہے؟“ حرمانے تو سر پکڑ لیا۔

”آئی! میں مر جاؤں گی، مگر اس آدمی سے شادی نہیں کروں گی۔“ رورو کے اس کی آنکھیں ہر وقت سو جی ہوئی رہتی تھیں۔ امی کی بھی ابو کے آگے بالکل نہیں چل رہی تھی، وہ بھی اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھیں، ان کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ ہی براہور ہا تھا۔

”تم ویسے تو بہت بولڈ بنتی ہو، ابو سے بات تو کرتیں۔“
”آئی! تم کیا سمجھ رہی ہو، تمہارے جانے کے بعد مجھے آزادی مل گئی ہے، ارے! میں نے یونیورسٹی بھی جانا چھوڑ دیا ہے، ہر چیز سے بے زاری ہو گئی ہے، دل کرتا ہے اپنی زندگی ختم کر لوں۔“ لیل ماہ کے چہرے پر حزن و ملال اور اکتاہٹ و بیزاری سب نمایاں تھا، اسے جیسے جیسے کی ذرا بھی اُمنگ نہیں تھی۔

”پہلے تمہارے ساتھ ابو نے ظلم کیا، اور اب مجھے بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔“
”اچھا، اچھا، تم خود کو اتنا ہلکا نہیں کرو، میں ہی کچھ کرتی ہوں۔“ حرمانے گہری سوچ میں پڑ گئی، اس کا ذہن ادھر ادھر گردش کرنے لگا، اسے اپنی بہن کو بچانا تھا، ایسے تو اس کے ساتھ ظلم نہیں ہونے دے گی۔
”کیا کرو گی تم؟“ اس نے نا بھئی کی کیفیت میں سوالیہ نگاہ اٹھائی۔

”شہراں کیسا ہے؟“ حرمانے جھٹ پوچھا۔
”شہراں وہ آوارہ، لفتنگا، بدمعاش.....“ اس کا نام سنتے ہی وہ بھڑک اٹھی، حرمانے متوحش زدہ ہو کر اسے دیکھا۔
”لیل ماہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ اس کے لہجے میں دکھ بھی تھا۔
”آپ کو نہیں بتا مجھے آپ کے دیور نے الگ پریشان کیا ہوا ہے، مکینہ، بدمعاش، غنڈہ..... سمجھتا کیا ہے؟“ (جاری ہے)

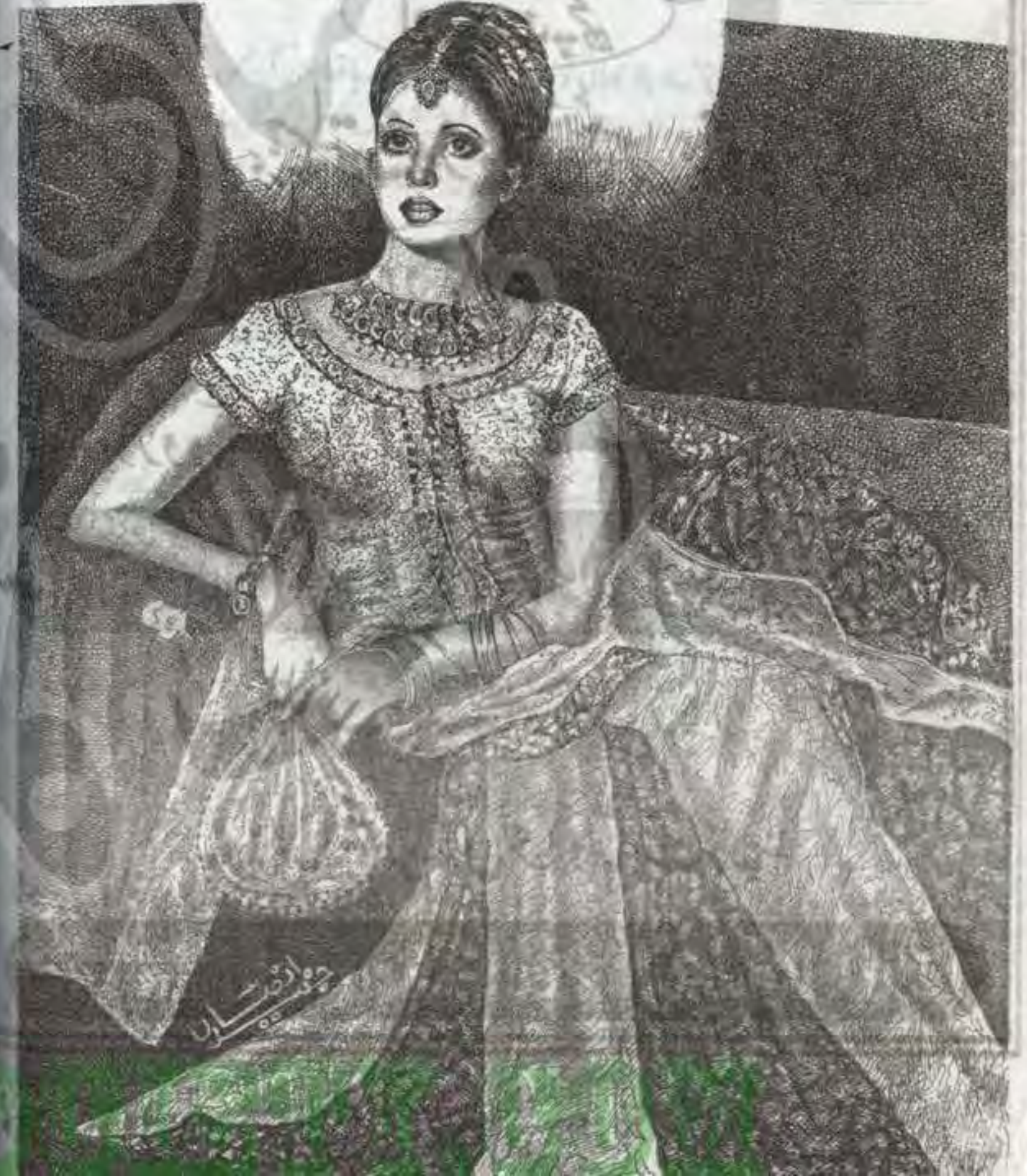
عابدہ سلیم

آخری قسط۔

مکمل ناول

قہار بن نہیں رہنا

”تمہاری سوچ بہت اچھی ہے سحاب! ایسے لوگ اب دنیا میں کم ہی ملتے ہیں، یہاں تو گھر، جائیداد کے پیچھے قتل ہو جاتے ہیں اور تم خود اپنا گھر دیے کو تیار ہو۔“



چند دیکھیں

”گھر تو وہی ہوتا ہے ناں! آئی! جو انسانوں سے آباد ہو، ویران مکان کو ہم گھر نہیں کہہ سکتے۔“
”تم نے اپنے گھر جانا ہے تو تیاری کر لو، شام میں مجھے ارجنٹ جانا ہے۔“ وہ اکھڑا اکھڑا سا جانے کب کمرے میں آیا ہوگا، اپنے مخصوص لمبے میں بولا تھا۔

”مجھے نہیں جانا۔“ اس نے صاف منع کر دیا۔ آئی کے ساتھ وہ بھی حیران رہ گیا، جس اتوار کو اسے جانا ہوتا تھا وہ صبح سے گھڑی دیکھتے دیکھتے ناٹم گزارتی تھی اور آج.....!

”کچھ دیر کے لیے ہو آؤ، دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“ آئی نے اس کے چہرے پر پھیلنے والے پانی کے قطرے صاف کیے، وہ خاموشی سے مان گئی اور آدھے گھنٹے بعد ہی وہ از میر حیدر کے ہمراہ پیچھو کے گھر روانہ تھی، حسب معمول پیچھو سے دیکھ کر بہت خوش ہو گئی تھیں۔

”پیچھو! آپ کہیں جا رہی نہیں؟“ انہیں چادر میں دیکھ کر اس نے پوچھا تھا۔

”ہاں بچے! راشن وغیرہ لینے جا رہی تھی، خیر! بعد میں لے آؤں گی۔“ انہوں نے پیار سے بھتیجی کا چہرہ چھوا، آئی



چند دیکھیں

”مگر تم نے افطاری میں کچھ تو کھایا ہوگا؟“

”آپ اچھی طرح جانتی ہیں ناں، جس دن کو فتنے بنے ہوں میں کوئی اور چیز نہیں کھاتا، میں نے صرف جوس لیا تھا، افطاری میں اور ویسے بھی آپ کی چیمٹی نے آج پکڑوں میں نمک بھی زہر سے زیادہ تیز کیا ہوا تھا، حلق سے اترے کب؟“

”ہو جاتا ہے کبھی کبھی، اس کے سر میں درد ہے، تم بھی احساس کر سکتے ہو اس تکلیف کا، کیونکہ تم سے تو سر درد برواشت بھی نہیں ہوتا ناں؟“ خالی پیٹ اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، جب سحاب نے کھانا تیار کیا وہ بھوک سے نڈھال ہو چکا تھا، مگر سالن انتائی سیٹی تھا کہ وہ ساری جھنجھلاہٹ بھول گیا اور مزے سے کھانا کھایا۔

☆.....☆.....☆

پندرہ روزے گزر چکے تھے، مگر مجال ہے جو گرمی میں ذرا بھی کمی واقع ہوئی ہو، سحاب حقیقتاً شام تک نڈھال ہو جاتی تھی، آنتی کو احساس تھا کہ گرمی کے روزے اور اوپر سے اتنا کام، مگر اس کی خندہ پیشانی تھی کہ کبھی بھی اکتاہٹ و بیزاری تک محسوس نہ ہونے دیتی، ان کے ساتھ ساتھ از میر کو بھی ہر کام، ہر چیز وقت پر چاہیے ہوتی تھی، رحیم بھائی تو بیمار تھے سو اس گھر کے نوے فیصد کاموں کی ذمہ داری اس پر آن پڑی تھی، لیکن اسے پھپھو بہت یاد آرہی تھیں، کل اس نے انہیں فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ بیمار ہیں، ظاہر ہے کہ پھر گھر میں کتنی تنگی ہو رہی ہوگی، پھپھو کی محنت پر تو گھر چلتا تھا، اور آج صبح جب از میر نے اسے سفید لفافہ تھمایا تو اسے بہت حیرت ہوئی، ابھی تو دس دن باقی تھے، اس نے از میر کو دیکھا تو الجھن چہرے سے ظاہر تھی۔

”ممانے عید کی تیاری کے لیے دیئے ہیں، تمہیں جو خریدنا ہو لے آنا۔“

”مگر مجھے خر....“

”جو کہنا ہو ممانے کہنا۔“ اس نے لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور تیز قدموں سے چلا گیا، اس کی عید کی تیاری سے زیادہ اہم پھپھو تھیں، اس کے پاس تو پھر بھی کچھ پیسے تھے کہ وہ ہر پے سے اپنی ضرورت کے لیے رقم نکال کر باقی پھپھو کو دے آتی تھی، وہ تیزی سے از میر کی طرف بھاگی تھی، کہیں وہ چلا نہ جائے، شکر تھا کہ وہ ابھی تک تھا، اسے یوں تیزی سے اپنی اور آتے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رُک گیا تھا۔

”وہ.... آپ مجھے پھپھو کی طرف چھوڑ دیں گے؟“

”ملازم ہوں تمہارا میں، کہ اپنا آفس چھوڑ کر تمہیں سیر کراتا پھروں؟“ اس سے زیادہ اچھے لہجے کی اُمید رکھنا بھی بے سود تھا، وہ مایوسی سے پلٹ گئی۔

”آ جاؤ، چھوڑ دوں گا۔“ شاید ابھی تک اس کا دل مکمل طور پر پتھر نہیں بناتا تھا، اب اگر وہ منع کرتی تو از میر نے اسے ذلیل کر دینا تھا، سو وہ اپنی عافیت اسی میں جان کر فوراً گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”صبح کون سی آفت آگئی تھی پھپھو سے ملنے کی؟“

”وہ بیمار ہیں۔“ مختصر سا جواب دے کر چپ ہو گئی، تمام سفر خاموشی سے کٹا تھا، مگر جب پھپھو کے گھر پہنچے تو وہ بولا۔

”صرف دس منٹ ہیں تمہارے پاس، کیونکہ مجھے دس بجے میٹنگ میں جانا ہے، تمہیں گھر چھوڑ کر۔“ وہ فرمانبرداری سے اندر آ گئی، پھپھو واقعی کافی نڈھال لگ رہی تھیں، مگر وہ تو جاب کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔

”آپ کی طبیعت خراب ہے، آج نہ جائیں چھٹی کر لیں۔“

”گھر کیسے چلے گا سحاب! مہینہ یوں ختم ہو جاتا ہے جیسے ہفتہ گزرا ہو، کرائے کے لیے مالک مکان دروازہ پینے لگتا

کی طبیعت پوچھی، از میر کو چائے ناشتہ وغیرہ پیش کیا، تقریباً گھنٹہ بیٹھی ہوگی وہ، پھر چلنے کو اٹھ گئی، کیونکہ آنتی کے لہجے کا ٹائم ہو رہا تھا، جاتے وقت اس نے پھپھو کے ہاتھ میں سفید لفافہ تھمایا تھا، جسے تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد انہوں نے لے لیا تھا، از میر حیران رہ گیا، پرسوں ہی اس نے سحاب کو پے دی تھی اور اس نے بالکل اسی طرح بند لفافہ لا کر اپنی پھپھو کو دے دیا تھا۔

”کیوں کرتی ہو تم ان کے لیے یہ سب، بہت قدر کرتے ہیں وہ تمہاری؟“ بات حیران کن تھی مگر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی اس کے منہ سے نکلے یہ الفاظ سحاب کو مسکرانے پر مجبور کر گئے۔

”وہ میرا نصیب ہے، مگر وہ ہیں تو میرے اپنے، ان کے لیے کچھ کرتی ہوں تو خوشی ہوتی ہے۔“ جواباً اس نے مخصوص انداز میں گھورا تھا اور گاڑی کی اسپینڈ بڑھادی۔ رمضان شریف کا چاند نظر آتے ہی گھر کا ماحول بدل گیا، گھر میں روزہ صرف از میر کا یا اس کا ہوتا تھا، آنتی کی میڈیسن ضروری تھیں اور رحیم بھائی شوگر کے مریض تھے، اکثر بیمار رہتے تھے، روزہ ہونے کے باوجود وہ اپنے تمام کام روٹین کے مطابق کرتی تھی، بلکہ اب شام میں کچن میں اضافی دو گھنٹے مسٹ تھے اس کے صبح میں رحیم بھائی از میر حیدر کی روز کی نئی فرمائشی لسٹ اسے تھما دیتے تھے۔

”اوہ گاڈ! کس قدر چٹورا ہے یہ شخص، اتنی چٹ پٹی چیزیں تو لڑکیاں بھی نہیں کھاتیں۔“ عصر کی نماز ادا کر کے وہ کچن میں جاتی تھی اور افطاری سے بیس منٹ پہلے وہ کچن سے نکلتی تھی، خود افطاری وہ کچن میں اکیلے کرتی تھی، اور آج شاید گرمی زیادہ تھی کہ اس کے سر میں شدید درد تھا، وہ سوائے کھجور اور پانی کے کچھ بھی نہ کھا سکی اور نماز پڑھتے ہی لیٹ گئی۔

”تم ٹھیک ہو سحاب؟“ خلاف معمول اسے بیڈ پر لیٹے دیکھ کر وہ فکر مند ہوئیں۔

”ہاں بس سر میں درد ہے۔“

”کوئی ٹیبلٹ وغیرہ لے لو بچے!“

”جی اچھا۔“ وہ کچھ دیر خاموشی سے لیٹی رہی مگر باہر سے جب از میر کے تیز لہجے میں بولنے کی آواز آئی تو اٹھ بیٹھی، اور سر پیٹ لیا، از میر نماز کے بعد کھانا کھاتا تھا، صبح ہی رحیم بھائی نے اسے کہا بھی تھا کہ بھیا نے کوفتے بنانے کا کہا ہے، مگر وہ بھول گئی، سر میں درد ہی اتنا تھا، وہ قنافت اٹھی اور کچن میں بھاگی۔

”آئی ایم سوری، میں ابھی تیار کر دیتی ہوں، مجھے یاد نہیں رہا۔“

”میڈم! آپ کو پے یہ کام کرنے کی ہی ملتی ہے، آرام کرنے کی نہیں۔“ اس کا غصہ عروج پر تھا، ایک تو سر درد اور پھر اس کی پھٹکار، سحاب کا دل بھر آیا۔

”ریٹلی سوری!“

”بھیا! سحاب بیٹی کی طبیعت اچھی نہیں تھی، اس لیے شاید وہ بنانہ سکیں۔“

”رحیم بھائی! میں آپ کو اس کی فیور کے لیے تنخواہ نہیں دیتا، آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔“ وہ انہیں بھی سنا تا مگر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا، ماما جانتی تھیں یہ اس کی شروع کی عادت تھی کہ کھانے میں دس منٹ بھی دیر ہو جائے وہ یوں ہی شروع ہو جاتا تھا۔

”از میر! اپنا لہجہ نرم کر لو، ٹھیک ہے تم انہیں رقم دیتے ہو ہماری خدمت کی، مگر مت بھولو کہ سحاب یہاں کلک کے لیے نہیں آئی تھی۔ اگر اس نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے تو تم یوں تو بی ہومت کرو۔“

”یو نو ماما! کہ مجھ سے بھوک نہیں سہی جاتی۔“

”کتنی بار کہا ہے آپ کو، دفعہ کریں اس مکان کو، آپ ابو کے گھر میں شفٹ ہو جائیں، یہ کرائے کے عذاب سے تو جان بچے گی آپ کی، مگر آپ نہیں مانتیں، پھپھو! پلیز مجھے اس گھر سے وابستگی ہے، میں اسے پر رونق اور آباد دیکھ کر زیادہ خوش رہوں گی۔“

”سحاب! تجھے پتہ ہے ناں کہ تیرے پھپھا پہلے ہی اس مکان پر نظریں لگائے بیٹھے ہیں۔“

”جتنا میرا حق ہے اس گھر پر اتنا ہی آپ کا ہے، پلیز پھپھو! کیوں ضد پر اڑی ہیں، مجھ سے آپ کی یہ تکلیف نہیں دیکھی جاتی، اتنی بیماری میں آپ کی نوکری کرنا مجبوری ہے، اچھا یہ لیں کچھ پیسے ہیں۔“ اس نے از میر کی دی رقم ان کے ہاتھ پر رکھی تو کچھ فاصلے پر بیٹھا از میر غصے سے دانت کچکا کر رہ گیا، وہ جب بھی اسے پیسے دیتا سارے لا کر وہ پھپھو کو تھما دیتی تھی، واپسی پر وہ اس کی کلاس لے رہا تھا۔

”میری ضرورت ہی کیا ہے، تین وقت روٹی وہ آپ کی مہربانی سے مجھے مل جاتی ہے، مگر پھپھو کو اس تین وقت کی روٹی کے لیے کتنی تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے وہ آپ نہیں سمجھ سکتے۔“

”وہ رقم تمہیں تمہاری محنت کے بدلے ملتی ہے اور تم۔۔۔“

”مجھے جس چیز سے اطمینان اور خوشی ملتی ہے میں وہی کرتی ہوں۔“

”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تم اسی مشن پر میری ماما کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا رہی ہو کہ دھیرے دھیرے اپنی پھپھو کی۔۔۔“

”میں اپنی محنت سے کمائی رقم انہیں دیتی ہوں، آپ سے مانگ کر نہیں دیتی۔“ پہلی بار از میر کے سامنے اس کا لہجہ قدرے سخت ہوا تھا، اس کے بعد از میر تلخ باتیں سناتا رہا مگر اس نے خاموشی نہیں توڑی تھی، رات میں عشاء کی نماز کے بعد وہ ماما کو سحاب کی باتیں بتا رہا تھا۔

”میں اسے عید کے لیے خود کپڑے وغیرہ دلوادوں گی۔“

”وہ جانتی تھی کہ آپ اس کی ضرورت پوری کر دیں گی بھی وہ تمام پیسے ہر ماہ جا کر اپنی پھپھو کے ہاتھ پر رکھ آتی ہے، اب پتہ چلا آپ کو کہ کیوں بھیجا ہے انہوں نے سحاب کو یہاں؟“

”وہ بہت خود دار بچی ہے، اتنے ماہ ہو گئے، آج تک کبھی اس نے اپنی اتنی سی ضرورت کا اظہار نہیں کیا مجھ سے، تم اسے پے دیتے ہو اس کی محنت کے بدلے، اگر وہ اپنی خوشی سے وہ رقم اپنی پھپھو کو دیتی ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟ اسے تمہاری دولت کا لالچ نہیں ہے از میر!“

”آپ اب تک اس کی پلاننگ نہیں سمجھ رہیں۔“

”سب سمجھتی ہوں میں، اگر وہ لالچی ہوتی یا محض ہماری دولت کی وجہ سے اس گھر میں ہوتی تو وہ کبھی اس گھر کو اپنا سمجھ کر تمام ذمہ داریاں نہ اٹھاتی، کیونکہ وہ اس گھر میں صرف میرے لیے آئی تھی، تمہارے لیے یا اس گھر کے باقی کاموں کے لیے نہیں۔“

”مجھے اپنے کسی کام کے لیے اس کی قطعی ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے، میں خود کر سکتا ہوں۔“

”ضرور۔۔۔ بھی تو اگر تمہاری اقطاری میں تمہاری فرمائشی لسٹ میں ایک چیز کی بھی کمی رہ جائے تو تم اس پر چلتا تے ہو۔“

”ہاں کیوں کہ کوئنگ وہ کرتی ہے۔“

”کیا تم اسے یہ کہہ کر اس گھر میں لائے تھے کہ کچن کا کام بھی اس کی ڈیوٹی میں شامل ہے؟“

”آپ مجھ سے کیوں اس کے لیے بحث کر رہی ہیں؟“

”کیونکہ وہ مجھے تمہاری طرح عزیز ہے۔“

”مما! میں آپ کا بیٹا ہوں، اور وہ آپ کی کچھ نہیں لگتی۔“

”وہ میری بہت کچھ لگتی ہے۔“ ماما کے لہجے میں خفگی اتر آئی۔

”یوں اب میں خود چاہتی ہوں کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔“

”واٹ؟ اور آپ۔۔۔ کتنا بہتر ہو گئی ہیں اس کے آنے سے، ماما! کوئی اور اس طرح آپ کی کیئر نہیں کر سکتا، جیسے وہ کرتی ہے۔“ وہ انجانے میں سہی مگر اعتراف کر گیا تھا اس کی نیک نیتی کا۔

”ہاں مگر مت بھولو کہ اس نے اپنی عمر بھر گنوانے کا ٹھیکہ نہیں لے لیا، اصل میں مجھے تم سے بات کرنی ہے، مسز وسیم آئیں تمہیں، انہیں سحاب اتنی پسند آئی کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے اس کا پر پوزل لے کر آئی تھیں۔“

”مما! یہ ہمارا ہیڈک نہیں ہے، اس کی شادی کرنا، ہم نے اسے صرف ایذا سے سروینٹ رکھا ہے، شادی کی فکر اس کی پھپھو کریں، جو ہر ماہ صرف پیسے لینے کے لیے اسے یاد کرتی ہیں۔“

”جن کا اپنا گھر اس لڑکی کی محنت پر چلتا ہو وہ کبھی اس کی شادی کا نہیں سوچیں گی، اگر پھپھو نے سوچ بھی لیا تو اس کا لالچی شوہر کبھی نہیں مانے گا۔“

”مما! یہ مسئلہ ہم کیوں ڈسکس کریں؟ میرے لیے اس بات کو ایشو بنانا غیر اہم ہے۔“

”مگر میرے لیے بہت اہم ہے اور میں چاہتی ہوں کہ سحاب کی شادی ہو جائے، میرے دل میں اس کے لیے وہی فیلنگز ہیں جو تمہارے لیے ہیں۔“

”بٹ ممما! میرے لیے ہر ایشو سے اہم آپ کی ذات ہے، جب تک آپ مکمل طرح ٹھیک نہیں ہوتیں وہ لڑکی یہاں سے کہیں نہیں جائے گی، آپ کے اچھے ہونے کے بعد میرے لیے اس کی ذات قطعی غیر اہم ہے۔“

”میرا بیٹا اس قدر سیلفش کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا، تم وہی از میر ہو، جو ایک راہ چلتے انسان کے دکھ کو بھی اپنا محسوس کرتا تھا، اور سحاب کے لیے تم اتنے سیلفش۔۔۔ اگر ہم اتنے عرصے کسی جانور کو بھی اپنے ساتھ رکھیں ناں تو ہمارے اندر اس کے لیے بھی ہمدردی و محبت جنم لے لیتی ہے اور تم۔۔۔ دن رات وہ تمہارے سامنے ہے، کیا اتنا عرصہ کافی نہیں ہے کسی کو جاننے کے لیے؟“

”مجھے اس کو جاننے میں قطعی دلچسپی نہیں ہے، وہ آپ کی ضرورت ہے، اس لیے میں اسے یہاں برداشت کرتا ہوں، اینڈ لیفٹ۔“ وہ سخت خراب موڈ لیے باہر نکلا تھا، باہر اسے سحاب مل گئی جو ماما کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آ رہی تھی۔

”مانسڈاٹ سحاب بی بی! میں تمہیں یہاں اپنی ماما کی کیئر کے لیے لایا تھا، تمہارا رشتہ کرانے نہیں، جس کام کے لیے یہاں ہو صرف اس پر توجہ دو، امیر لڑکے پھنسانے کا کام تم اپنے گھر لوٹ جانے کے بعد بھی کر سکتی ہو۔“ سحاب اس کی ہر بات برداشت کرتی تھی، اس کا مزاج سمجھ کر، اس کے دل پر لگی چوٹ کو جان کر، مگر وہ اس حد تک اس کی تذلیل کرے گا یہ نہیں سوچا تھا اس نے۔

”میں یہاں آپ کی سروینٹ ہوں مسز از میر حیدر! مجھے اس بات سے کبھی انکار نہیں رہا، مگر میرے کردار پر انگلی اٹھانے کا حق نہیں دیا میں نے آپ کو۔“

”جسٹ شٹ اپ! اچھی طرح سمجھتا ہوں میں تم جیسی لڑکیوں کو، اپنی قیمتی کارونا رو کر تم کس طرح دوسروں کو پھنساتی ہو، تم نے کوششیں کر ڈالیں، مجھ پر بس نہ چلا تو تم نے فیضی پر تیر چلا لئے، اپنا آلو سیدھا کرنے کے لیے؟“ اس نے حساب کی ذات کے پرچے ہی اڑا دیئے تھے۔ حساب سے مزید وہاں رکنا مشکل ہو گیا تھا، وہ آئی کے لیے اس کے ہر رویے کو برداشت کرتی رہی مگر کب تک؟ اسے نہ دولت کا لالچ تھا، نہ محبت کا، دولت انسان کی ضرورت ہو سکتی ہے اور بس وہ ضرورت کے لیے ہی پیسے کو اہم سمجھتی تھی، دولت کبھی بھی اس کے لیے سب کچھ نہیں رہی تھی، اس لیے تو اس کی ہر طنزیہ بات سہتی رہی، جب اس کے نزدیک یہ چیز اتنی اہم تھی ہی نہیں پھر برا کیا ماننا، مگر وہ ان روپوں پیسوں کے لیے اپنی ذات پر انگلی نہیں سہے سکتی تھی، آئی پر اس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا، ان کو دودھ پلا کر، میڈیسن دے کر معمول کے مطابق اس نے تمام کام کیے تھے، سحری بھی بنائی تھی، مگر سورج کے نکلنے ہی وہ خود بھی اس گھر سے نکل گئی تھی، اسے دکھا تھا کہ وہ آئی کو بتا کر بھی نہ آئی تھی۔ وہ سیدھا اپنے گھر آ گئی تھی، جو اس وقت اجازت کسی کنڈر کی صورت بکھرا پڑا تھا اس کی ذات کی طرح، روزہ ہونے کے باوجود اس نے صفائی کی ٹھانی اور دوپہر ہو گئی اسے گھر کو حج روپ میں لاتے لاتے، ظاہر ہے ان کا گھر دو کمروں پر مشتمل تین مرحلے کا چھوٹا سا گھر تھا، کبھی یہ گھر اسے محلوں سے زیادہ عزیز تھا، کیونکہ ابو نے جس محنت اور محبت سے بنایا تھا، اسے وہ عزیز تھی، گھر کھلا دیکھ کر اس کے پردوں کی خالہ وحیدہ بھی آگئیں۔

”حساب! تم واپس آگئیں؟“
 ”ہاں خالہ! کب تک کسی پر بوجھ بنتی؟ جب زندگی گزارنی ہی اکیلے ہے تو پھر آج سے ہی سہی۔“
 ”تمہارا روزہ ہے بچے؟“ اس کی تھکن اور گرمی سے ہوتے برے حال کے پیش نظر پوچھا تھا انہوں نے، اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”اچھا افطاری تم ہمارے ساتھ کرنا آج۔“
 ”جی اچھا! وہ ان کی محبت کو دیکھتے ہوئے مان گئی۔“

☆.....☆.....☆
 صبح جب وہ سو کر اٹھیں انہیں لگا حساب کچن میں ہوگی، مگر جب وہ بج گئے تو انہیں لگا شاید ان کے سوتے میں وہ پھپھو سے ملنے لگی ہو، اس کی پھپھو کی طبیعت جو خراب تھی، سارا دن گزر گیا تو ان کی فکر بھی بڑھ گئی اور از میر کو شک جب لگا، جب افطاری پر نیل پر اس کی فرمائش کوئی چیز نہ تھی، فروٹ چاٹ، پکڑے اور جوس کے علاوہ، وہ چیخ اٹھا۔
 ”رجیم بھائی! میں صبح آپ کو کیا کہہ گیا تھا؟“

”بھیا! مجھے جو بنانا آتا تھا میں نے بنادیا، حساب بیٹی صبح سے گھر نہیں ہے۔“
 ”کیا...؟“ وہ یکدم اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”حساب گھر نہیں ہے، تو کہاں ہے؟“
 ”پتہ نہیں۔“ از میر افطاری بھول کر ماما کے روم میں آیا تھا۔

”ماما! حساب کہاں ہے؟“
 ”یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔“
 ”مجھے کیا علم وہ کہاں ہے؟“
 ”مگر یہ ضرور پتہ ہے کہ وہ کیوں گئی ہے؟“ ماما کا لہجہ کھردرا اور الفاظ جیسے ہوئے تھے، وہ ہڑبڑا گیا۔

”مجھے نہیں پتہ کہ وہ کیوں گئی اور کہاں گئی؟“

”تم نے کل رات اسے کیا کہا تھا از میر! یقیناً ایسی کوئی بات کہی ہے تم نے جو وہ سہہ نہ سکی۔“
 ”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا اُسے کہ وہ یہ ڈرامہ کرے، اس قدر غیر ذمہ دار لڑکی، بناتا ہے کیسے جاسکتی ہے؟“
 ”تم جا کے روزہ افطار کرو۔“ ماما کو اس وقت اس کے ساتھ بحث کرنا مناسب نہ لگا، وہ بھی خاموشی سے چلا گیا، مگر عشاء کی نماز کے بعد وہ اور ماما پھر سے اس بحث کو لے کر بیٹھے تھے۔
 ”اندازہ ہوا آپ کو اس سے؟ وہ کتنی سیلفش تھی؟“

”اور تم... تمہیں اس بات پر غصہ ہے کہ وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر بناتا ہے چلی گئی، اس بات کی فکر نہیں ہے کہ وہ کہاں گئی ہے؟“
 ”آف کورس وہ اپنی پھپھو کے گھر ہوگی۔“

”نہیں گئی ہے وہ وہاں۔“ ان کے ٹھہرے لہجے میں عجیب سا سرد پن اتر آیا۔
 ”آپ نے...“

”میں نے فون کیا تھا، مگر انہیں یہ نہیں بتایا کہ حساب یہاں بھی نہیں ہے، مگر انہوں نے فون اٹھاتے ہی پہلا نام اس کا لیا کہ حساب تم ٹھیک ہو، مجھے بہانہ بنانا پڑا کہ میں نے تو آپ کی طبیعت پوچھنے کو کال کی ہے، حساب سو رہی ہے۔“
 ”پھر کہاں ہے وہ؟“ از میر کتنا بھی سخت دل سہی، غصے اور تنفر میں اس نے جانے اسے رات کیا کہا، مگر اسے فکر ہوئی تھی کہ وہ تنہا لڑکی تھی، بہت زیادہ بہادر بھی نہیں تھی۔

”تم نے میرا دل دکھایا ہے از میر! بہت گہرا صدمہ دیا ہے مجھے۔“ ماما کا لہجہ بھگ گیا اور وہ بُری طرح رو دیں، اسے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ ماما حساب سے اس قدر محبت کرنے لگی ہیں، اتنی انج ہو گئی ہیں اس سے کہ اس کے لیے یوں روئیں گی، وہ تو محض ضرورتاً اسے اس گھر میں برداشت کر رہا تھا، مگر اب لگا کہ وہ اس گھر کی ضرورت نہیں گھر کا حصہ بن چکی تھی۔

”آئی ایم سوری ماما! میں سمجھ ہی نہ سکا کہ آپ اسے اتنا چاہتی ہیں۔“ ماما کی وجہ سے ہی وہ اسے لایا تھا، اب خود ہی ان کے دکھ کا سبب بن گیا۔

”میں اسے ڈھونڈ کر لاؤں گا ماما! آپ کے پاس۔“
 ”میں جانتی ہوں وہ کہاں ہوگی، لیکن مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ وہ اب نہیں آئے گی، تمہاری باتوں نے اس کی خودداری اور انا کو ٹھیس پہنچائی تھی، اس کے پاکیزہ کردار کو الزام دیا ہے تم نے، وہ نہیں آئے گی، اور اچھا ہے نہ آئے، کتنے دعوے سے لائی تھی میں اسے کہ اس کا خیال رکھوں گی، حفاظت کروں گی، کیا فرق رہا اس کی نظر میں، ہمارے اور اس کی پھپھو کے گھر میں، وہاں اس کی پھپھو کا شوہر اس معصوم کا دل چھلنی کرتا تھا اور یہاں میرا پناہ تھا، اسے بات بے بات ضرب لگا تا رہا، از میر! تم نے کبھی سوچا کہ وہ کیوں تمہاری ہر گئی خاموشی سے سہہ لیتی ہے، کیوں کسی بھی بات کا بُرا نہیں مناتی تھی، ہر طعنہ، ہر طنز نظر انداز کرتی تھی، مجرم نہ ہوتے بے قصور ہوتے ہوئے وہ بھی تمہارے سامنے کھڑے ہو کر نہ پوچھ پائی کہ کیوں تم اسے اس قدر نفرت سے دیکھتے ہو، کیوں اسے بُرا سمجھتے ہو؟ میں بتاتی ہوں تمہیں کہ وہ کیوں چُپ تھی، اس لیے از میر! کہ وہ تمہارے اندر کی توڑ پھوڑ سے واقف تھی، تمہارے دکھ کو سمجھتی تھی اور اس کے دل میں تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کو لے کر بہت ہمدردی تھی، وہ تمہارے دکھ میں شامل تھی، احساس تھا اسے کہ تم کیوں اس طرح بی ہو کر تے ہو، ارے! اگر وہ چاہتی تو تمہارے سامنے کھڑے ہو کر پوچھ سکتی تھی تانیہ نے جو کیا، اس

کی سزا تم اسے کیوں دے رہے ہو، وہ تانیہ نہیں تھی از میر! مگر تم نے تانیہ کے کیے ہر فعل کا بدلہ اس معصوم سے لیا، ہر روز اپنے لفظوں کے سخت تیر چلا کر اسے زخمی کرتے رہے اور وہ سہتی رہی، مگر کب تک؟ وہ انسان تھی، بے زبان جانور نہیں، اور پھر بھی اس کی اعلیٰ ظرفی دیکھو کہ وہ بنا کسی شکایت کے کچھ کہے بنا چلی گئی، حالانکہ وہ چاہتی تو تمہارے بد صورت رویے کا جواب تمہارے منہ پر مار کر جاسکتی تھی، یہ اس کی اعلیٰ تربیت تھی از میر! جس نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا، خدا کے لیے اپنے دل، دماغ سے تانیہ کو نکال دو، بھول جاؤ اس منحوس عورت کو، جس نے ہم سے ہماری ہر خوشی چھین لی، ہمارے گھر کا سکون چھین لیا، ہر لڑکی میں تانیہ نظر آتی ہے تمہیں، مگر از میر! ابھی دنیا میں سحاب جیسی لڑکیاں بھی ہیں، اپنی آنکھوں سے نفرت کی یہ پٹی اتار کر دیکھو، پلیز از میر! تمہاری یہ نفرت تمہارا کہیں بہت بڑا نقصان نہ کر دے۔ وہ ماما کو ایک لفظ بھی جواب میں نہ کہہ سکا تھا، مگر سحاب کو اس نے ہر حال میں تلاش کرنا تھا، وہ کیسے اتنی خود سر ہو سکتی تھی کہ اسے بتائے بنا ہی چلی گئی؟ عید سے پہلے اسے گھر واپس لانے کی قسم کھائی اس نے کہ اپنی ماما کی خوشی سے بڑھ کر اسے کچھ عزیز نہ تھا، خود اپنی ذات بھی نہیں، وہ اس کی پھپھو کے گھر گیا، انہیں ساری حقیقت بتائی تو وہ روئے لگیں۔

”پلیز روئیں مت، مجھے بتائیں وہ کہاں جاسکتی ہے؟ اس کا کوئی ٹھکانہ، کوئی اور رشتہ دار؟“
”وہ کہاں جاسکتی ہے بیٹا! سوائے اپنے گھر کے، وہیں گئی ہوگی، میرے پاس آتی تو پھر وہی رکل رکل، اس لیے وہاں چلی گئی ہوگی۔“

”اپنے گھر، اس کا گھر کہاں ہے؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا تھا اور جیسے ہی اسے ایڈریس ملا وہ سیدھا سحاب کے گھر پہنچا تھا، بنانا کیے سیدھا اندر چلا گیا، وہ نماز پڑھ رہی تھی، از میر نے پہلی بار اس کی خوبصورتی اور معصومیت کا اعتراف دل میں کیا تھا، اس نے دعا ختم کر کے جائے نماز سے اٹھ کر سیدھی نظر از میر پر پھری تھی۔
”آپ..... یہاں؟“ اس کے لہجے میں غصہ نہیں تھا صرف سنجیدگی تھی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی ماما کو اکیلے چھوڑ کر آنے کی؟ بغیر بتائے تم گھر چھوڑ کر آ گئیں؟ مجھے بتایا تھا تم نے؟“
”مسٹر از میر حیدر! میں آپ کی جاگیر نہیں ہوں، محض ملازمت کرتی تھی آپ کے گھر، جس کے عوض تنخواہ لیتی تھی جب مجھے لگا کہ اب مزید میں وہاں نہیں رہ سکتی تو آ گئی۔“

”میں یہاں تمہاری تقریر سے متاثر ہونے نہیں آیا، تمہیں لینے آیا ہوں، ابھی اور اسی وقت تم میرے ساتھ چل رہی ہو بس۔“ کیا اجارہ داری تھی اس کی، جب جی چاہا ذلیل کر دیا اور جب جی چاہا... کتنا عجیب شخص تھا یہ۔
”میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔“

”تم سے پوچھ نہیں رہا ہوں میں، بتا رہا ہوں کہ گھر لاک کرو اور چلو۔“
”میں کہہ چکی ناں کہ مجھے کہیں نہیں جانا۔“ وہ بھی اڑ گئی، از میر کا پارہ ہائی ہو گیا، اس نے سختی سے اس کی نرم کلائی مضبوط ہاتھ میں تھامی اور زبردستی اسے باہر گاڑی تک لے آیا۔
”بیٹھو شرافت سے۔“

”یہ کیا زبردستی ہے، جب میں نہیں جانا۔۔۔۔۔۔“
”جسٹ شٹ اپ! تم جاؤ گی، میری ماما کی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا، وہ تمہارے بنا نہیں رہ سکتیں، اور ان کے لیے تو مجھے ساری دنیا کو آگ بھی لگانی پڑ جائے تو لگا دوں گا، تم کیا چیز ہو، معمولی سی لڑکی، اب مزید تماشا بنانے سے بہتر ہے خاموشی سے گاڑی میں بیٹھو، مجھے یہاں کے لوگوں کے فضول سوال نہیں سننے۔“ سحاب کا دل بھر آیا، اس شخص نے کتنا گرا دیا تھا، کیا سمجھا تھا اسے، محض اپنے گھر اور ماں کی ضرورت، اس کی اپنی کوئی حیثیت نہ تھی، وہ بے جان

نہیں تھی، جیتی جاگتی انسان تھی۔

”ارے سحاب بچے! تم کہیں جا رہی ہو؟“ وحیدہ خالہ اس کے لیے شاید کچھ لے کر آئی تھیں، اسے یوں گاڑی کے قریب کھڑا پا کر فکر مند سی ہو گئیں۔

”یہ کون ہے؟“ ان کا اشارہ اب از میر کی طرف تھا۔

”زہرہ آنٹی کے بیٹے ہیں، آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے خالہ! میں ان کو دیکھنے جا رہی ہوں، آپ پلیز گھر کو تالا لگا دیں، میں آپ سے چابی بعد میں لے لوں گی۔“ یہاں مزید کھڑے ہو کر واقعی تماشا بننا تھا، از میر حیدر نے کرنا تو وہی تھا جو اس نے سوچا تھا، سو وہ اپنی بے بسی پر روتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”آپ فائدہ اٹھا رہے ہیں میرے اکیلے ہونے کا، میرے سر پر کوئی سائبان نہیں ہے، بے آسرا ہوں ناں اس لیے۔“ وہ بڑی طرح رو رہی تھی، مگر از میر نے اس کی فضول سی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، وہ لب بھینچے تیزی سے گاڑی بھگتا رہا تھا، گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس کے لب پلے تھے۔

”ماما کے سامنے جانے سے پہلے یہ چہرہ دھو لینا اور انہیں قطعی یہ پتہ نہ چلے کہ میں تمہیں تمہاری مرضی کے بنالایا ہوں۔“

”میں آپ کے کسی بھی حکم کی پابند نہیں ہوں۔“ جانے اس شخص کے لیے جو خوف تھا دل میں کہاں سو گیا تھا۔

”ہونا پڑے گا تمہیں میرے حکم کا پابند، کیونکہ یہ میرا گھر ہے اور تم جانتی ہو یہاں صرف میری چلتی ہے۔“

”میں نہیں رہنا چاہتی آپ کے اس گھر میں۔“
”تم یہیں رہو گی اور میں دیکھتا ہوں تم کیسے اس گھر سے قدم بھی باہر نکالتی ہو، بس سحاب ریاض! ٹانگیں توڑ ڈالوں گا تمہاری۔“

”کس حیثیت سے حکم دے رہے ہیں، ہم میں ایسا کوئی رشتہ نہیں کہ میں آپ کی ہر بات مانوں، میں اپنی مرضی کی مالک ہوں، انڈرا شینڈ؟“ وہ اپنی ہمت پر خود حیران تھی۔

”تم صرف میری مرضی کی تابع ہو اور بس۔“ وہ انگلی اٹھا کر اسے وارن کرنے والے انداز میں بولا تھا پھر گاڑی سے اتر گیا۔

”بہتر ہوگا اندر جانے سے پہلے اپنا چہرہ اور لہجہ دونوں درست کر لو، تمہاری اتنی بکواس صرف ماما کے لیے برداشت کی ہے میں نے، آئندہ نہیں کروں گا۔“

”پھر عادت ڈال لیں از میر صاحب! اس بکواس کی، کیونکہ اب سحاب ریاض بھی پہلے کی طرح ہر بات نہیں ہے گی۔“ اسی کے انداز میں جواب دیتی وہ آگے بڑھی مگر اس کی بازو پر سخت گرفت نے روکنے پر مجبور کر دیا۔

”میرے ساتھ دوبارہ اتنی زبان چلائی ناں تو منہ توڑ دوں گا تمہارا، ایڈیٹ لڑکی۔“ وہ بڑی طرح غرایا تھا، مگر سحاب ڈری نہیں تھی، زبردستی بازو چھڑاتی اندر چلی گئی تھی، اور سیدھی آنٹی کے پاس جا کر رڑکی تھی، جو اسے دیکھ کر خوشی سے پھوٹے نہیں سہا رہی تھیں اور بیٹھنے کی کوشش کرنے لگیں، سحاب نے ان کی مدد کی اور پھر ان کے سینے میں سر چھپا کر رو دی۔

”بس بچے! روزے کی حالت میں نہیں روتے۔“

”آئی ایم سوری آنٹی! میں بہت بُری ہوں ناں، صرف اپنی ذات کے سکھ کے لیے آپ کو دکھ دیا، معاف کر دیں۔“

”تم کیا ہو سحاب! یہ میرے دل سے پوچھو میری جان! تم چلی گئیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ تمہارے بنا جینے کی تو مجھے عادت ہی نہیں رہی تھی، میں ادھوری ہوں تمہارے بغیر۔“ وہ کافی دیر ان کی گود میں سر چھپائے لیٹی رہی۔

”اگر اپنی غلطی کا اعتراف کر کے دل ہلکا ہو چکا ہو تو مِس سحاب! افطاری بنا دیں، صرف ڈیڑھ گھنٹہ ہے روزہ کھانے میں۔“ وہ بازو سینے پر لیٹے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں مخاطب تھا، سحاب نے اس سے نہ ڈرنے کا عہد کر لیا تھا، مگر وہ آنٹی کے سامنے اس شخص کو کچھ بھی کہہ کر آنٹی کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”ازمیر! ابھی تو وہ آئی ہے۔“

”مما! ڈیوٹی از ڈیوٹی، یہ اس کی جاب کا حصہ ہے، پلیز! اسے کرنے دیں، انھیں میڈم! رحیم بھائی یکن میں آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔“ وہ اسے سخت لہجے میں حکم دیتا پلٹ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بیس روزے گزر چکے تھے اور آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا، ساتھ مبارک طاق راتیں، جب سے اس نے رمضان المبارک کے روزے باقاعدگی سے رکھنا شروع کیے تھے، اسی عمر سے وہ طاق راتوں کی عبادت بھی نہیں چھوڑتی تھی۔ آج اکیسویں رات تھی اور اپنے تمام کام انجام دے کر وہ جائے نماز سنبھال کر باہر آ گئی تھی، کیونکہ اگر رات بھر لائٹ آن رہتی تو آنٹی ڈسٹرب ہوتیں، اسے لگا سکون سے عبادت کرنے کے لیے اسٹڈی روم بہترین ہے، سو وہ وہیں آ گئی اور اپنی عبادت میں لگ گئی تھی، ڈیڑھ بجے اسٹڈی کی لائٹ آن دیکھ کر وہ ٹھٹھکا تھا، شاید رحیم بھائی لائٹ آف کرنا بھول گئے ہوں، مگر جب وہ اندر آیا تو ٹھہر سا گیا، وہ جائے نماز بچھائے دونوں ہاتھ پھیلائے جانے اللہ سے کیا طلب کر رہی تھی، اس کے چہرے پر پچھلے آنسو اور ہلکی ہلکی سسکیاں وہ صاف سن اور دیکھ سکتا تھا، اس لمحے سحاب ریاض کے چہرے پر اسے ایک انجانی سی چمک نظر آئی تھی، ایک ایسی کشش کہ کئی لمحے وہ نظریں نہ ہٹا سکا اسے لگا کہ اس وقت سحاب کو ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں ہے، وہ خاموشی سے مڑ گیا، مگر سحری تک وہ اس لمحے کی گرفت سے نہ نکل سکا تھا۔ آنسوؤں سے تر وہ معصوم و پرکشش چہرہ، کیسا نور، کیسی چمک تھی اس لمحے اس چہرے پر کہ اس کا سحر اب تک نہیں ٹوٹا تھا۔

”رات ڈیڑھ بجے تم اسٹڈی میں کیا کر رہی تھیں؟“ سحری میں عموما وہ دونوں ہی اٹھتے تھے، تو اسے اس وقت سحاب سے ڈائریکٹ بات کرنی پڑتی تھی عموما وہ ہر آدھ گھنٹہ پر رحیم بھائی کے ذریعے اس تک پہنچا دیتا تھا۔

”اکیسویں رات تھی، اس لیے نوافل اور قرآن پاک کی تلاوت کرتی رہی۔“ اس کے لہجے میں اب وہ ڈرنے کا ہوتا تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا، اب وہ سبھی سبھی نہیں بلکہ پورے اعتماد سے اسے جواب دیتی تھی، اور اس کے جواب پر از میر حیدر کی نگاہیں پھر سے لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر بھٹکی تھیں، اس کی آنکھوں میں واقعی رات بھر جاگنے کی گواہی تھی، وہ خاموشی سے سحری کرنے لگا۔

”چائے لیں گے آپ؟“

”نہیں۔“ اس کا جواب سن کر وہ یکن میں چلی گئی اور خود بھی سحری کرنے لگی تھی۔

”سنو! تم سحری کے بعد جا کر سو جاؤ، باقی کام رحیم بھائی کر لیں گے، تم رات بھر سے جاگی ہوئی ہو۔“

”میں یہاں کام کے لیے ہی لائی گئی ہوں، یہ میری ڈیوٹی ہے جسے انجام دینا میرا فرض ہے، آپ کی ہمدردی کا شکریہ، مگر مجھے مفت کی روٹی منظور نہیں ہے۔“ اتنے نرم لہجے کے جواب میں اتنے سخت الفاظ اس کا استقبال کریں گے قطعی امید نہیں تھی اسے، اس کے اندر کا ضدی بچہ پھر سے جاگ گیا۔

”کہا تھا ناں تم سے کہ مجھ سے زبان نہ چلانا، ورنہ بہت برا ہوگا تمہارے حق میں۔“

”اس سے زیادہ اور برا کیا کر سکتے ہیں آپ جو آپ کر رہے ہیں؟“ اس نے چائے کا کپ پٹا تو از میر کے دماغ کی رگیں تن گئیں۔

”تم قطعی اس قابل نہیں ہو کہ تم سے جھوٹی ہمدردی کی جائے، سرور میری بلا ہے۔“ سحاب کو اس کے موڈ کی غصہ کی قطعی پرواہ نہیں رہی تھی، اس نے یکن کا کام سمیٹنا، نماز ادا کی، کچھ دیر تلاوت کی اور پھر لیٹ گئی، کچھ دیر بعد وہ قطعی غافل تھی، اسے احساس نہ ہوا کہ وہ کب تک سوئی، وہ اب بھی شاید سوتی رہتی، مگر اسے لگا کہ از میر حیدر کی آواز اس کے قریب ہی گونجی ہے، اس کی ساری نیند بھک سے اڑ گئی، اور آنکھیں کھولیں تو وہ واقعی روم میں موجود تھا، مگر قطعی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، بلکہ ممّا کو ایک سرساز کر دیا تھا، سحاب یکدم اٹھ بیٹھی اور سب سے پہلے سر ہانے دھرا دوپٹہ اٹھا کر کاندھوں پر اور سر پر پھیلا لیا تھا، پھر گھڑی دیکھی جو ڈیڑھ بج رہی تھی۔

”اوہ گاڈ! میں اتنا بے خبر سوئی، جانے آنٹی نے ناشتہ بھی کیا ہوگا کہ نہیں؟“

”اگر آپ کی نیند پوری ہو چکی ہو تو پلیز ممّا کے لیے لٹج بنا دیں۔“ وہی طنزیہ لہجہ تھا مگر اس کی نظریں اس پر نہیں تھیں، وہ کپڑے درست کرتی اٹھ گئی، عجیب سی جھجک و شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا اسے، وہ بے خبر سوئی رہی، نیند میں انسان کو قطعی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کس طرح سے سو رہا تھا اور وہ دوپٹے سے بے نیاز لیٹی سوئی رہی۔

”آئی ایم سوری آنٹی! میری آنکھ نہیں کھلی، آپ نے ناشتہ کیا؟ آپ مجھے جگا دیتیں۔“ وہ گھنے سلکی بالوں کو کچر میں جکڑ رہی تھی مگر اس طرح کہ دوپٹہ بھی سر سے نہ ہلے۔

”اِس اد کے جانو! آئی نو، تم رات بھر سوئی نہیں تھیں، اسی لیے جگانا مناسب نہیں لگا، رحیم بھائی نے مجھے ناشتہ بنا دیا تھا، ڈونٹ وری، اور سنو! ابھی لٹج کے لیے کچھ مت بنانا، مجھے قطعی بھوک نہیں ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، حکم بھرا لہجہ اس کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔

”ممّا کے لیے سوپ بنا لاؤ۔“

”جی!“ کہتی وہ اگلے پل ہی کمرے سے باہر تھی، از میر حیدر کے سامنے دوپٹے سے بے نیاز بے خبر سوتے رہنا، وہ سوچ کر ہی بہت شرمندگی محسوس کر رہی تھی، حالانکہ اتنے عرصے کے ساتھ میں از میر حیدر کے اعلیٰ کردار کی ضمانت وہ آنکھیں بند کر کے دے سکتی تھی، غصہ، نفرت، روکھا پن، اجنبیت اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت دیکھا تھا، مگر ان کے علاوہ کسی اور نظر سے کبھی سامنا نہیں ہوا تھا اس کا، وہ پھر اپنی سوچوں میں غلطیاں سوپ بنا رہی تھی یکن میں، جب وہ بھی آن پہنچا۔

”رحیم بھائی! آج افطاری میں صرف جوس لوں گا میں اور کچھ نہیں بنائے گا۔“

”جی بھیا!“

”رحیم بھائی! کھانے میں کیا بنانا ہے؟“ اکثر ہی وہ ان ڈائریکٹ بات کرتے تھے اور ذریعہ رحیم بھائی ہوتے تھے، بے چارے وہ خواہ مخواہ بس جاتے تھے۔

”کچھ نہیں بنانا، اپنے لیے جو بنانا ہو بنالینا، میں کھانے میں کچھ نہیں لوں گا۔“ اس قدر چنورہ انسان اگر منع کر رہا تھا ہر چیز سے، ضرور وجہ تو ہوگی، جانے انجانے وہ بھی اس کی فکر کرتی تھی، روز دہی بڑے، پکوڑے، سموے، آلو جھولے اور جانے کیا کیا بنوانے والا آج صرف جوس سے افطار کرے گا؟ امیزنگ.... سارا دن وہ حیران ہوتی رہی، اس کے منع کرنے کے باوجود بھی سحاب نے تھوڑے سے فردٹ اور جوس افطاری کے وقت نیمبل پر سجادیے تھے، مگر اس

نے واقعی صرف جوس پیا تھا، اور نماز پڑھنے چلا گیا، یہ بات فکر مندی کی تھی، وہ نماز ادا کر کے لوٹا تو اس نے خود ہی مخاطب کر لیا۔

”کچھ بناؤں آپ کے لیے کھانے میں؟“

”تمہارے کان خراب ہیں یا یادداشت؟“ اس کا لہجہ درشت تھا، وہ پچھتانے لگی اپنی ہمدردی پر، اس کے سامنے سے ہٹ گئی، یہ شخص اس کے ساتھ کتنا بھی برا سہی، مگر وہ دل سے کبھی اس سے نفرت نہیں کر پائی تھی، ایک ہمدردی تھی اسے از میر حیدر سے کہ اس کے ساتھ جو حادثہ ہوا بہت برا ہوا۔ آنٹی نے تو خود کو سمجھا لیا تھا مگر وہ اپنا اعتماد کھو بیٹھا تھا انسانوں پر سے، کبھی کبھی یہ ہمدردی بہت اپنے پن کا روپ دھار لیتی مگر اگلے ہی پل از میر کا لہجہ، اس کے لفظ پھر سے اس کے جذبات بدل دیتے، دونوں ہی سرد جنگ لیے ایک دوسرے کو برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ آج چھبیسواں روزہ تھا اور حسب معمول سحری کے بعد کچھ گھنٹے آرام کر کے وہ آفس جانے کو تیار تھا، حساب ماما کے لیے ناشتہ لے کر جاری تھی، جب از میر عین اس کے سامنے آن رکا۔

”ماما کو بتا کر دو منٹ میں آؤ، میں گاڑی میں تمہارا دیٹ کر رہا ہوں۔“

”مگر کیوں؟“

”ہر بات کے جواب میں سوال مت کیا کرو، جتنا کہا ہے اتنا کرو، جسٹ ٹو منٹس، اوکے؟“ وہ سر جھٹکتی آنٹی کو ناشتہ دے کر، انہیں بتا کر آگئی کہ وہ ابھی آرہی ہے، روزے میں جھوٹ بھی کیا بولتی اور سچ تو یہ تھا خود بھی وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کہاں جانا ہے؟ وہ بالکل خاموشی سے اس کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی تھی تو اس نے گاڑی اشارت کی۔

”کہاں جانا ہے اب مجھے؟“

”پلیز اسٹاپ اٹ، میرے سر میں شدید درد ہے، اس لیے اب دوبارہ مت بولنا۔“ وہ خاموشی سے ونڈوسے باہر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں دیکھنے لگی، اسے قطعی اندازہ نہیں تھا از میر اسے کہاں لایا ہے، جھٹکا اس وقت لگا جب اس نے کورٹ میں خود کو پایا۔

”نیچے اُترؤ۔“ سرد لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔

”مگر ہم یہاں؟“

”خاموشی سے اُترؤ۔“ ترش انداز پر وہ جھنجھلاتی دروازہ کھینچ کر باہر آ کر کھڑی ہوگئی، وہ گاڑی لاک کر کے اس کا ہاتھ تھامے اسے اپنے ساتھ لایا تھا اور یہاں آ کر جو حقیقت اسے معلوم ہوئی وہ حساب کی دنیا ہلانے کو کافی تھی، وہ شاکڈ تھی بالکل ساکت، اس حد تک کی امید نہیں تھی اسے از میر حیدر سے۔

”حساب! سائن کرو پلیز!“ وہ شاید لوگوں کے خوف سے نرم لہجہ اپنائے ہوئے تھا۔

”بیٹی! سائن کرو۔“ اس آواز پر وہ چونکی، اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا رہا تھا، یہ کیسے کر سکتی تھی وہ اس کی اجازت کے بنا، اس کی مرضی کے قطعی خلاف وہ اتنا بڑا قدم اٹھالے گا، زبردستی کرے گا، لاچار اسے سائن کرنے پڑے، مگر واپسی پر وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی آپ اتنا گر جائیں گے، میری مجبوری کا فائدہ اٹھائیں گے۔“

”اب تو تم خود سوچ سکتی ہو کہ تم میری مرضی کی تابع ہو، اور میری اجازت کے بغیر تم میرے گھر سے ایک قدم بھی نہیں نکال سکتیں۔“

”صرف اس لیے کہ میں اپنے گھر چلی گئی تھی آپ نے مجھے اتنی بڑی سزا دی؟“

”یہ سزا تمہیں تمہاری زبان درازی کی وجہ سے ملی ہے، مسز حساب حیدر! اب تو تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ میرا کوئی حق نہیں ہے تم پر حکم چلانے کا۔“ اس کے چہرے پر طنز یہ اور فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

”میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ آپ کے اندر اتنا گرا ہوا انسان بست ہے، ایک کمزور لڑکی کی بے بسی سے فائدہ اٹھایا ہے آپ نے، اللہ بھی کبھی آپ کو معاف نہیں کرے گا۔“

”میرا سرت کھاؤ، خاموشی سے بیٹھو۔“ وہ اسے ڈانٹتا ہوا بولا اور گھر کے گیٹ تک ڈراپ کر کے خود آفس چلا گیا تھا، وہ خود نہیں جانتا تھا اس نے ایسا کیوں کیا، صرف اتنا تھا ذہن میں ماما اس کے بنا نہیں رہ سکتیں، کل مسز وسیم کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بعد اس نے یہ ڈی سی ٹرن لیا تھا۔ مسز وسیم بھند تھیں اپنے بیٹے کے لیے حساب کو بہو بنانے کے لیے اور ماما جان جاتیں کیونکہ وہ حساب سے محبت کرتی تھیں، اسے خوش دیکھنا چاہتی تھیں، اور وہ..... از میر حیدر اپنی ماما کو خوش دیکھنا چاہتا تھا اور ماما کی خوشی کا نام حساب تھا، اسے اس کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا حساب کو مستقل اپنے گھر میں روکنے کا، سو اس نے رات بھر جاگ کر یہ فیصلہ کیا اور صبح ہوتے ہی حساب کو لے کر کورٹ میں پہنچ گیا، جہاں اس نے بنا حساب کی مرضی جانے اس سے نکاح نامہ پر زبردستی سائن کرائے تھے، مگر اب وہ مطمئن تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت حساب کو اس گھر سے نہیں لے جاسکتی، وہ ہمیشہ ماما کے پاس رہے گی۔ وہ اپنی سن مانی کر کے خوش تھا، مگر حساب کے لیے پل پل سانس لینا مشکل ہو رہا تھا، اتنا بڑا فیصلہ، وہ آنٹی کو بتائے تو کیسے؟ کہ ان کے بیٹے نے تو اس کی ساری زندگی تباہ کر دی، اپنی انا کی تسکین کے لیے، عمر بھر کے لیے غلام بنا ڈالا تھا، مگر وہ آنٹی سے کچھ نہ کہہ پائی، ہاں از میر حیدر سے نہ ڈرنے کا جو عہد اس نے کیا تھا وہ اب مضبوط ہو گیا، اس نے از میر کے ہر کام سے بائیکاٹ کر دیا، شام میں افطاری پر صرف فروٹ چاٹ کی پلیٹ اس کا منہ چڑا رہی تھی، وہ خاموشی سے سہہ گیا، مگر نماز کے بعد آیا تو علم ہوا کہ کھانا آج بنایا ہی نہیں گیا، غصے سے اس کے اعصاب تن گئے اور جیسے ہی حساب ماما کے لیے دودھ لینے رات کو کچن میں آئی تھی، وہ اس کے پیچھے وہاں موجود تھا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ اب بھی تمہارا آخرہ اور غرور نہیں ٹوٹا؟ حالانکہ اب تو تمہیں مزید دل جمعی سے میری خدمت کرنی چاہیے کہ میں تمہارا مجازی خدا ہوں اب۔“ وہ اسے چڑا رہا تھا، خون جل رہا تھا، اس نے رو رو کر آنکھیں سرخ کر رکھی تھیں، اس کا اندازہ از میر کو تب ہوا جب اس نے از میر کو زہریلی نظروں سے گھورا، وہ پتھر دل نہیں تھا، لمحہ بھر اسے بہت افسوس ہوا کہ اس نے اپنی ضد کے لیے ایک لڑکی کی زندگی تباہ کر ڈالی، اس کی ہر خوشی چھین لی، مگر کیا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ تھا حساب کو یہاں روکنے کا؟

”تمہارے گھورنے سے میرا پیٹ نہیں بھرے گا، مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“ وہ اب بھی اُن سنی کرتی نکل رہی تھی کہ اس نے راستہ روک لیا۔

”میری شرافت کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ حساب!“

”شرافت..... اچھی طرح جان گئی ہوں آپ کو بھی اور آپ کی شرافت کو بھی۔“

”رنگی! یہ تو اچھی بات ہے ناں کہ تم مجھے اچھی طرح جان گئی ہو، آگے تمہیں مشکل نہیں ہوگی۔“ وہ قدرے اس کی طرف جھک کر بولا۔

”میری بے بسی کا اتنا مذاق نہ اڑائیں از میر حیدر! کہ میں جان دینے پر مجبور ہو جاؤں، میری ذات کا وقار اور میرا عزت تو آپ نے چھین لیا ہے، صرف جسم میں جان ہی بچی ہے میرے پاس، وہ بھی نکال لیں، اگر آپ کی جھوٹی انا کو تسکین اسی طرح ملتی ہے تو۔“ اس کی بات کے جواب میں ایک زوردار پھٹنے لگے گا اسے، یہ اس کے ذہن و گمان میں

نہیں تھا۔

”یہ لاسٹ وارنگ تھی، اس کے بعد اگر تم نے میرے سامنے یہ لہجہ اور آواز تیز استعمال کی تو۔۔۔“ وہ مٹھپیاں بھینچ وہاں سے ہٹ گیا، اس کے مضبوط اور سخت ہاتھ کا نشان اس کے سفید گال پر ثبت ہو گیا تھا۔ دوپٹے سے کور کرتی وہ آنٹی کو میڈیسن دے کر اسٹڈی میں چلی گئی تھی، آج ستائیسویں شب تھی، وہ اپنے رب کے حضور حاضر تھی، مگر آج اس کے اندر مایوسی تھی، وہ جو مایوسی کو گناہ گردانتی تھی آج خود کو ہارا ہوا، بے بس دلا چار محسوس کر رہی تھی۔

”مجھے نہیں پتا میرے رب! جو ہوا وہ میرے حق میں بہتر ہے یا نہیں؟ مگر میرا دل اسے قبول نہیں کر رہا، اے مالک! تیری رضا کے بنا تو پتہ بھی نہیں حرکت کر سکتا، پھر از میر حیدر جیسا انسان اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتا ہے؟ میں جانتی ہوں تو رحمن ہے، میری صرف تیری ذات سے امید ہے اور تو ہی میرے حق میں بہتر سوچنے والا ہے، میں تیری رضا میں راضی ہوں۔“ ایک پھندا سا اس کے گلے میں انک گیا، وہ مزید کچھ کہے بنا پھوٹ پھوٹ کر رودی تھی، ساری رات اس نے اللہ سے رورو کر دعا کی تھی، سحری میں وہ اس کے لیے ٹیبل پر تمام چیزیں رکھ کر خود صرف چائے کا کپ بنا کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی، از میر آیا تو سحری ٹیبل پر تیار تھی مگر وہ خود نہیں تھی، اس نے کچن میں جھانکا تو نندارد، پھر وہ ماما کے روم میں آیا تو وہ بیڈ سے ٹیک لگائے نیچے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو جاری تھے، ایک انجانی کیفیت سے دو چار ہوا تھا وہ، اس کے آنسو از میر کے دل پر بھاری بوجھ بن کر جیسے ٹھہر گئے، وہ سحری کے لیے بیٹھا، مگر اس سے ایک نوالہ تک نہ کھایا گیا، وہ پانی کا گلاس پی کر اٹھ گیا، اذان ہوئی تو مسجد چلا گیا، سحاب اس کے جانے کے بعد باہر آئی تو ٹیبل پر تمام چیزیں جوں کی توں رکھی تھیں، اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں تھا، وہ گہری سانس خارج کرتی ٹیبل سے برتن سمیٹنے لگی، پہلے نماز ادا کی پھر واپس آ کر برتن دھونے لگی، اتنے میں وہ بھی آ گیا تھا، برتنوں کی کھٹ پٹ سن کر سیدھا کچن میں آیا تھا۔

”تم نے روزہ رکھا ہے؟“ حالانکہ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ وہ روزہ نہیں قضا کرتی تھی، اس نے محض سرکوا ثبات میں بلایا تھا۔

”پھر سحری کیوں نہیں کی، کچھ کھایا بھی نہیں؟“

”کھایا تو آپ نے بھی کچھ نہیں ہے۔“ انجانے میں سہی دونوں ایک دوسرے کی فکر کرتے تھے، اس کا جواب از میر کو مسکرانے پر مجبور کر گیا، حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ بہت دکھی ہو کر گھر سے نکلا تھا۔

”ریلی! تم اتنی فکر کرتی ہو میری، تو مجھے بھی تو کچھ نہ کچھ تمہارا خیال رکھنا چاہیے ناں، تم بھوک رہو تو میں کیسے کچھ کھا سکتا ہوں؟“ اس نے سر و نظروں سے گھورا، وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔

”رات غصے میں تم پر میرا ہاتھ اٹھ گیا، اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔“

”کیوں یہ تو آپ کا حق تھا ناں؟ اسی حق کو جتانے کے لیے تو آپ کو اتنا اہم فیصلہ کرنا پڑا، اب شرمندگی کیسی؟“

”تم نہیں سمجھو گی۔“ پہلی بار اس نے از میر کا لہجہ اتنا کمزور دیکھا تھا۔

”میں سمجھنا چاہتی بھی نہیں ہوں۔“ وہ اس کے برابر سے نکل کر کمرے میں جا گئی تھی۔ سارا دن وہ بہت خاموش رہی، زہرہ آنٹی نے کئی بار پکارا، وہ یوں چونک جاتی جیسے کسی گہری نیند سے جاگی ہو، ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو پھر سے آنکھیں بھر آئیں۔

”میں کیا مانگوں تجھ سے اے میرے رب! تو میری ذات کو، میرے من کو سکون عطا کر، میرے دل کی بے چینی یہ مایوسی دور فرما دے مالک! زندگی تیری دی ہوئی ایک عظیم نعمت ہے، میں اس سے انکاری نہیں ہوں، مگر زندگی کے ان

تلخ تجربوں سے تھک چکی ہوں، بہت کمزور ہوں میں، اے میرے اللہ! مجھے ہمت دے حالات سے لڑنے کی، اپنے حق کے لیے بولنے کی، ٹو جانتا ہے کل سے اب تک میری شناخت بدل گئی، مگر اب مجھ میں زمانے کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے، تو مجھے حوصلہ دے، آنے والا وقت جانے میرے لیے کیسے سوال اٹھائے، مجھے اس وقت کا ہمت سے مقابلہ کرنا ہے۔“ اس نے مزید اپنے رب سے گدگد کر دعا کی پھر جائے نماز سمیٹ کر باہر آ گئی، لاؤنج میں اس ظالم انسان کو سو جوتا کرا سے پتہ چلا کہ وہ آفس سے آج جلد آ گیا ہے، وہ مڑ کر واپس اپنے کمرے میں آ گئی، جہاں آنٹی شاید اس کی منتظر بیٹھی تھیں۔

”سحاب! از میر آفس نہیں گیا؟“

”صبح گئے تو تھے شاید جلدی آ گئے۔“

”پتہ نہیں مجھے وہ پریشان سا لگ رہا ہے کل سے، جانے کیا بات ہے؟“ ان کی فکر مندی پر وہ حیران رہ گئی اور سوچ تلخ ہو گئی۔

”میری زندگی کا سکون برباد کر کے وہ خوش ہے، آنٹی کو وہ پریشان لگ رہا ہے۔“ وہ تو اس کی پُپ بھی نوٹ کر رہی تھیں۔

”سحاب! تم دونوں میں پھر سے کوئی بات تو نہیں ہوئی؟ کیونکہ تمہارا چہرہ بھی اُتر اُتر سا ہے، آنکھیں تم نے لاکھ کوشش کی چھپانے کی مگر تمہارے رونے کی گواہ ہیں۔“

”نہیں، انہوں نے مجھے کیا کہنا ہے؟ میں تو اپنی قسمت پر رورہی تھی آنٹی!“

”پھر رات تمہارے چہرے پر نشان کیسا تھا جو تم چھپا رہی تھیں مجھ سے؟“ وہ اتنی بے خبر نہیں تھیں جتنا سحاب سمجھ رہی تھی۔

”پلیز آنٹی! مت پوچھیں کچھ۔“

”ٹھیک ہے، مجھے باہر لے چلو، میں از میر سے ڈائریکٹ پوچھ لیتی ہوں۔“

”میں یہیں حاضر ہوں ماما جانی! کیا پوچھنا ہے آپ کو؟“ وہ بہت لائٹ موڈ میں ان کے کمرے کے دروازے کے بچ کھڑا تھا، اس کی شکل دیکھتے ہی سحاب کا موڈ خراب ہو گیا اور جیسے ہی وہ اندر ماما کے پاس آیا، سحاب باہر نکل گئی۔

”برائے مہربانی جاتے جاتے دروازہ بند کر دینا۔“ روکھی پھٹکی آواز پر اس نے ڈور دھڑ سے بند کیا تھا اور خود کو خواخوہ مصروف کرنے کے لیے رجیم بھائی کے کام میں مہلپ کرانے لگی۔

☆.....☆.....☆

”میں صرف آپ کا نہیں اس کا بھی مجرم ہوں، مجھے اندازہ ہے ماما! کہ میرے اس قدم نے اس کا بھی اعتماد انسانیت سے ختم کر دیا ہوگا، وہ کتنی مایوسی کے احساس سے دو چار ہے، بے بس دلا چار محسوس کر رہی ہے خود کو، مگر ماما!

مجھے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نظر نہیں آ رہا تھا سحاب کو اپنے گھر میں روکنے کا، میں خوفزدہ ہو گیا تھا کہ اگر وہ پھر سے چلی گئی تو کہیں آپ کی طبیعت مزید نہ بگڑ جائے، میں نے آپ کی اور مسز وسیم کی ساری باتیں سن لیں تھیں، مجھے لگا اگر

میں نے یہ فیصلہ نہ لیا تو آپ مسز وسیم کو ہاں کر دیں گی، میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے جائے، اس کے آنے سے آپ میں جو امپر دومنٹ مجھے نظر آئی ہے، اس کے بعد یہاں سے سحاب کا جانا مجھے قطعی منظور نہ تھا، مگر ماما! کل سے اب

تک جب جب اس کا مرجھایا چہرہ میری نظروں کے سامنے آتا ہے تو میں خود کو پستی میں اُترتا محسوس کرتا ہوں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ سچ ہی تو کہتی تھی، وہ میری جاگیر نہیں تھی کہ میں اس کے بارے میں جو بھی ڈی ڈی ٹن لوں وہ مان

جھی لے گی، وہ بھی انسان ہے، اس کے بھی خواب ہوں گے، مگر میں نے سب چکنا چور کر دیئے، پلیز ماما! میں آپ سے بھی بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کی اجازت کے بنا یہ قدم اٹھایا، شاید میں نے غصے میں بہت غلط فیصلہ لے لیا ہے۔

”یہ سب کرنے سے پہلے ایک بار مجھ سے ذکر تو کرتے، مجھے بتاتے تو کہ تمہارے دل میں کیا ہے، تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے، اب علم ہوا مجھے کہ کل سے صاحب مر جھا کیوں گئی ہے، از میر! یہ بندھن زور زبردستی سے نہیں جوڑے جاتے، یہ تو خوشی کے بندھن ہوتے ہیں، دونوں فریقین کی رضامندی، ان کی خوشی ہی اس رشتے کی مضبوطی کی بنیاد ہوتی ہے، اور اس رشتے میں نہ تمہاری خوشی شامل ہے اور نہ صاحب کی رضامندی، ایسا بندھن رمر بھر دکھ اور پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں دیتا۔“

”پلیز ماما! ٹیل جی، اب میں کیا کروں؟ میرے معافی مانگنے سے یہ سب ختم نہیں ہو سکتا، ورنہ میں ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ لیتا۔“ وہ زہرہ حیدر کی گود میں سر رکھے ان سے اپنے دل کی تمام کیفیت بیان کر رہا تھا، اس کا لہجہ بہت کمزور اور بکھرا ہوا تھا، وہ قطعی وہ از میر حیدر نہیں لگ رہا تھا، جسے خود کو کمزور ظاہر کرنا آتا ہی نہیں تھا۔

”از میر! میں تم سے ایک بات کہوں، مانو گے؟“ انہوں نے دھیرے دھیرے اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

”پلیز ماما! کہیں ناں۔“

”کسی بھی طرح کا فیصلہ لینے سے پہلے تم اپنا دل ٹٹولو، اپنے اندر جھانکو کہ کیا واقعی تم نے اتنا بڑا فیصلہ صرف میری خوشی کے لیے کیا ہے، نکاح وقتی جذباتی بندھن نہیں ہے از میر! عمر بھر ساتھ نبھانے کا عہد ہے، اور تم صرف میرے لیے یہ کیسے کر سکتے ہو کہ تم نے نہ صرف صاحب کی بلکہ اپنی زندگی بھی داؤ پر لگائی ہے، تم یہ بھول گئے تھے شاید نکاح سے تم صاحب کو تو عمر بھر کے لیے اس گھر میں روک لو گے، مگر تم بھی اس عہد کے پابند ہو گئے ہو، وہ لڑکی صرف اس گھر میں ہی نہیں تمہاری اپنی زندگی میں اب بہت اہم ہو گئی ہے، تمہارے ہر سکھ دکھ میں، کیا تم اس بات سے بے خبر تھے کہ نکاح کے بعد صرف ذمہ داری اس کی نہیں، تمہاری بھی بڑھ گئی ہے، اس رشتے کے معنی جانتے ہو تم از میر! پوچھو خود سے، جھانکو اپنے دل میں کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ پتہ ہے از میر! صاحب صرف میری ہی نہیں تمہاری بھی ضرورت بن گئی تھی، تم اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے رہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ تم اس کے عادی ہو گئے، تم شخص انا کی تسکین کے لیے یہ کہتے ہو کہ تم نے یہ قدم میرے لیے اٹھایا اور نہ حقیقت میں خود تمہیں اس کے بنارہنے کی عادت نہیں رہی، ورنہ تم تین دن میں اسے یا گلوں کی طرح ڈھونڈ کر واپس نہ لاتے، جب تمہیں وہ گھر میں نظر نہیں آئی تو تم بوکھلائے بوکھلائے پھرتے تھے، کیونکہ تمہیں آفس سے آ کر اسے دیکھنے کی عادت ہو گئی تھی، زور زبردستی سے ہی سہی تم کو اپنا ہر کام اس سے کرانا پسند تھا، تم اسے ضد کہتے رہے مگر یہ ضد نہیں ہے میرے بچے! کچھ اور ہے، پوچھو خود سے، جواب مانگو دل سے اپنے، تم نفرت نفرت کے اس کھیل میں بہت آگے جا چکے ہو۔“ حالانکہ اس کا دماغ ماما کی باتوں سے ایگری نہیں تھا مگر پھر بھی وہ خاموش رہا، کم از کم ان سے ہر بات شیر کر کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

”اچھا اٹھو، جا کے باتھ لو، فریش محسوس کرو گے خود کو۔“ انہوں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”ہوں..... آج ویسے بھی گرمی بہت زیادہ ہے۔“ وہ ان کی گود سے سر اٹھا تا سیدھا ہو بیٹھا، پھر ہاتھوں سے بال درست کیے۔

”جینکس ماما! آپ سے شیر کرنے کے بعد مجھے بہت ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ صرف مسکرا دیں۔ از میر

کمرے سے باہر نکلا تو اسے کچن سے رحیم بھائی کے ساتھ باتوں میں مصروف صاحب نظر آئی تھی، وہ اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کنسل کرنا ان کی طرف آ گیا۔

”ارے بھیا! ہم ابھی آپ کو ہی یاد کر رہے تھے۔“

”مجھے بھی کوئی یاد کرتا ہے رحیم بھائی؟“ اس کا انداز چڑانے والا تھا۔

”وہ بھیا! دراصل آپ نے بتایا نہیں تھا صبح کہ آج شام میں کیا بنانا ہے ڈنر اور افطاری کے لیے؟“ رحیم بھائی کی بات سے اسے یاد آیا۔

”اوہو..... ہاں رحیم بھائی! آج میں آپ کو چھٹی دے رہا ہوں، مزے کریں، دراصل مجھے آج افطار پارٹی میں جانا ہے اپنے فرینڈز کے ہاں۔“ وہ شاید احسان کر رہا تھا مگر ساتھ وضاحت بھی پیش کر رہا تھا۔ رحیم بھائی کچھ کہتے تھے زہرہ حیدر کی آواز پر انہیں باہر جانا پڑا۔ از میر نے پیٹھ کیے کھڑی صاحب کو مخاطب کرنا چاہا، مگر اسے جانے کیوں الفاظ نہیں ملے اور وہ لب کھلتا، اپنے کمرے میں چلا گیا، عصر کے بعد وہ تیار ہو کر چلا گیا تھا، صاحب کو کچھ اطمینان ہوا کہ اس کے ہوتے وہ خود کو پُر سکون اور ایزی محسوس نہیں کرتی تھی۔ افطاری کے نام پر اس نے صرف دو بھجوریں اور جوس لیا تھا، وہ بھی آنٹی کے کہنے پر، کیونکہ آج آنٹی اس کے پاس ہی بیٹھی تھیں، پھر وہ نماز کے لیے اٹھ گئی، مغرب کیا عشاء کی نماز کے بعد تک اس نے کچھ نہیں کھایا، زہرہ حیدر اصرار کرتی رہیں مگر اس کا ایک ہی جملہ تھا کہ بھوک نہیں ہے، وہ چپ ہو گئیں، انہیں میڈیسن وغیرہ دے کر وہ کچن میں آئی تھی، سحری کے لیے بھی تو کچھ نہ کچھ بنانا تھا، اس نے رحیم بھائی کی ہیلپ سے از میر حیدر کی پسند معلوم کر کے سالن بنا کر رکھ دیا تھا، حالانکہ وہ دو دن سے سونہ پائی تھی اس کے باوجود جب لیٹی تو نیند نہیں تھی آنکھوں میں، اس نے گردن موڑ کر پیڈ کے دوسری طرف لیٹی آنٹی کو دیکھا، وہ پُر سکون سو رہی تھیں، صاحب اٹھ کر اسٹڈی روم جانے کے ارادے سے نکلی تھی، گھڑی میں گیارہ بج رہے تھے، مگر رستے میں اسے از میر مل گیا۔ وہ شام سے گیا اب لوٹا تھا، صاحب نے کترا کر گزرتا چاہا مگر از میر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اسے اپنے کمرے میں لایا تھا، اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے از میر حیدر کا بیڈ روم دیکھا تھا، ورنہ وہ تو اس طرف سے گزرتی تک نہ تھی۔

”بیٹھو۔“ اس نے بہت نرم انداز میں صاحب کو صوفے پر لا کر بٹھایا تھا۔

”مرنا چاہتی ہو تم؟“ غیر متوقع سوال پر وہ اسے دیکھنے لگی۔

”کمزور ہوں مگر بزدل نہیں۔“

”پھر بھوکا رہنے کا کیا مقصد ہے؟ کل سے تم نے کچھ نہیں کھایا، خالی پیٹ روزہ رکھا، اور رحیم بھائی کہہ رہے تھے کہ تم نے افطاری میں بھی صرف پانی پیا تھا، اور بس۔“

”مجھے بھوک لگی تو کھالوں گی۔“ وہ رکھائی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی، مگر اس نے پھر سے بٹھا دیا۔

”یہ کھانا ختم کر لو، پھر تم جاسکتی ہو۔“ اس کی نظر ٹیبل پر رکھی ٹرے پر تواب گئی تھی۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا ہے کچھ کھانے کو۔“

”تھوڑا سا کھا لو، دیکھو اگر تم یوں خالی پیٹ روزے رکھو گی تو بیمار پڑ سکتی ہو۔“

”آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”دیکھو صاحب! مجھے غصہ مت دلاؤ، کھانا کھاؤ۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی کے ساتھ تھوڑا سا حکم بھی تھا۔

”آپ ہر کام اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں، کیا آپ کو لگتا ہے زور زبردستی سے کیے گئے کام سے آپ کے دل کو

تسلیں مل جاتی ہوگی؟“

”نی الوقت میں کسی بحث کے موڈ میں نہیں ہوں، کھانا کھا لو اور جا کر سو جاؤ، بہت رات ہو گئی ہے۔“

”میں کھالوں گی، اپنے کمرے میں جا کر۔“ اس کے سامنے بیٹھ کر کھانا کیسے کھا سکتی تھی وہ۔

”پراس؟“ اس کے اس قدر دوستانہ انداز پر وہ بہت حیران تھی مگر خوش فہم نہیں۔

”ڈونٹ وری اگر مجھے کچھ ہوا تو آپ پر الزام نہیں آنے دوں گی۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر ٹرے سمیت اس کے کمرے سے نکل آئی تھی، عجیب شخص تھا، جیسے کاہر ہنر چھین کر مرنے بھی نہیں دیتا تھا۔

”اگر میری ذات کی قربانی سے تمہیں لگتا ہے از میر حیدر! کہ تم نے تانیہ جیسی ہر لڑکی سے بدلہ لے لیا تو میں خود کو تمہارے ہر ستم کے لیے تیار کرتی ہوں، مگر ایک دن ضرور تم مانو گے کہ تانیہ کی غلطی کی سزا تم مجھے دے تو رہے تھے، مگر میں مجرم تھی نہیں، جانے وہ کیسی لڑکی تھی، جس نے محبت کی قدر نہ کی، چاہنے والے شوہر کو مار گئی۔“ یہاں تو دل میں غبار ہی غبار تھا مگر لب تھے کہ از میر حیدر کے لیے بددعا تک کرنے کو تیار نہ تھے۔ عید میں صرف دو دن باقی تھے مگر اس گھر میں عید کی خوشی کہیں نظر نہیں آرہی تھی، زہرہ حیدر، سحاب کے چہرے کی سوگواری اور من کی بے چینی دیکھ رہی تھیں۔

”مان لو ناں سحاب! کہ وہ ضدی ہے، انا پرست ہے، ہٹ دھرم ہے، مگر تم تو ایسی نہیں ہو، تمہیں تو وہ آئیڈیل انسان لگا کرتا تھا ناں، اب وہ آئیڈیل انسان تمہارا ہے، صرف تمہارا۔“ وہ بولیں۔

”مگر میرا آئیڈیل یوں کرچی کرچی میری آنکھوں کے سامنے بکھر گیا ٹوٹ کر جب از میر نے مجھ سے نکاح نامے پر زبردستی سائن کرائے تھے۔“ اس نے غصے سے جواب دیا۔

”وہ تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا اور احمق اتنا ہے کہ جذباتوں کے اظہار تک کا نہیں پتہ۔“

”وہ صرف مجھے اپنا غلام بنا کر اپنی انا کو اونچا رکھنے کا خواہش مند تھا، میرا اعتماد، میرا وقار اسے بڑا لگتا تھا۔“

”وہ ایسا نہیں ہے سحاب!“

”بیٹا ہے ناں آپ کا، سائیڈ اسی کی لیں گی۔“

”تم بھی تو بیٹی ہو میری۔“

”پھر آپ نے اسے ڈانٹا کیوں نہیں، اتنے غلط ڈی سی ٹن پر؟“

”میرے اپنے دل کا ارمان تھا تم ہمیشہ میرے پاس رہو، مجھے راستہ نظر نہیں آ رہا تھا، از میر نے وہ راستہ۔۔۔۔۔“

”آئی پلیر!“

”اچھا اٹھو، بازار چلتے ہیں، تمہاری پہلی عید ہے اس گھر میں اور اب تو تم اس گھر کی بہو ہو۔“

”مجھے روزے میں کہیں نہیں جانا۔“ جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ آئی ہر بات سے واقف ہیں اور از میر کے حق میں ہیں، وہ ان سے بھی خفا خفا تھی، وہ سمجھ تو رہی تھیں، مگر جانے از میر اپنے دل کا حال کب سمجھتا؟ رات میں وہ ان کے پاس بیٹھا تو وہ بولیں۔

”کل آخری روزہ ہے از میر! سحاب کی اس گھر میں وہ بھی خاص کر تمہارے حوالے سے پہلی عید ہے، مگر وہ کچھ بھی خریدنے کو تیار نہیں ہے، اب تو وہ مجھ سے بھی خفا ہے۔“

”ہونے دس کب تک رہے گی؟ سچ تو یہ ہے کہ اب وہ بھی آپ کی محبت کے بنا نہیں رہ سکتی ماما! واقعی آپ ٹھیک تھیں آپ نے سحاب کو بالکل ٹھیک پہچانا تھا، میں ہی غلط تھا، سراسر غلط، ماما! اس نے کھانا کھایا؟“ وہ دوبارہ اس سے مخاطب نہیں ہوا تھا، مگر فکر بہر حال تھی، ممانے اثبات میں سر ہلایا تو بے سکون ہو گیا۔

”ماما! مجھے کہیں جانا ہے، تھوڑا لیٹ ہو جاؤں گا۔“ اچانک ہی اسے یاد آیا تھا، وہ ماما کو بتاتا اٹھا اور سیدھا گاڑی لے کر نکل گیا۔ آخری روزہ افطار ہوا تو کچھ دیر بعد ہی پٹاخوں اور ہوائی فائرنگ سے چاند رات ہونے کا پختہ اعلان ہو گیا، وہ نماز ادا کر کے سیدھا اس کے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔

”چاند رات مبارک ہو سحاب!“

”مجھے پھپھو سے ملنا ہے۔“ اس کے لہجے کی مٹھاس اگنور کرتی وہ مطلب پر آئی تھی۔

”ماما کو بتا دو، میں گاڑی نکالتا ہوں۔“ حیرت اور صدمے سے برتن ہی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے، از میر اتنی شرافت سے مان گیا، بنا ڈانٹ پھنکار کیے اسے لے جانے کو تیار تھا وہ، اس نے لمحہ لگایا تھا بچن سے کمرے تک جانے میں، مگر از میر کو حیرت تب ہوئی جب سحاب کے ساتھ ماما بھی آتی نظر آئیں، سحاب انہیں دھیرے دھیرے چلاتے ہوئے گاڑی تک لائی تھی، اور ماما کے جانے کا مقصد انہیں تب سمجھ آیا، جب ممانے پھپھو سے بات کی تھی از میر کے لیے سحاب کے رشتے کی، یہ بات ان کے لیے قطعی انہونی تھی، پر وہ خوش تھیں اپنی بیٹی کے نصیبوں پر، ان کی بہت سی دعائیں سحاب کے ساتھ تھیں۔

”کل عید ہے پھپھو! اور میں آج آپ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔“

”مجھ سے۔۔۔ کیا میرا بچہ؟“

”میری خواہش پوری کر دیں ناں پھپھو! میرے ابو کے مکان کو آباد کر کے اسے گھر بنا دیں، وعدہ کریں ناں پھپھو! آج منع نہیں کریں گی۔“

”سحاب ٹھیک کہتی ہے، پھر اب تو سحاب کے لیے وہ گھر بالکل بھی ضروری نہیں رہا، آپ کیوں خود کو کرائے کے مکان میں خوار کرتی ہیں؟“ زہرہ حیدر کے سمجھانے پر اور سحاب کی ضد پر وہ مان گئیں، سحاب کے دل سے ان کے لیے جو فکر تھی وہ بہت حد تک کم ہو گئی، واپسی پر ممانے لاکھ کہا کہ بازار چلتے ہیں مگر وہ نہیں مانی۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے، سب کچھ ہے میرے پاس۔“

”مہندی ہی لگوالو اچھا۔“

”مجھے پسند نہیں ہے۔“ اس نے قصہ ہی ختم کر دیا، ماما بہت اُداس سی ہو گئی تھیں، از میر دیکھ چکا تھا گھر آ کر جب سحاب نماز پڑھنے گئی تو وہ ان کے پاس آیا تھا، ان کے لیے عید کی شاپنگ جو کی تھی وہ سامان لے کر، وہ خوش ہو گئیں۔

”اور سحاب۔۔۔۔۔؟“

”جب وہ ضدی ہے تو از میر کم تھوڑا ہی ہے، یو ڈونٹ وری ماما!“ اس نے تسلی دی، سحاب نماز پڑھ کر سونے کے لیے آئی تو آئی کو سوتے پایا، آج وہ بنا دو دھ لئے سو گئی تھیں، وہ رحیم بھائی سے صبح کے کام کی تفصیل پوچھنے آئی تو از میر، رحیم بھائی کو صبح کے لیے ہدایات دے رہا تھا، اور وہ جی بھیا، جی بھیا کہہ کر سر ہلارہے تھے، وہ مڑ گئی۔

”سحاب پلیر! جسٹ اے منٹ۔“ وہ یکدم اس سے مخاطب ہوا تھا، رحیم بھائی کو تمام بات سمجھا کر اب وہ اس کی طرف آیا تھا، جو اس کے روکنے پر کھڑی تھی۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”کہیں، میں سن رہی ہوں۔“

”یہاں نہیں، میرے بیدروم میں۔“

”مجھے نہیں جانا، جو کہنا ہے یہیں کہہ دیں۔“

”تم شرافت سے چلوگی یا پھر رحیم بھائی کی موجودگی کا لحاظ کیے بنا میں تمہیں گود میں اٹھا کر لے جاؤں؟“ اس سے کچھ بعد نہ تھا کہ یہ شخص ضد پر آجائے تو کرتا تھا ہر ضد پوری۔

”مگر مجھے چائے پانی ہے اپنے لیے۔“ اس نے بہانہ گھڑا۔

”گڈ آئیڈیا، رحیم بھائی دو کپ مزید اسی چائے میرے کمرے میں لے آئے گا پلیز!“ اس نے نازک ہاتھ تھا اور رحیم بھائی کو ہدایت کرتا بیڑھیاں چڑھنے لگا، سحاب نے ہاتھ کھینچا اور اس کے پیچھے چلتے ہوئے اس کے کمرے میں آئی تھی۔ از میر نے ایک بڑا سا شاپر اس کے ہاتھ میں تھمایا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”ہماری شادی کا پہلا گفٹ، یو نو، کل عید ہے اور میں نے زندگی میں پہلی بار لیڈیز شاپنگ کی ہے تمہاری فضول سی ضد کی وجہ سے، دیکھو تو پلیز!“ وہ یوں مخاطب تھا جیسے ان میں برسوں کی دوستی رہی ہو، بہت اچھا رشتہ ہوا ان کے بیچ، سحاب کے چہرے پر اجنبیت کے رنگ برقرار تھے۔

”سحاب پلیز!“

”اور اگر میں یہ سب یہیں پھینک کر چلی جاؤں تو...؟“

”آئی نو، تم ایسا کبھی نہیں کرو گی، بی کوڑ یہ تمہاری نیچر کا حصہ نہیں ہے، تمہارا دل تو بہت پیارا ہے، نازک اور نرم، صرف محبت کرنے والا۔“

”آپ نے میرے دل کی ساری نرمی ہی چھین لی ہے۔“

”آئی ایم سوری!“ وہ قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا تھا، مگر تبھی دروازہ ٹاک کر کے رحیم بھائی چائے لے کر اندر آئے تھے۔

”تھینک یو رحیم بھائی! اور ہاں یہ آپ کا عید کا گفٹ ہے۔“ اس نے بیڈ پر سے ایک شاپر اٹھا کر انہیں تھمایا تو وہ شکریہ ادا کرتے باہر چلے گئے، وہ پھر سے سحاب کی طرف متوجہ ہوا، جواب تک شاپر تھامے کھڑی تھی، اس نے کندھوں سے تھام کر اسے بٹھایا، پھر خود ہی تمام چیزیں کھول کر دکھانے لگا، سوٹ، جوتے، چوڑیاں، جیولری ہر چیز تھی جو ایک لڑکی کے سچے لیے ضروری ہوتی ہے۔

”مجھے علم نہ تھا تمہیں مہندی پسند نہیں، میں یہ لے آیا تھا۔“

”آپ کو یہ علم کیسے ہوا کہ مجھے یہ سب چیزیں پسند ہوں گی؟“

”آئی ریٹلی ڈونٹ نو، مگر مجھے اتنا پتا ہے کہ جب میں تمہارے لیے یہ سب خرید رہا تھا تو مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔“

”میں آپ کی اس تبدیلی کی وجہ جان سکتی ہوں؟“ اس نے از میر حیدر کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا، جہاں سے پناہ چمک اسے تادیر نظر میں ملانے نہ دے سکی۔

”بی کوڑ... آئی نو یو۔“ یکدم ہی اس کا لہجہ دھیمہ ہو گیا، بے انتہا نرم اور محبت سے بھرا۔

”نہیں سحاب! آئی ریٹلی نو یو۔“ سحاب کے سارے وجود میں ایک عجیب سا احساس ہر اسیت کر گیا، وہ مزید یہاں نہیں بیٹھ سکتی تھی، مگر از میر حیدر نے اس کے جانے کا ارادہ جان کر، اس کے منصوبے پر پانی پھیر دیا، اور اس کے جانے کا راستہ روک لیا۔

”میری بات ابھی ادھوری ہے مسز! اور آج تم مکمل بات سننے بنا یہاں سے نہیں جاؤ گی۔“

”میں آپ کے کسی حکم کی پابند نہیں ہوں۔“

”کم از کم اب تو یہ ضد چھوڑ دو، اب تو تمہارا یہ دعویٰ بھی میں نے غلط ثابت کر دیا ہے۔“

”بہت خوش ہیں ناں آپ مجھے جھکا کر، آپ کو لگتا ہے آپ فاتح ہیں؟“

”ہاں میں خوش ہوں تمہیں پا کر، جھکا کر نہیں، جب میں نے یہ فیصلہ لیا اور یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا تو مجھے خود نہیں علم تھا کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں، صرف میرے دل و دماغ میں ایک ہی بات گڑ کر رہ گئی تھی کہ تم اس گھر سے چلی جاؤ گی، اور میں ہر گز تمہیں یہاں سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا سحاب! تمہارے آنے سے اس گھر میں میری اور ماما کی زندگی میں جو تبدیلی آئی تھی، وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی، ہم سب تمہارے عادی ہو گئے تھے، ہاں یہ بھی سچ ہے کہ جب تم اس گھر میں آئی تھیں تو مجھے تم پر ذرا بھی اعتبار نہ تھا، مجھے عورت سے نفرت تھی، اور اس کی وجہ تم اچھی طرح جانتی ہو، تانیہ بھابی ہمارے ساتھ جو کر گئی تھیں وہ بھولنا بہت مشکل ہے سحاب! اور جب تم ماما کی طرف بڑھیں تو مجھے لگا شاید تم ماما کو ذریعہ بنا کر ہمارے گھر میں داخل ہونا چاہتی ہو، شاید میں کچھ غلط تھا مگر میں ایک بار یہ دھوکہ کھا چکا تھا اس لیے مجھے ہر انسان کو شک کی نظر سے دیکھنا پڑتا تھا، ماما نے جب اپنی کیئر کے لیے تمہارا نام لیا تو میں قطعی راضی نہ تھا مگر ماما نے خود تمہاری گارنٹی لی تھی، میں ان کی ضد کے آگے چپ کر گیا، تمہیں لے تو آیا، مگر تمہارے ہر فعل پر میری نظر ہوتی تھی، میں تمہیں ہر ہر قدم پر پرکھتا تھا اور تم ہر بار میرے شک کو جھوٹ میں بدل دیتیں، تمہیں تمہاری پھپھو کے گھر لے جانے کی ذمہ داری بھی اسی لیے لی تھی میں نے کہ میں یہ ثابت کر سکوں ماما کے آگے کہ تم بھی تانیہ کی طرح فراڈ ہو، بٹ آئی واز رائگ! تم نے اپنی نیک نیتی، اپنی سادہ دلی اور محبت کرنے والی فطرت سے نہ صرف ماما بلکہ میرے پورے گھر کو اپنا بنا لیا مجھ سمیت، مگر شاید مجھے ادراک نہ ہو سکا، اس رات جب میں نے تمہاری انسلٹ کی تو بلیوسی! رات بھر نہ سو سکا تھا میں، سحری میں یہ سوچ کر تم سے ایکسکوز کر لوں گا، میں کچھ مطمئن تھا مگر جب مجھے پتا چلا کہ تم چلی گئی ہو تو میری حالت پاگلوں کی سی ہو گئی، تم اسے میری ضد، میرا غصہ، یا ایگو جو بھی کہہ لو، مگر مجھے آج اس چیز کا اعتراف ہے کہ یہ گھر تمہارے وجود سے مکمل لگنے لگا تھا مجھے، اپنے گھر میں دن رات تمہیں دیکھنے کی اس قدر عادت ہو گئی تھی کہ وہ تین دن تمہارے بن جانا نہیں کیسے گزرے، ماما نے مجھ سے کہا تھا تم نہیں آؤ گی، کسی بھی صورت، اس لیے مجھے اپنا رویہ بہت سخت کرنا پڑا کہ میرے نرم انداز پر شاید تم نہ آتیں اور مجھے ہر صورت تمہیں یہاں لانا تھا اور تمہارے آنے کے بعد میرا گھر پھر سے مکمل لگنے لگا تھا مجھے، بٹ مسز وسم نے پھر سے میرا دماغ ہلا دیا، اس دن بھی وہی تمہارے جانے کی وجہ بنی تھیں، وہ تو ماما کے پیچھے ہی پڑ گئی تھیں کہ انہیں ہر حال میں اپنے بیٹے کے لیے تمہیں ہی بہو بنا کر لے جانا ہے، میں اپنی فیملی کو سے قطعی بے خبر تھا مگر یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی تمہیں اس گھر سے لے جائے، مجھے لگتا تھا کہ تم میری ماما کی ضرورت ہو، بس تمہیں یہاں عمر بھر روکنے کے لیے مجھے یہ کرنا تھا، بلیوسی مسز! میرا مقصد تمہیں جھکانا نہیں تھا، غصے میں، تمہاری بات کے جواب میں یہ میں نے کہا تھا، بٹ بائی گاڈ! تم میری ضد نہیں تھیں۔“

”مسز وسم مجھے میری مرضی کے بغیر اپنے بیٹے کے لیے زبردستی تو نہیں لے جاسکتی تھیں ناں؟“

”میں جانتا تھا، ماما نے تمہارے لیے جو فیصلہ بھی کرنا تھا وہ تم چپ چاپ مان جاتیں۔“

”مان تو میں آپ کی زبردستی پر گئی تھی، میرے اپنے وجود کی تو اہمیت ہے ہی نہیں، میرے مان باپ تو میرا سب کچھ بھی ساتھ لے گئے تھے، مگر مجھے جینا تو ہے ناں، جب تک سائیس باقی ہیں، آپ جانتے تھے کہ پھپھو کے گھر میں میری حیثیت کیا ہے، میں قطعی تنہا تھی، اور آپ نے میری اس بے بسی کو اچھا یو ز کیا تھا، آپ کو پتا تھا مجھے پوچھنے والا تو کوئی ہے نہیں، بے آسرا لڑکی ہے، جو آپ کی مرضی ہوئی آپ نے میری زندگی کا فیصلہ کر دیا، آفٹر آل میں آپ کے گھر میں سروینٹ تھی، آپ

سچی سادہ سنی

بھگی آنکھوں سے لوہابہ اپنی ڈائری کھولے بیٹھی تھی اس نے جو لوہابہ کو دعائیہ انداز میں بیٹھے ہوئے اور رات کے تین بجے اس کی سسکی پر ایمن کی آنکھ کھل گئی روتے ہوئے دیکھا تو چونک گئی۔



”لوہابہ کیا ہوا.....؟“ ایمن اسے یوں سکتے دیکھ کر پریشان ہو گئی، لوہابہ جو کہ اپنے ٹوٹے دل اور بکھرتے جذبات سنبھالتے سنبھالتے تھک گئی تھی آخر کار ہمدردی پا کر بکھر گئی۔

”ایمی! جسے میں بچپن سے چاہتی آئی آج اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ ایمی! میں یہ یقین نہیں کر سکتی کہ زیان ایسا بھی کر سکتا ہے پھر وہ سب کیا تھا کہ جب میں روئی تھی تو وہ سب کچھ چھوڑ کر مجھے چپ کرانے میں لگا رہتا تھا، جب میں ناراض ہو جاتی تھی تو وہ اپنا کھانا پیسا سب چھوڑ دیتا تھا اور جب تنگ میں مان نہیں جاتی تھی اس کے

چہرے پر کوئی خوشی کی رمت نظر نہیں آتی تھی، پھر وہ کیوں کہتا ہے کہ میں نے کبھی تمہیں اس نظر سے نہیں دیکھا تم صرف میری دوست ہو کیوں ایمن؟ کیوں.....؟“

لوہابہ سسکتی رہی اور ایمن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اسے پتہ تھا کہ آج زیان کے جواب نے لوہابہ کو توڑ کر رکھ دیا ہے اور وہ کربھی کیا سکتی تھی، سوائے لوہابہ کی دلجوئی کرنے کے۔ نہ جانے اور کتنے دکھ ہیں اس پیاری لڑکی کے نصیب میں ایمن سوچ کر رہ جاتی۔

☆.....☆

جواد احمد کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھیں بڑے بیٹے



زویب احمد جس کے دو بیٹے عزیز، زبیر اور ایک بیٹی
ایمن تھی جبکہ شعیب احمد کے ایک بیٹا زیان اور ایک بیٹی
زویبہ تھی۔ جواد احمد کی بیٹی جو کہ شعیب اور زویب سے
چھوٹی صوفیہ تھیں جن کی ایک بیٹی لوبابہ تھی۔ جواد احمد
اور صالحہ جواد اپنے حلقے احباب میں بہت سلیجی ہوئی
شخصیت اور بردبار مشہور تھے ان کی محبت اور خوش اخلاقی
کی مثالیں دوسرے گھرانے کے لوگ دیتے تھے۔ بہت
محبت سے انہوں نے اپنے آشیانے کا نام ”احمد ولا“
رکھا تھا۔ اس احمد ولا کو نہ جانے کس کی نظر لگی کہ ہر وقت
ہر دم ہنستے مسکراتے ہوتوں پر تالے لگ گئے۔ ایک دن
صوفیہ اور ان کے شوہر شاپنگ کی غرض سے جا رہے تھے
کہ پیچھے سے آنے والا ٹرک بے قابو ہو گیا اور وہ ان کی
کار کو اپنے بھاری پیروں تلے دبا تا چلا گیا ٹرک کے
دھکے نے صوفیہ کی ڈھائی سالہ بیٹی کو گاڑی سے باہر
اچھال دیا اور وہ دونوں موت کی آغوش میں ہمیشہ کے
لئے چلے گئے۔ لوبابہ کو کسی مہربان ہاتھوں نے سنبھال لیا
اور یوں وہ بغیر کسی آنچ آئے اپنے ماں باپ کی لاش
کے ساتھ ”احمد ولا“ پہنچ گئی۔ احمد ولا میں کھرام مچ گیا
ہر کوئی اس نضی بچی کو پیار کرتا اور پھر افسوس کرتا۔

”وا! کیا ہوا آپ کو.....؟“ چونکہ لاڈلا ہونے کی وجہ سے اس کی بھی دامن جان تھی۔ دانے ایک نظر اسے دیکھا اور بولیں۔

”لو بابہ بیٹا! مجھے میرے کمرے میں لے چلو مجھے چکر آرہے ہیں۔“ زیان کے دا کے مخاطب کرنے پر لو بابہ کا دھواں ہوتا چہرہ دیکھ کر سمجھ گیا کہ انہوں نے ساری باتیں سن لی ہیں۔

تو ہم کو لوہابیہ کا سامنا کرنا بھی جرم لگے گا۔ شعیب احمد اور سارہ بیگم پر گھڑوں پانی پڑ گیا انہوں نے کبھی اپنے سر کو اتنا پشیمان نہیں دیکھا تھا جتنا آج اپنے میٹے کی وجہ سے انہیں دیکھا۔ خود وہ لوہابیہ کو دل سے چاہتی تھیں آخر انہوں نے اسے اسی گود میں پالا تھا بچپن ہی سے لوہابیہ کے لئے ان کی نظر میں بہو کا تصور تھا وہ بھی اسی محبت کے ساتھ اس بات کا برملا اظہار لوہابیہ سے کر چکی تھیں۔ کس طرح وہ لوہابیہ کا سامنا کریں گی.....؟ یہ سوچ سوچ کر وہ بھی پریشان تھیں۔

شرماتی تھی تو صرف اس لئے کہ میری نگاہوں میں اور دل میں اپنے اس رشتے کا احساس تھا۔ کاش زیان.....“ لوبابہ کی آنکھیں سوچ سوچ کر متورم ہو گئیں۔ پورا گھر زیان کے اس فیصلے سے ناخوش تھا کوئی بھی اس سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہا تھا عزیز اور زبیر نے بھی اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اب وہ مزید اپنی ضد اور انا پر اڑتا جا رہا تھا، سو سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا، لوبابہ کا بھی اس دن کے بعد اس سے سامنا نہ ہوا تھا۔

آخر کار زیان نے لوبابہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا، وہ گھر والوں کے رویے سے اکتا چکا تھا۔ دروازے کی دستک سن کر لوبابہ نے اپنی ڈائری بند کی۔ ”آجائے۔“ اندر آتا زیان، لوبابہ کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا اس چہرے پر سروسوں کی پیلاہٹ تھی وہ پریشان ہو گیا۔ ”کیا ہوا لا بو.....؟ میں بہت برا ہوں ناں.....؟“ میں نے تمہیں ہرٹ کیا، اچھا چھوڑو تم! مجھے یہ اپنی دوست کو پڑھواؤ تو۔“ زیان ہمیشہ اس کی ڈائری کو اس کی دوست کہا کرتا تھا اور لوبابہ کی عادت ہمیشہ ڈائری لکھنے کی تھی۔

”اس میں میری کتنی برائیاں ہیں میں دیکھوں تو ذرا۔“ لوبابہ نے فوراً ڈائری کو پیچھے کر لی اور بولی۔ ”نہیں زیان! نہ تم برے ہو اور نہ اس میں تمہاری برائیاں لکھی ہیں تمہیں تو پتہ ہے مجھے شاعری کا کتنا شوق ہے بس وہی پرانی غزلیں نکال کر پڑھتی رہتی ہوں۔“ زیان بس خاموشی سے اسے دیکھے گیا، اس کی براؤن آنکھوں میں جانے کیا تھا لوبابہ گھبرانے لگی۔

”کیا بات ہے زیان! تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو.....؟“ لوبابہ کی گھبراہٹ ہمیشہ زیان کو مزہ دیتی تھی لیکن آج اس کے سانولے چہرے پر پیلاہٹ اور بڑی بڑی کالی آنکھوں میں غمی دیکھ کر زیان کے دل کو کچھ ہونے لگا، اسے احساس ہوا کہ لوبابہ بہت شدت سے ہرٹ ہوئی ہے۔ اس کے لیے گھنے بالوں کی چوٹی جسے

وہ تین دن سے چھو بھی نہیں پائی تھی بری طرح کھر ہوئی تھی اس کا اجاڑ سراپا چیخ چیخ کر زیان کی محبت گواہی دے رہا تھا۔

”لا بو! ادھر بیٹھو میرے پاس۔“ زیان گھمبیر آواز میں بولا۔ لوبابہ بنا دیکھے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ ”ادھر دیکھو مجھے..... لا بو! ہم آج بھی دوست ہیں اور کل بھی رہیں گے یہ جو گھر میں لوگ ہیں میرے اور تمہارے چاہنے والے ان سب نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے ہمیں ہمارے حق سے محروم کر دیا ہے نہ اس معاملے میں میری رائے کو اہمیت دی اور نہ تمہاری سوچ بے فکر رہو میں نے اپنا فیصلہ انہیں سے لیا ہے اب تم میرے نام کے بندھن سے آزاد ہو۔“ لوبابہ نے ایک زخمی نگاہ زیان پر ڈالی۔

”چھوڑو یار! اب ان باتوں کو اب تمہاری بارش ہے ان لوگوں کو سمجھاؤ یہ میرے ساتھ تیسرے درجے کے سلوک کر رہے ہیں میں یہ زیادہ دن برداشت نہیں کر سکوں گا اب تمہاری دوستی کا امتحان ہے کہ مجھے ان لوگوں کی نظروں میں دوبارہ وہی زیان بنادو جیسا پہلے تھا۔“ زیان بولا تو لوبابہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ ”بھی اس کے چہرے پر لوبابہ کے لئے پشیمانی کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ الٹا اس کا انداز روٹھاپن تھا، لوبابہ کی جارہی تھی اس کے پل پل بدلتے انداز پر۔

”ٹھیک ہے زیان! میں سب سے بات کروں گی اب تم جاؤ۔“ لوبابہ یہ کہتے ہی رخ پھیر گئی۔ ”واہ لا بو! تھینک یو سوچ.....“ زیان نے بولے ہی لوبابہ کا رخ اپنی طرف کیا اور کہا۔

”بس اب یہ دوستی اور کی۔“ یہ کہتے ہی زیان ہنسنے لگا اور دو آنسو لوبابہ کے گالوں پر ڈھلک گئے۔

”لوبابہ نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے جودی۔“ صالحہ بیگم ہمیشہ جواد احمد کو جودی کہہ کر پکارتی تھیں۔

”ہاں..... تم ٹھیک کہہ رہی ہو بہت باہمت ہے ہماری لا بو۔“ جواد احمد بہت محبت سے بولے۔ ”کیوں نا ہم زبیر سے لوبابہ کی.....؟“ ادھوری بات کر کے صالحہ بیگم، جواد احمد کو دیکھنے لگیں، جواد احمد چونکے اور بولے۔

”لیکن صالحہ! اب میں کوئی فیصلہ لا بو سے پوچھنے بغیر نہیں کروں گا اور نہ ہی زبیر سے۔“

”ٹھیک ہے لوبابہ کی تعلیم مکمل ہوتے ہی ہم اس کا انتظام کرتے ہیں۔ پہلے مرضی آپ لا بو سے پوچھیں گے تاکہ اگر زبیر نے منع کر دیا تو کم سے کم اسے اپنے رنجیکٹ ہونے کا احساس تو نہیں رہے گا۔“ صالحہ بیگم بولیں تو جواد احمد سر ہلا کر رہ گئے۔ آہستہ آہستہ زندگی اپنی ڈگر پر آ رہی تھی، لیکن لوبابہ کی راتیں اب بھی زیان کی یاد سے جگمگاتی تھیں، جواد احمد نے لوبابہ کو بلایا۔

”بیٹا! میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں زبیر سے تمہاری بات.....“

”نہیں نانا نہیں پلیز..... اب اگر میں ٹوٹی تو پھر جڑ نہیں پاؤں گی پلیز اگر میں آپ کا بڑھاپا بنتی جا رہی ہوں تو پلیز مجھے باہر رخصت کر دیں، لیکن زبیر بھائی یا عزیز بھائی ان کے لئے تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی یہ رشتے میں زندگی بھر اپنی ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔“ لوبابہ جواد احمد کی بات کاٹ کر التجائیہ انداز میں بولی۔ صالحہ بیگم تڑپ گئیں اور انہوں نے مزید کچھ کہنے سے جواد احمد کو روک دیا، انہیں لگا کہ ہم نے پھر سے لوبابہ کے زخم اوھیر ڈیئے۔

ڈائری پڑھتے ہوئے ایک بار پھر لوبابہ کے آنسو چھلک گئے اسے احساس تھا کہ نانا نانا اس کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اس نے اپنا دکھ اپنے چہرے کی مسکراہٹ کے پیچھے دھکیل کر بہت حد تک سب کو مطمئن کر دیا تھا کیونکہ ان سب کی محبتوں کا قرض وہ اتارنا چاہتی تھی اس نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا لیکن

زیان تھا کہ جب بھی سامنے ہوتا کوئی نہ کوئی بات ایسی کر دیتا جس سے لوبابہ تڑپ ہی جاتی بلکہ اگر وہ اس دن کی بات نہ سنتی تو خوش فہمیوں کا شکار ہی رہتی لیکن زیان کے انداز مخاطب پر کوئی فرق نہ تھا وہ تو بلکہ اور زیادہ ہی لوبابہ کے آگے پیچھے رہنے لگا تھا۔

”زیان..... اب کیوں بہلانے کی کوشش کرتے ہو.....؟ سب کچھ تو ختم کر دیا اب کیا ہے مجھ میں بچا دوستی کا ایک بہتا دھارا بھی ہیں سب کچھ تم نے اپنے اس طوفان میں بہا دیا اب تو خالی اجڑا ہوا ساحل ہے اور پیچھے ان گنت یادیں۔“ لوبابہ شکستگی سے سوچ کر روتی چلی گئی۔ ”تم کیا جانو زیان..... بچپن سے اس بوند بوند محبت نے دریا بنا دیا ہے میرے اندر اب وہ سب ایک الاؤ کی طرح میرے اندر جل رہا ہے میں تو تمہیں کوئی بددعا بھی نہیں دے سکتی کیونکہ میں جانتی ہوں میری طرح سب کی تمہارے اندر جان ہے۔“

”دادو! آپ کا فون ہے۔“ زوبیہ نے جواد احمد کو فون دیا تو صالحہ بیگم بھی دیکھنے لگیں۔

”ارے زبیدہ تم.....؟“ جواد احمد کے چہرے کی خوشی اور لہجے کی کھٹک نے صالحہ بیگم کو چونکا دیا۔ ”جودی! مجھے فون دو۔“ ان کے بھی انگ انگ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جواد احمد نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا اور گھر کا ایڈریس سمجھانے لگے۔ دادو اور دانے گھر بھر کو ہلا کر رکھ دیا۔

کھانے سے لے کر گھر کی صفائی ستھرائی تک کے کام بہت خاص ہدایت پر ہو رہے تھے سب کو یہ تو پتہ تھا کہ یہ خاتون یقیناً کوئی خاص شخصیت ہیں اور یہ دادو اور دا کی دوست ہیں آخر کار دو دن بعد آنے والی شخصیت کے بارے میں جاننے کے لئے زیان، دادو اور دا کے پاس آ گیا، لوبابہ دا کے پاس بیٹھی بال سلجھا رہی تھی، زیان کو دیکھ کر ہاتھ رک گئے۔

”یار دا! یہ آخر ہیں کون محترمہ.....؟ اور آپ کو

جو اد صاحب رو پڑے۔ زبیدہ نے دونوں کو تسلی دی اور مایوں کی رسم کا سلسلہ شروع کرنے کو کہا۔ انس ان رسوں سے عدم دلچسپی کا اظہار کرتا رہا۔ ادھر زیان موقع پا کر لوبابہ کے پاس آ گیا اور بولا۔

”لا بوا! تم خوش تو ہو.....؟“ لوبابہ نظریں چرا گئی۔
”مجھے معلوم ہے لا بوا! تم خوش نہیں، تم چاہو تو یہ سب ابھی بھی رک سکتا ہے۔“ زیان اس کے سامنے آتے ہوئے بولا۔

”کیوں روکوں.....؟ اب اور کتنی ہمدردیاں مجھ سے کرو گے زیان! تم نے تو دوستی کا رشتہ بھی نہیں چھوڑا، اپنی کیئرنگ کو ہمدردی کا نام دے کر سب ختم کر دیا، میری ذات توڑ کر رکھ دی، مجھے منافق بننے پر مجبور کر دیا، کیوں کیا زیان تم نے ایسا.....؟ میں نہیں مان سکتی کہ وہ چاہت نہیں وہ ہمدردی تھی، میرا دل نہیں مانتا زیان! تمہاری آنکھیں کچھ کہتیں اور تمہارے لب کچھ اور کہہ رہے ہوتے ہیں میں تھک گئی ہوں تمہیں سمجھتے سمجھتے۔“ لوبابہ پھٹ ہی پڑی۔ آج اپنا ہر دکہ برداشت کرتے کرتے تھک سی گئی تو زیان پر یہ لاوا اگل ہی دیا۔
”آج سب کہہ دو لا بوا! پھر پتہ نہیں موقع ملے یا نہیں۔“ زیان نے غم آنکھوں سے کہا۔

”زیان پلیز..... کہہ دو وہ سب جھوٹ تھا، میں تمہارے لب و لہجے کی آگ میں اب تک جل رہی ہوں، میری روح کو قرار دے دو بول دو وہ سب مذاق تھا۔“ یہ کہتے ہوئے لوبابہ زیان کے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوڑ کر رو پڑی۔ جب خوب رولی تو زیان نے کہا۔
”اب بس کرو لا بوا! وہ سب مذاق نہیں تھا میں تمہیں آسروے میں رکھنا نہیں چاہتا، تم اپنی زندگی بہت ہی خوشی شروع کرو، بس اگر تم مجھ سے ذرا بھی پیار کرنی ہو تو اپنے آپ کو ہمیشہ خوش رکھنا، میں میری سب سے بڑی خواہش ہے اور ہو سکے تو اپنی اس دوست کو مجھے دے جانا۔“
زیان نے لوبابہ کی لکھی ڈائری کی طرف اشارہ کیا۔
”ہاں زیان! اس دوست کے تم ہی حقدار ہو لیکن

یہ ابھی تمہیں نہیں ملے گی جب میں اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک جاؤں گی تو یہ ڈائری تم تک پہنچ جائے گی شاید اس کو پڑھ کر تم میرے جذباتوں کی قدر کر سکو یا پھر میرے مرنے کے بعد یہ تمہیں.....“ زیان دہل ہی تو گیا اور لوبابہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
”بے وقوف لڑکی آئندہ ایسی بات نہ کرنا۔“ یہ کہتے ہی زیان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور لوبابہ حیرت سے اس کے پل پل بدلتے انداز کو سوچتی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆.....
ریڈ کلر کے شرارے میں بڑی بڑی سیاہ آنکھیں لئے لوبابہ ہرنی کی مانند سہمی ہوئی اپنے حسن سے سب کو حیران کر رہی تھی۔ زبیدہ تو اس کے روپ کے آگے کچھ بھی نہیں لگ رہی تھی۔ نکاح سے پہلے زیان اس سے ملنے کی غرض سے آیا تو اس کا آنکھیں خیرہ کرنے والا حسن دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ گول چہرے پر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور لب بھینچنے پر گال پر پڑتا ڈمپل اسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بنا رہا تھا۔ زیان کی آنکھوں میں کیا تھا لوبابہ زیادہ دیر اس کا سامنا نہیں کر پار ہی تھی۔

”لا بوا! میں تم سے بس ایک بات کہنے آیا ہوں۔ زندگی میں کبھی بھی جب صبر و برداشت ختم ہو یا اپنی پریشانی ہو جائے کہ کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آئے تو مجھے پکار لینا۔ نہ تو میں تمہیں پہلے تکلیف میں دیکھ سکتا تھا اور نہ آنے والے وقت میں دیکھ سکتا ہوں، اب چاہے تم اسے میری طرف سے ہمدردی کہو یا کیئرنگ جذبہ، میں ہر لمحہ تمہارے ساتھ ہوں۔“ اتنا سچا اور کھرا لہجہ لوبابہ پریشان کر گیا۔ زیان جانے کے لئے پلٹ گیا وہ دن دیر لوبابہ کو دہن بنے دیکھ نہیں پار رہا تھا۔ آج اسے اس کے کھونے کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ وہ آٹھ زیان کے گال پر پھیلے تو وہ رخ پھیر گیا کچھ دیر کے بعد رکا لوبابہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

زیان جا چکا تھا اور نہ جانے کب ساری

ہو میں لوبابہ کو کچھ خبر نہ رہی، مرضی میں نا تو اور ناتا کے گلے لگی لوبابہ سب کو رلا گئی، انس مرضی کے سنگ وہ ان کے ایک فلیٹ میں آ گئی یہاں پر استقبال کے لئے بھی کوئی نہ تھا۔ زبیدہ نے دروازہ کھول کر دونوں کو اندر بلایا اور انس کو کچھ ہدایات دیں اور بہت پیار سے لوبابہ کو انس کے روم میں لے آئیں جو کہ بہت معمولی انداز میں سجایا گیا تھا۔

بیڈ پر انتظار کرتے کرتے جب لوبابہ تھک گئی تو اس نے جائزہ لینا شروع کیا۔ روم میں بس ایک بینڈ ایک الماری اور ایک ٹی وی جو ٹرالی پر رکھا تھا، مناسب سے پردے اور نارمل سا کارپٹ، کہیں سے بھی لندن میں پلٹے بڑھنے والے شخص کے ذوق کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ دروازہ کھولنے کی آواز پر لوبابہ چونک کر سیدھی ہو گئی اور آنے والے شخص نے اسے اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے دیکھا تو قریب آیا اور کہا۔

”میں بہت تھک گیا ہوں مجھے ان مشرقی رسموں سے بہت وحشت ہوتی ہے لہذا آج کے دن مجھ سے کوئی امید نہ رکھیں اور آپ بھی چنچ کر کے آرام کر لیں ایک دو دن کی بات ہے پھر لندن جا کر جیسے آپ کی مرضی۔“ لوبابہ کو انس سے اس کی توقع نہیں تھی۔ لیکن اس نے بھی شکر کا سانس لیا اور اس شخص کی ابھتی شخصیت کو سوچ کر رہ گئی۔

☆.....☆.....☆.....
دوسرے دن زبیدہ خود ہی لوبابہ کو اس کے گھر لے گئی۔ چلتے وقت انس مرضی نے اسے ایک چین لاکٹ منہ دکھائی کے طور پر ہاتھ میں پکڑا دیا اور پھر لوبابہ چپ کی چادر اوڑھے اپنے گھر آ گئی۔ اس میں زیان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اور نہ ہی زیان گھر میں موجود تھا جبکہ لوبابہ کے برعکس زبیدہ شرمائی شرمائی سی بیٹھی تھی۔ ایک سے دو گھنٹے بعد یہ لوگ واپس اپنے فلیٹ میں آ گئے۔ گھر میں سب نے انس مرضی کی غیر موجودگی کو شدت سے محسوس کیا، جیسے تیسے ولیمہ ہوا اور

رواڈ انجسٹ 139 اکتوبر 2012ء

لوبابہ آخری ملاقات کے لئے اپنے گھر آئی کیونکہ اسے دوسرے دن لندن روانہ ہونا تھا۔ سب نے بہت محبت سے لوبابہ کو الوداع کہا لیکن لوبابہ کی نظریں زیان کو تلاش کر رہی تھیں اور زیان کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو اد احمد اور صالحہ بیگم نے زبیدہ کو پھر لوبابہ کا خیال رکھنے کی خاص ہدایات کیں جسے وہ بڑی خندہ پیشانی سے سختی رہیں۔

اپنے کمرے کی کھڑکی سے لوبابہ کو اپنا آپ ڈھونڈتا پا کر زیان کی برداشت کی ساری حدیں ختم ہو گئیں۔ وہ بلک بلک کر رو پڑا۔ زبیر لوبابہ کی ڈھونڈ لی نگاہوں کو محسوس کرتے ہوئے زیان کے روم کی طرف غصہ میں تیزی سے آیا تو دروازے پر ساکت ہو گیا۔ زیان کسی بچے کی مانند لوبابہ کی تصویر کو سینے سے لگا کر رو رہا تھا زبیر ایک لمحے میں اندر آ گیا۔ سناٹوں کی زد میں آیا زبیر سے زیان کی محبت چھپ نہیں پار ہی تھی، اس نے محبت اور جدائی کا عجیب کھیل دیکھا۔

”زیان.....“ زبیر نے زیان کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ زیان نظریں چرا گیا۔
”کیا بات ہے زیان! آج مجھے سچ سچ بتا دے میرے یار، تو کہیں اندر ہی اندر ختم کر رہا ہے اپنے آپ کو۔“ زبیر بولا۔
”کچھ نہیں وہ میرے بچپن کی ساتھی تھی نا اس لئے اس کی جدائی برداشت نہیں ہو پار ہی۔“ زیان نے جھوٹ بولنے کی ایک ناکام کوشش کی۔

”نہیں میں نہیں مانتا کہ یہ صرف دوستی ہو سکتی ہے اور تیرے بچپن سے آج تک لوبابہ کی اور تیری محبت کسی سے چھپی نہیں تھی، بتا کیوں تو نے اسے دکھوں کے کنویں میں دھکیل دیا؟ کیا ایسی مجبوری تھی تیری کہ روح کو جسم سے الگ کر دیا۔“ زبیر چیخ پڑا۔

”بتاؤں گا زبیر! زندگی کا ایک موڑ ایسا ضرور آئے گا کہ مجھے یہ بتانا پڑے گا لیکن ابھی نہیں وقت آنے پر اور ویسے بھی جب میں خود سے لڑتے لڑتے تھک جاؤں گا تو مجھے بھی ایک مہربان کاندھا چاہئے میرے دوست میں

رواڈ انجسٹ 139 اکتوبر 2012ء

تجھے ضرور بتاؤں گا گھر میں کوئی تو ہو جو مجھے سمجھے گا۔
زیان شکست خوردہ سا بولا۔ زیر نے اسے دیکھا اور کہا۔
”مجھے اس وقت کا انتظار رہے گا۔“

☆.....☆

لندن ایئر پورٹ پر پہنچ کر زبیدہ نے لوبابہ کو انس کے ساتھ اپنے فلیٹ بھیج دیا اور خود شام میں آنے کا کہہ کر دوسری سمت چلی گئیں۔ فلیٹ کی حالت دیکھنے کے قابل نہ تھی ہر چیز بے ترتیب پڑی تھی۔ لوبابہ نے سامان رکھتے ہی صفائی کا سلسلہ شروع کیا انس اسے دیکھتا رہا اور بولا۔
”کیا کوئی کسی کے لئے اتنا بوجھ بھی ہوتا ہے جو کسی کو بناء پر رکھے بنا دیکھے کسی کے بھی حوالے کر دے۔“
لوبابہ ناچنے کے عالم میں پلٹ کر انس کو دیکھنے لگی۔

”مجھے تم سے ہمدردی ہے اور چونکہ مام گھر پر نہیں اس لئے میں تمہیں ایک حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم میری طرف بڑھنے سے پہلے دس مرتبہ سوچ لو۔“ لوبابہ کو اس کی باتوں سے خوف آنے لگا۔

”دیکھو! مام جو کہ میری دادی وادی نہیں ہیں لیکن مجھے اتنا پتہ ہے کہ انہوں نے مجھے یتیم خانے سے لے کر پالا ہے انہوں نے یہ شادی اپنے لئے کی ہے میری اور ان کی ایک کمٹنٹ ہے تم سے شادی کے بعد وہ میری شادی میری پسند کی لڑکی جو پر یا سے کرائیں گی جو کہ ایک بارڈ انس ہے تمہارا میرا رشتہ محض دکھاوا ہے اور اب جیسا مام کہیں گی ویسا ہی کرنا میں تمہارے معاملات میں دخل نہیں دوں گا اور نہ ہی مجھ سے کسی مدد کی توقع رکھنا۔“
لوبابہ ہکا بکا کھڑی اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ لندن آتے ہی اتنی بڑی بات کی اسے توقع نہیں تھی۔ انس یہ کہہ کر چلا گیا اور لوبابہ پریشانی کے عالم میں فون ڈھونڈتی رہی لیکن نہ ہی سیل فون اور نہ ہی کوئی اور فون 4 کمرے کے فلیٹ میں تھا۔ لوبابہ بے بسی سے رو پڑی۔ اسے یہ فکر کھانے لگی کہ اگر نانا نانو کو پتہ چلے گا تو نہ جانے وہ کیسے برداشت کر سکیں گے۔

لوبابہ روتے روتے جانے کب تک کھلی تھی۔

کسی کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں گھبرا کر باہر بھاگی دیکھا کہ زبیدہ آنٹی صوفے پر بیٹھی تھیں اور انس مرتضیٰ بڑبڑا رہا تھا۔ لوبابہ ناچنے میں دروازے کی اوٹ میں ہو گئی اور وہ یہ منظر خوف زدہ سی دیکھنے لگی۔ انس بار بار ان سے کچھ مانگ رہا تھا اور وہ چیخنے لگتیں۔

”میرے پاس ابھی نہیں ہے۔“ لوبابہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اچانک انس نے چیزیں اٹھا کر پھینکنی شروع کر دیں اور وہ عجیب کیفیت میں ہوتا چلا گیا۔ خوف سے کانپتی ٹانگوں سے لوبابہ واش روم میں بند ہو گئی۔ بے آواز آنسوؤں سے سکنے لگی ہوش تو جب آیا جب واش روم کا دروازہ بے دردی سے پٹیا گیا۔ کھٹی کھٹی آواز میں لوبابہ نے پوچھا۔

”کون.....؟“ زبیدہ آنٹی چیخیں۔
”کھولو.....“ اس کے لئے زبیدہ آنٹی کا یہ روپ بالکل نیا تھا وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ اتنی محبت سے ملنے والی زبیدہ آنٹی اس طرح کی بھی ہو سکتی ہیں؟ ڈرتے ڈرتے لوبابہ باہر آئی تو زبیدہ آنٹی بولیں۔

”تمہاری ممانی کا فون ہے اور ہاں سنو یہاں کی کوئی خبر دی تو انجام کی تم ہی ذمہ دار ہو۔“ وہ کاٹ کھانے والی نظروں سے بولیں۔ لوبابہ سے بات کرنی مشکل ہو رہی تھی اور سارہ بیگم یہ سمجھتی رہیں کہ جدائی کے غم میں لوبابہ بات نہیں کر پارہی۔ بات ختم ہونے کے بعد زبیدہ آنٹی نے فون چھین لیا۔

انس بے سدھ صوفے پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔ لوبابہ اسے دیکھ کر وحشت ہونے لگی خوف سے وہ ابھی تک اندر ہی اندر کانپ رہی تھی پھر تو یہ ہر دوسرے دن کا معمول بن گیا کہ زبیدہ بیگم اسے طیش دلاتیں اور انس مرتضیٰ جاتا۔ ایک اچھائی انس مرتضیٰ میں یہ تھی کہ وہ اپنے زبیدہ آنٹی کے معاملے میں لوبابہ کو بیچ میں نہیں لانا تھا۔ چند دنوں تک لوبابہ کا گھر سے رابطہ رہا پھر آہستہ آہستہ زبیدہ آنٹی نے فون دینا بھی بند کر دیا اور سم چیخ کر لیں۔

ایک دن زبیدہ آنٹی لوبابہ کے پاس آئیں۔

بولیں۔

”آج تمہیں میرے ساتھ چرچ چلنا ہے۔“
لوبابہ کو حیرت کا جھٹکا لگا۔
”لیکن کیوں.....؟“

”اس لئے کہ ہم وہاں عبادت کرتے ہیں اب تمہیں بھی وہیں عبادت کرنی ہے ہماری طرح۔“ زبیدہ عیاری سے مسکرائیں۔

”لیکن ہم تو مسلمان ہیں۔“ لوبابہ کی حیرت ختم نہیں ہو رہی تھی۔

”ہم نہیں..... تم۔“ زبیدہ جما جما کر بولیں۔

”اور اب تم ہم میں آ گئی ہو لہذا جیسے ہم ہیں ویسی تم ہو جن کو ہم مانتے ہیں ان کو تم بھی مانو گی۔“ لوبابہ ان کی بات پر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا مطلب آنٹی آپ آپ.....؟“ لوبابہ کے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

”ہاں ہم عیسائی ہیں۔“ انہوں نے انکشاف کیا۔ لوبابہ کی اس انکشاف سے آنکھیں پھٹ گئیں۔

”لیکن آپ نے یہ بات شادی سے پہلے کیوں نہیں بتائی اور کیوں چھپایا سب سے.....؟“ لوبابہ چیخ پڑی۔

”مجھے اونچی آواز سننا پسند نہیں آج سے تم چرچ میں جا کر حلف لو گی۔“

”نہیں میں یہ نہیں کر سکتی مجھے سب برداشت ہے لیکن اپنے مذہب میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں۔“ اتنے عرصے سے لوبابہ نے پہلی بار ان سے بدتمیزی سے بات کی۔

”ٹھیک ہے پھر اس انکار کا انجام میں آج ہی تمہیں دکھائی ہوں۔“ زبیدہ آنٹی دھمکی آمیز لہجے میں بولیں۔ لوبابہ کے جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔

”نہ جانے یہ کیا کریں گی.....؟ یا اللہ! مجھے ثابت قدم رکھنا۔“ لوبابہ میں اپنے ساتھ اللہ کے ہونے کا احساس جاگ اٹھا اور وہ ثابت قدمی سے کھڑی ہو گئی۔

رات میں انس مرتضیٰ آیا تو حسب معمول زبیدہ آنٹی سے اس کی لڑائی شروع ہو گئی اس دوران لوبابہ اپنے آپ کو واش روم میں بند کر لیا کرتی تھی جب اسے محسوس ہوتا کہ سب نارمل ہو گیا ہے تو باہر آ جاتی آہستہ آہستہ معاملہ بڑھا تو زبیدہ آنٹی نے کہا۔

”میں نے تمہاری دوائیں لوبابہ کو سوپ دی ہیں آئندہ اس سے لے لیتا۔“ زبیدہ آنٹی کے کہنے پر لوبابہ ہکا بکا رہ گئی اس سے پہلے کہ وہ منع کرتی انس کے قدم لوبابہ کی سمت بڑھنے لگے اور وہ نشے میں دھت اپنی دیوالی میں اتنا پاگل ہو جاتا تھا کہ اسے کچھ ہوش نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ لوبابہ واش روم کی سمت بھاگی دیکھا کہ واش روم کا دروازہ لاک ہے لوبابہ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ جھنجھوڑ رہی تھی اور انس مرتضیٰ اس کے سر پر کھڑا تھا اور بولا۔

”دیکھو! میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے تم میرے بیچ میں نہیں آؤ۔“ زبیدہ آنٹی مسکراتی آنکھوں سے یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں اور لوبابہ پر خوف اتنا حاوی ہوا کہ پیلے رنگ کے ساتھ آواز بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور انس مرتضیٰ نے اسے کسی روٹی کی طرح دھن کر رکھ دیا۔

☆.....☆

زیان سوتے میں چونک کر اٹھا۔ اٹھتے ہی پہلا خیال لوبابہ کا آیا۔

”کیا بات ہے لاہو! کیوں پریشان ہو یا.....؟ کم از کم فون کر کے ہماری خیریت ہی معلوم کر لو۔“ زیان اس کی تصویر دیکھ کر بولا۔

”آج تم نے مجھے سوتے سے اٹھا دیا یا! خیر میں کل داسے کہہ کر تمہیں فون کرتا ہوں۔“ زیان نے اپنے آپ میں ایک بے چینی محسوس کی۔ ادھر زبیدہ آنٹی فون کر کے لوبابہ کی خیریت سے آگاہ کرتی رہیں اور کہا لوبابہ اور انس ہنی مون ٹرپ پر 3 مہینے کے لئے گئے ہیں اور جیسے ہی ان کی خیریت کے فون آئیں گے میں آپ لوگوں کو بتاتی رہوں گی لہذا گھر والوں نے بھی انہیں

ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

☆.....☆.....☆

دکھے جسم اور نیل پڑے چہرے کے ساتھ لوبابہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر پانی بھی پی لیتی۔

”نانو..... زبان.....“ خشک زبان سے وہ پکار اٹھی۔ جیسے جیسے آنکھ کھلتی جا رہی تھی وہ حقیقت کی دنیا میں لوٹ رہی تھی اسے سب یاد آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اپنے دکھ پر اس نے رونے کے ساتھ یہ بھی شکر بھیجا کہ اس نے ابھی تک اسے چھو نہیں تھا اور نہ ہی زبیدہ آنٹی کا ذہن اس طرف گیا تھا اب تو ساتھ ساتھ اسے اپنی عزت بھی بچانی تھی۔

”علم میں لائے بنا کسی نان مسلم سے شادی میں تسلیم نہیں کروں گی مجھے اپنے آپ کو ان لوگوں سے بچانا ہے مگر کیسے.....؟“ لوبابہ کی سوچ کی رفتار ہزار گنا تیز ہو گئی۔ اپنے دکھتے جسم کو گھسیٹتے ہوئے بمشکل لوبابہ فریج تک آئی اور اس میں سے پانی نکال کر پینے کو ہی تھی کہ زبیدہ آنٹی نے گلاس ہاتھ سے چھین لیا۔

”اب بتا لڑکی چرچ جائے گی یا نہیں؟“ زبیدہ آنٹی ہڈیانی انداز میں چیخیں۔

”نہیں میں نہیں جاؤں گی۔“ لوبابہ کمزور مگر پختہ آواز میں بولی۔

”ٹھیک ہے کل میں نے چند لوگوں کو دعوت پر بلایا ہے تجھے ان کے ساتھ رات گزرنی ہوگی۔“ زبیدہ آنٹی اتنا گرسکتی ہیں وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی یہ سنتے ہی لوبابہ کے جسم میں چیونٹیاں سی ریگنے لگیں۔ تڑپ کر زبیدہ آنٹی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”مجھے تمہیں ہر حال میں عیسائی بنانا ہے تاکہ تمہارے نانا کا گھمنڈ توڑ سکوں۔“ زبیدہ عیاری سے بولیں۔

”تمہارے پاس ایک گھنٹہ ہے تم سوچ لو۔“ زبیدہ کہہ کر چلی گئیں بمشکل لوبابہ انھی وضو کیا اور اپنے رب کے حضور میں سجدہ ریز ہو گئی۔ اپنے آپ کو بچانے کا کوئی

راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہت دیر بعد دل کو کچھ سوچ کر سکون ساملا اور اس نے زبیدہ آنٹی سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ چرچ جاؤں گی لیکن آپ مجھے آئندہ کسی کے سامنے پیش کرنے کی بات نہیں کریں گی۔“

☆.....☆.....☆

آج زیان صبح سے بے چین تھا اور لوبابہ کو بہت شدت سے یاد کر رہا تھا۔ جوں ہی وہ دادو سے لاہور کی خیریت معلوم کرنے گیا وہاں دادو کو فون پر روتے ہوئے دیکھا۔ صالحہ بیگم پریشان سی ان کی صورت تک رہی تھیں۔

”کیا بات ہے دادو.....؟“ زیان نے دادو کو جھنجھوڑا۔

”صالحہ اپنی لاہور.....“ یہ کہہ کر دادو روتے ہوئے چلے گئے۔ زیان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

”کیا ہوا لاہور کو.....؟“ دادو بولیں۔ زیان کے دیوانہ وار چیخنے پر گھر کے تمام افراد ہی دوڑے چلے آئے۔ دادو نے بتایا۔

”کچھ پتہ نہیں ابھی جس نے بھی فون کیا تھا صرف اس نے یہ بتایا ہے کہ لاہور وہاں کے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے اور وہاں اسے تشدد کے بعد ایڈمٹ کرانے کے بعد کسی خاتون نے آج کی فلائٹ کی ٹکٹ کنفرم کی ہیں اور یہاں کا ایڈریس ہاسپٹل والوں کو دیا ہے۔“

”لیکن اس پر تشدد کیا کس نے.....؟“ زوہب ماموں پریشانی سے بولے۔ صالحہ بیگم یہ سب سنتے ہی اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

ایمر جنسی میں انہیں کارڈیوشٹ کیا گیا جس کی وجہ سے بروقت ٹریسٹ نے صالحہ بیگم کو دل کے ایک سے بچالیا، لیکن انہیں کسی بھی خبر سے دور رکھنے کی انتہائی سختی سے تاکید کی گئی۔ گھر میں ”یا سلام“ کے ورد کا اہتمام کیا گیا اور سب دل سے لوبابہ کے لئے دعا گو تھے۔ گھر میں موت کا سنا سنا تھا۔ جواد احمد مرد تھے سبہ گئے۔

زبیدہ کو فون ملا ملا کر تھک گئے لیکن ان کا اور انس کا میل فون بند جاتا رہا۔ لوبابہ کو بے ہوش حالت میں لایا گیا فوری آغا خان ہاسپٹل شفٹ کیا گیا اس کے ہمراہ سامان بھی صرف اس کے ڈاکومنٹس اور اس کی ڈائری تھی وہ کپڑے بھی نہ جانے کتنے دن پرانے ملگجے سے پہنے ہوئے تھے لاہور کو دیکھ کر سب کو دھوکا لگا آنکھوں کے گرد کالے حلقے سو جی ہوئی آنکھیں، چہرے پر کھرجوں کے نشانات، ہاتھوں پر نیل کے نشانات اور ہونٹ جو کہ اوپر سے پھٹا ہوا تھا بالکل خشک سفید پڑا تھا۔ زیان اس کی یہ حالت دیکھ کر صدمے سے گنگ رہ گیا۔ سب کے الفاظ کم تھے ڈاکٹر نے کہا۔

”بے ہوش یہ تشدد سے نہیں خوف اور ڈپریشن سے ہوئی ہیں ان پر کسی نے تشدد کے ساتھ ذہنی طور پر ناچر کیا ہے جس کا اثر ان کے دل و دماغ پر گہرا پڑا ہے بہر حال اصل صورتحال ان کے ہوش میں آنے پر ہی پتہ چلے گی۔“ زیان نے اس کے سامان سے اس کی ڈائری خاموشی سے اٹھالی اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ جوں جوں زیان ڈائری پڑھتا گیا آنسوؤں میں ڈوبتا گیا۔ ڈائری میں شادی کے بعد کے دو تین دن خالی تھے پھر لندن جانے کے بعد کا احوال پڑھ کر زیان ٹھنک گیا۔

”نانو آپ کو اگر پتہ چلے کہ آپ کی پیاری دوست زبیدہ آنٹی یہاں آ کر کتنی بدل گئیں تو شاید آپ کو یقین نہیں آئے میں ان کی اصلیت بتا کر آپ کے اور نانا کے یقین کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی۔“

”آپ لوگوں کا فون تھا اور میرے سر پر زبیدہ آنٹی سوار تھیں میں آپ لوگوں سے کچھ کہہ بھی نہیں پارہی تھی میں کیا کرتی مجھے ان سے ڈر لگ رہا تھا عجیب گھر کا مشت زدہ ماحول تھا بکھرا بکھرا سا اجڑا اجڑا سا۔“

”آج پھر انس مرتضیٰ کو دورہ پڑا اور یہ سب زبیدہ آنٹی کی وجہ سے ہوتا ہے وہ انہیں طیش کی بلندیوں اور کسی آخری حدود پر لے جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ بھول جاتا ہے اور پھر اس کو نہ جانے کیا ہوتا ہے کہ

اس کا چہرہ عجیب کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تکلیف زدہ سا، لیکن مجھ سے نہیں دیکھا جاتا میں اپنے آپ کو واش روم میں بند کر لیتی ہوں۔“

ڈائری میں لوبابہ کے ساتھ گزرے ہوئے سارے دنوں کی کہانی لکھی ہوئی تھی وہ ورق پلٹتا گیا اور حقیقت اس پر کھلتی گئی۔

”نانو! آج زبیدہ آنٹی پھر مجبور کر رہی ہیں مجھے کر سچن کرنے پر میں نے پھر منع کر دیا ہے لیکن پھر انہوں نے ایسی بات بولی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے میں تھال میں کسی مردوں کے آگے پیش ہونے والی تھی جو کہ مجھے منظور نہیں تھا سو میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ان کو حامی دے دی لیکن دل سے نہیں خالی زبان سے بھلا میں اپنے اللہ اور پیارے نبی سے کیسے منکر ہو سکتی ہوں مجھے بس اپنی عزت بچانی تھی۔“

”نانو! آج میں کر سچن کی حلف برداری کے لئے زبیدہ آنٹی کے گھر سے چرچ تک پہلی بار باہر نکلی اور پھر چرچ پہنچ کر حلف برداری شروع ہوئی مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کیا کہا بس میں اتنا جانتی ہوں کہ میں بند آنکھوں سے روضہ مبارک اور خانہ کعبہ کا تصور کئے ہوئے اپنے رب کے حضور حاضر تھی آنکھ تو جب کھلی جب زبیدہ آنٹی نے جلنے کے لئے کہا اور گھر آ کر وہ بہت ہنسی بھی اور روئیں بھی میں تو زندہ لاش بنی ان کا تماشہ دیکھ رہی تھی اور پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں جو دی اور صالحہ کو پہلے دن سے آج تک کی تمام باتیں بتاؤں جسے سن کر جو دی اور صالحہ کی پریشانی میرے لئے تسکین کا باعث ہے میں بھلا کیوں اپنے نانا نانو کو تکلیف دیتی سو میں نے انہیں منع کر دیا کہ میں گھر میں کچھ نہیں بتاؤں گی جس پر انہوں نے مجھے پلٹ سے مارا اور جب میں گری تو میرے ہاتھ کی انگلیاں وہ اپنے سینڈل تلے روند کر چلی گئیں۔“

”زیان! دیکھو میں اپنی تکلیفوں میں تمہیں بھی بھول گئی ہوں دن بعد لکھ رہی ہوں کیونکہ اس دن کے

بعد میرا ہاتھ نیلا پڑ گیا تھا میں نے ڈائری لکھنے کی کوشش بھی کی تو نہیں لکھ سکی دو دن بعد ہاتھ میں بہت تکلیف بڑھ گئی تھی اب بہتر ہے۔ زیان! اب تم بھی شادی کرلو میں تو شادی کے بعد زندگی کی حقیقت سے آشنا ہوگئی۔

”نانو! اب تک میں چھپ کر نماز پڑھ رہی تھی لیکن کل زبیدہ آتی نے مجھے تجھ پڑھتے ہوئے دیکھ لیا اور میری نماز توڑ کر مجھے بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا۔“

”سچ نانو! مجھے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ اس طرح پکڑی جاؤں گی انہوں نے مجھے کہا کہ تو واقعی صالحہ کی تو اسی نکلی بہت صبر و شکر والی لیکن میں اس دفعہ تیری نہیں چلنے دوں گی اس کے بعد جو ان کا بس چلا انہوں نے کیا اور وہ بے بھی اب تو میں عادی ہوگئی اس مار پیٹ کی اب مجھے کوئی خوف آتا اور نہ ہی کوئی درد ہوتا ہے۔“

”سوری زیان! بہت مجبور ہو کر اپنی دوست کو میں نے پھر ایک دفعہ سہارا بنایا ہے ایک ایسا سچ اس عورت نے اگلا ہے کہ اس نے اپنے 40 سال کا انتقام مجھ سے ان 4 مہینوں میں پورا کر لیا ہے آج میں جیت گئی اور یہ عورت 40 سال بعد بھی شکست کا ہار گلے میں پہنے ہوئے ہے۔“

”زیان آج میں ایسی کہانی تمہیں سنارہی ہوں جسے سن کر تم حیران کیا پریشان ہو جاؤ گے جواد اور زبیدہ ایک کالج فرینڈ تھے زبیدہ مطلب (زبل رابرٹ) جس نے نہایت عیاری سے اپنی شجر سے اسلام سے محبت دکھا کر زبیدہ کے نام سے کال کرنے کی ریکورڈ کی جسے پورا کر لیا گیا۔ جواد احمد کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ ان کے ساتھ ایک کرچن لڑکی دوست کی حیثیت سے ہے پھر ایک نوائڈ مشن لڑکی صالحہ جاوید کالج میں آئیں اس کی باتوں سے ہی نہیں اس کی آنکھوں سے بھی ذہانت چھلکتی تھی اور ذہانت جواد احمد کو بہت اثر رکھتی تھی جواد کی فرمائش پر زبیدہ نے اسے اپنا اور جواد کا دوست بنایا چونکہ جواد اس سے متاثر تھے لہذا ان کی ہر بات پر جواد اسے سراہتے بھی تھے چونکہ زبیدہ کرچن میں بظاہر اسلامیات جیسے سبکیٹ وہ دنیا دکھاوے کو پڑھتی تھیں

اس میں اس کی معلومات صرف تھی جبکہ صالحہ مذہبی ماحول سے تعلق رکھتی تھیں جس کی وجہ سے اسے معلومات بھی بہت تھیں اکثر دونوں میں مذہبی بحث و مباحثہ چھڑ جاتا اور زبیدہ بیٹھ کر شکل دیکھتی رہتی بھی لقمہ دینے کی کوشش کرتیں تو جواد اسے یہ کہہ کر چپ کر دیتا کہ کبھی نہ ڈھنگ سے پڑھی ہو تو پتہ چلے۔ اندر ہی اندر زبیدہ صالحہ سے جیسے رہنے لگیں لیکن بھی ظاہر نہیں کرتیں اس طرح سے دن گزرتے گئے۔ اور فائل ایئر بھی ہوگئی ادھر زبیدہ جواد احمد کی محبت میں پور پور ڈوب گئیں اس نے مسلمان ہونے کا سوچ لیا ادھر رابرٹ صاحب کو پتہ چلا کہ ان کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کیا کرنے جارہی ہے تو انہیں یہ برداشت نہ ہو سکا اور ان کو ہارٹ ایک ہو گیا اکیلی ہونے کی وجہ سے زبیدہ کو اس کے چچا کے گھر لے گئے کچھ دن تو انہوں نے زبیدہ کی دیکھ بھال کی پھر انہیں زبیدہ کی ایکٹیوٹیٹ کا علم ہوا کہ زبیدہ اسلام میں دلچسپی لے رہی ہے تو انہوں نے اس پر سختی شروع کر دی اور اس کی شادی اپنے معذور بیٹے سے کرنا چاہی۔ ان تمام ٹینشن کے دوران ایک دن زبیدہ خواب میں جوادی اور اپنی دوستی ٹوٹتے ہوئے دیکھی تڑپ گئی اور کسی طرح جھپٹے چھپاتے فون کیا تو پتہ چلا کہ صالحہ اور جوادی کی ملگنی ہو رہی ہے زبیدہ یہ سب برداشت کرتیں جس کی خاطر وہ یہ سب کر رہی ہیں کسی اور کا ہو رہا ہے۔ سنتے ہی رو پڑیں صالحہ جوادی ان کے رونے کو خواب کی وجہ یا ملگنی میں شریک ہونے کی وجہ سمجھی۔ آخر کار اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے زبیدہ آتی نے اپنے معذور کزن سے شادی کر لی اور جواد احمد کو اپنی اس خراب زندگی کا مورد الزام ٹھہرا دیا اس دن سے آج تک وہ اس الاؤ میں دھک رہی تھیں مجھ پر آ کر بھڑھاتا تھا۔ کیا محبت آخر میں جا کر ایسا ہو سکتی ہے محبت کے اس روپ نے مجھے اندر تک ہلا کر رکھ دیا ہے پھر آخری وار انہوں نے مجھ پر یہ کہ واقعی کاری نہ ب دے گیا مجھ سے میری

دوست چھین لینے کا جو میرے میکے سے آج تک میرے ساتھ ہے جو میرے یہاں رہنے کا میری ہر اذیت کا حساب اپنے اندر سموتی ہے میں اس سے کیسے دور جا سکتی ہوں.....؟“

”آج اس مرتضیٰ بھی زبیدہ آنٹی کو دھتکار کر اپنی اس بارڈ انسر کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چلا گیا اور مجھے بھی اس جھوٹے بندھن سے آزاد کر گیا آج زبیدہ آنٹی جنہوں نے اسے یتیم خانے سے 30 سال پہلے لے کر پالا تھا آج اس کے چلے جانے سے ٹوٹ گئیں ہیں اور انہوں نے اپنا سارا حساب کتاب ایک بار پھر میرے کھاتے میں ڈال دیا ہے اور مجھ سے میری دوست کو چھین لیا ہے۔“

”آج کا یا پلٹ ہوگئی وہ اپنا نفسیاتی پن مجھ پر نکال نکال کر تھک گئی ہیں اور آج انہوں نے مجھ سے کل کی ماری معافی بھی مانگی اور مجھے یہاں سے چلے جانے کو کہا آخر میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے ساری حقیقت تمہارے گھر والوں کو بتا دی ہے جسے سن کر میرا دل و دماغ منجمد ہو گیا ہے۔ یا اللہ میرا صدمہ میرے نانا نانو کو برداشت کرنے کی ہمت دے لیکن میں بہت پریشان ہوگئی اس بات سے اور آج جب مجھے میری ڈائری انہوں نے واپس کی تو اس میں نانا اور نانو کے نام ایک لیٹر بھی ہے لیکن میں کیسے واپس جاؤں.....؟ کیسے سب کچھ ٹھیک ہوگا کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“

”زیان! میں دو دن سے نہیں سوئی پلیز کوئی مجھے اس وقتی پریشانی سے نکال دو آ جاؤ زیان آ جاؤ میں اندر سے مر گئی ہوں۔“ زیان کی ڈائری پڑھتے پڑھتے ضبط کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں اور وہ بھاگتا ہوا دادو کے پاس جا پہنچا اور انہیں وہ ڈائری اور وہ لیٹر جو زبیدہ آتی نے لکھا تھا دے دیا اور کہا۔

”دادو! لاہو اندر سے مر گئی ہے میں اسے زندہ کروں گا اس کا ہر دکہ خوشی میں بدل دوں گا وہ میرے لئے جینے کی صرف میرے لئے لاہو نے میرے جسے سکائے بھی اپنے پاؤں میں چھو لئے ہیں وہ کسی زخم

کی مانند رس رہی ہے اسے بچالیں دادو۔“ زیان دادو کی گود میں سر رکھ کر رو پڑا اور اس سے زیادہ محبت کا ثبوت جواد احمد کو کیا ملتا۔ جواد احمد نے کانپتے ہاتھوں سے خط کھولا اور پڑھنے لگے۔

”جواد اور صالحہ: ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا میں نے اپنی زندگی بھر کے بدلے کی آگ کے لئے تمہاری سب سے عزیز از جان لاڈلی نواسی کا انتخاب صرف اپنے آپ کو پر سکون کرنے کے لئے کیا لیکن کیا صالحہ کی صبر و قناعت ہوگی اور کیا تمہاری ہر بات کو اکتور کرنے کی صلاحیت ہوگی جو اس لڑکی میں ہزار گنا موجود ہے میں تھک گئی ہوں اسے مار چ کر کر کے لیکن جوں جوں میں اسے اذیت دیتی یہ الٹا مجھے اپنی خاموشی سے مار چ کر جاتی آج میں ہار گئی سب کچھ اپنی دوستی اپنے ہاتھوں سے پالا ہوا بیٹا اپنا مذہب اور اپنا آپ تم لاہو کی ڈائری پڑھو گے تو تمہیں ساری حقیقت کا پتہ چل جائے گی لیکن میں اس 20 سالہ لڑکی کے ہاتھوں آج سچ سمت چل پڑی ہوں اور میں اپنے خدا سے سچے دل سے معافی مانگ کر مسلمان ہو رہی ہوں تمہاری وجہ سے نہیں صرف اپنی آخرت بچانے کے لئے ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا بھی نہ ملنے والی تمہاری بد نصیب دوست زبیدہ۔“

دادو یہ خط پڑھ کر کانپ گئے۔

”تو یہ سب زبیدہ نے.....؟“ ایک بار پھر فیصلے کی سیاسی لوہا بہ پر گر گئی۔

”یہ کیا کیا میں نے.....؟ دوستی کے اعتبار میں جھونک دیا اپنی بیٹی کو۔“ جواد احمد رو پڑے۔ ہاسپٹل سے لوہا بہ کے ہوش میں آنے کی اطلاع آئی تو سب دوڑ پڑے لیکن زیان نہ جاسکا۔

”میں کیسے سامتا کروں گا لاہو کا یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے میں زندگی بھر کی محرومی دے دیتا لیکن اسے ظلم کی بجائی میں نہیں چھوڑتا۔“ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ زبیر آ گیا۔

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ

آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ

لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

”زیان کیا ہسپتال نہیں چلنا۔“ زیر نے حیرت سے اس کے روتے چہرے کو دیکھا۔

”نہیں میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس کے کسی قابل نہیں ہوں۔“ زیان مایوسی سے بولا۔

”یار! آج مجھے بتا کیا بات ہے جو تجھے اندر ہی اندر کھا رہی ہے.....؟“ زیر نے پر زور اصرار کیا۔

”ہاں زیر! تو سن میری حقیقت، جب میں باہر سے پڑھ کر آیا تھا ناں اس دوران کینیڈا کی ایک جاب آئی تھی جس میں میں نے سب سے پوچھے بغیر اپلائی کر دیا اور چونکہ میں پاپا کے بزنس میں نہیں لگنا چاہتا تھا

کچھ الگ کرنے کے خیال سے وہ جاب کی انٹرویو کال بھی میرے پاس آگئی اور میں سلیکٹ بھی ہو گیا، یہ سب میں اس لئے کرتا جا رہا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ

بعد میں سب مان جائیں گے اور پھر ان لوگوں نے میڈیکل مانگا جب میں نے میڈیکل رپورٹ دیکھی تو

میں ڈس اہل تھا۔ یہی بات مجھے لا بو سے دور لے گئی کیونکہ اس کی بچوں میں جان تھی، بس یہی سوچ کر میں نے اس دن جان بوجھ کر لا بو اور داد کو وہ باتیں سنائیں

تھیں۔“ زیر یہ سن کر تشویش میں آ گیا اور کہا۔

”ٹھیک ہے تیرا ریزن بالکل جائز تھا لیکن تو نے اس رپورٹ کو کسی اور ڈاکٹر کو بھی دکھایا یا نہیں۔“

”کیا فائدہ بار بار زخم کھرنے سے۔“

”لیکن یار! مجھے وہ رپورٹ دے میں اسے کسی اسپیشلسٹ کو دکھا کر مشورہ لوں گا۔“ زیر نے کہا تو زیان

وہ رپورٹ لے کر آ گیا، جوں ہی انولپ سے رپورٹ نکالی محیط شاہ نام دیکھ کر چونک گیا۔

”یہ یہ.....؟“ رپورٹ پر نام کی جگہ زیان کی بجائے محیط شاہ نام دیکھ کر زیان بھی اچھل پڑا اور اس کے ہاتھوں سے چھین کر بار بار پڑھا اور اپنی عقل پر ماتم کرنے بیٹھنے ہی والا تھا کہ زیر نے اسے کانوں سے

پکڑ لیا اور بولا۔

”گدے تو کینیڈا میں جاب کرنے جا رہا تھا تو تجھے

رہا ڈائجسٹ 146 اکتوبر 2012ء

یہ علم بھی ہونا چاہئے کہ رپورٹ ہاتھ میں آنے سے پہلے نام پڑھا جاتا ہے تیری اس بے وقوفی نے لا بو کی زندگی تباہ کر دی، اب چل کر اس سے معافی مانگ اور اسے اپنا۔“ زیان خوشی سے اٹھا دونوں ہسپتال جا پہنچے۔

☆.....☆.....☆

لو بابہ منتظر نظروں سے اسے تلاش کر رہی تھی وہاں جا کر زیر نے زیان کی حقیقت سب کو بتائی اور زیان نے

جھکائے سب سے لعنت ملا مت ستارہ لا بو کی زبانی یہ چلا کہ ڈائری لکھتے لکھتے چکرا کر گر پڑی تھی کیونکہ وہ دن سے سوئی نہیں تھی۔ زبیدہ آنٹی اپنے کئے پر شرمندہ

تھیں اس لئے انہوں نے ہی لو بابہ کو ہسپتال پہنچایا تھا سب نے لو بابہ کی جان بخشی پر اپنے رب کا شکر ادا کیا اور

دادو نے کان سے پکڑ کر زیان کو اس کے آگے کر دیا۔

”اب سزا کے طور پر اسے زندگی بھر اپنے ساتھ باندھ کر رکھو۔“ سب ہنس دیئے اور اسے لو بابہ کے پاس

جان بوجھ کر تنہا چھوڑ گئے۔

”لا بو! مجھے معاف کر دو یہ سب میری وجہ سے ہے۔“ وہ لو بابہ کا ہاتھ پکڑ کر شرمندگی سے بولا۔

”نہیں زیان! میں تو خوش نصیب ہوں کوئی 40 سال کی ریاضت اور اذیت کے بعد بھی تمام

رشتوں کے معاملے میں خالی ہاتھ ہے اور میں جس اذیت کی مدت صرف چھ مہینے تھی آج بھی سب

محبتوں اور چاہتوں کے ساتھ موجود ہوں یہ محبت ہی تھی جس نے مجھے وہاں کبھی تنہا نہیں ہونے دیا اور

محبت ہی ہے جس نے زبیدہ آنٹی جیسی عورت مسلمان اور انسان بنادیا، اسی محبت کے طفیل میں

کے ساتھ موجود ہوں، زیان اب مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا

ورنہ میں جی نہیں پاؤں گی۔“ لا بو کی زبان سے الفاظ اور آنسو دیکھ کر زیان تڑپ گیا اور اس نے لا بو کے ہاتھوں کو لبوں سے لگا کر چوم لیا لو بابہ کی

تک اندر سے سرشار ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

سعدیہ عابد

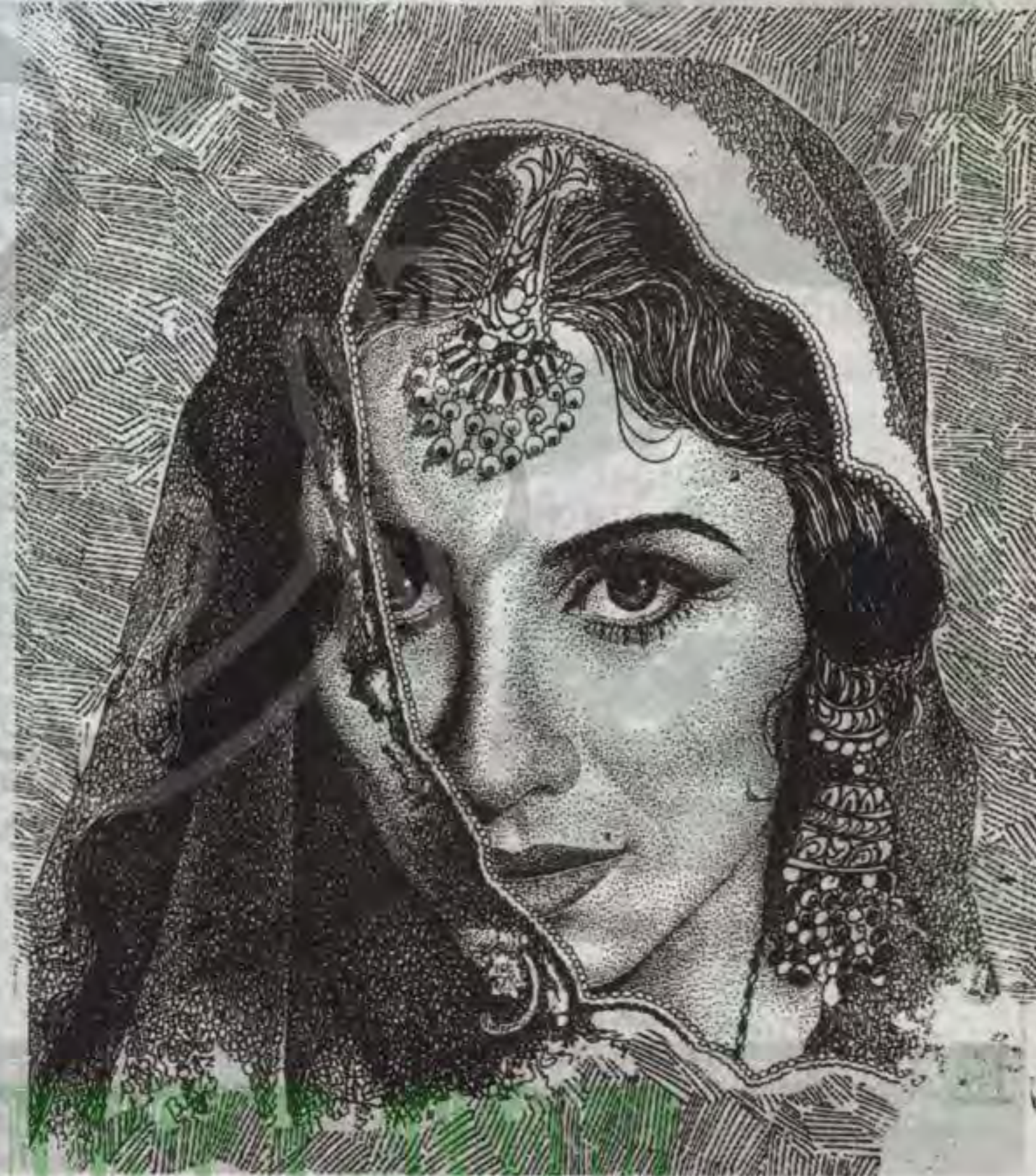
قسط نمبر 2۔

سلسلے وار ناول

بشرِ قبا کھلنے لگی جانا

”وعلیکم السلام بیٹا! جیتے رہو، آج اُنھنے میں بہت دیر کر دی؟“ اُس کے ذرا سا جھکنے پر اُنہوں نے بیٹے کے سر پر ہاتھ

رکھا تھا۔



”بس ماما! آج مجھے کچھ لیٹ جانا تھا، ناشتے میں کیا ہے؟ سخت بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ سیدھا ہوتا ہوا مسکرایا تھا، وہ صبح جلدی اُنھنے کا عادی تھا، مگر پچھلے 2 ماہ سے اس کی روٹین اتنی ٹف ہو گئی تھی کہ حد نہیں، رات دیر تک سونا اور صبح جلدی اُنھنا، آج موقع ملا تھا تو وہ دن چڑھے تک سوتا رہا تھا، اُسے ایک کیس کے سلسلے میں 2 بجے تک پولیس اسٹیشن پہنچنا تھا، اس لیے اس نے ساڑھے 12 کا الارم لگایا تھا تا کہ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر آرام سے وہاں پہنچ جائے۔

”ماندہ بیٹا! پہلے بھائی کے لیے ناشتہ بنادو، دوپہر کے کھانے کی تیاری بعد میں کر لینا۔“ انہوں نے ماندہ کو بلا کر کہا تھا اور وہ دونوں ڈائننگ ہال میں ہی بیٹھ گئے تھے، ماندہ نے پہلے اس کے لیے چائے بنائی تھی اور اسے دے کر وہ پراٹھا بنانے لگی تھی، کیونکہ ارجم سلاکس اور پاپے وغیرہ نہیں کھاتا تھا۔

”ارجم! تمہیں جیسے فراغت ملے اپنے ماموں کے گھر کا چکر ضرور لگا لینا۔“

”آج تو ممکن نہیں ہے، کل کوشش کروں گا، ویسے کیا کوئی خاص بات ہے؟“

”ہاں خاص بات تو ہے، پچھلے کچھ ہفتوں سے تم اتنے مصروف رہے کہ میں تمہیں کچھ بتا ہی نہیں سکی اور جو کچھ بھی ہوا



بہت جلدی میں ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ فریدہ اس کو اب کیا بتانے لگی ہیں، مگر اس نے ظاہر نہیں کیا تھا کیونکہ وہ ماں کو ٹوکنا نہیں چاہتا تھا۔

”فضیل کا زرین کے لیے مہوش نے رشتہ ڈالا تھا، فضیل گھر کا ہی دیکھا بھالا بچہ ہے، بھائی صاحب نے فضول کے جھنجھٹوں میں پڑنے سے بہتر مثبت جواب دے دیا۔“

”یہ تو اچھی بات ہے ماما! اور ویسے بھی فضیل، زرین کو پسند کرتا ہے، اچھا ہی ہے دونوں کی شادی ہو جائے۔“

”تم نے مجھے پہلے کبھی نہیں بتایا کہ فضیل، زرین کو پسند کرتا ہے، تو تم نے اسی لیے زرین سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا؟“

”ماما! مجھے لگتا تو تھا کہ فضیل انٹرنیٹ ہے زرین میں اور میں نے کبھی زرین کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا، اس لیے منع کیا تھا، فضیل کا ذکر میں نے اس لیے نہیں کیا تھا کہ میں چاہتا تھا کہ فضیل اپنے دل میں زرین کے لیے سو فٹ کا زر رکھتا ہے تو خود ظاہر کرے، خیر! ان باتوں کو رہنے ہی دیجئے اور یہ بتائیے کہ شادی کا کب تک ارادہ ہے؟“

”مہوش کے بھائی کی طبیعت خراب ہے، انہیں بلڈ کیسرس ہے، اس لیے وہ لوگ اسی ماہ شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔“

”رات کو ہی تو میری فضیل سے بات ہوئی ہے، وہ تو 3 ماہ بعد شادی کا کہہ رہا تھا۔“ اتنی جلدی کا سن کر وہ بے حد حیران ہوا تھا۔

”مہوش چاہ رہی ہے کہ دونوں بیٹوں کی شادی ساتھ ہی کر دے، کیونکہ فیاض بھائی کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں رہتی اور جب فیصل کی ہو ہی رہی ہے تو فضیل کی بھی ساتھ ہی ہو جائے اور ویسے بھی فیاض بھائی سادگی کو پسند کرتے ہیں، شادی ابھی ہوگی یا سال بعد، ہوگی تو سادگی سے ہی، کیونکہ فیاض بھائی مہندی وغیرہ جیسی رسموں کے سخت خلاف ہیں، اس لیے میں نے بھابی بیگم سے بات تو کی ہے، دیکھو بھائی صاحب کا کیا فیصلہ ہوتا ہے۔“

”اور آپ نے مائدہ کی اور راحم کی شادی کب تک کرنے کا سوچا ہے؟“ مائدہ ابھی اس کا ناشتہ رکھنے آئی تھی تو اسے خیال آیا تھا اور اس کے جاتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

”منگنی کے وقت تو یہی طے ہوا تھا کہ سال، چھ مہینے میں مائدہ اور اسجد کی شادی ہوگی، اور راحم و شازمین کی زرین کے ساتھ ہوگی، زرین کی ابھی شادی ہو جاتی ہے تو 6، 7 ماہ بعد ان بچوں کی بھی شادی کر دیں گے، تم اپنی بتاؤ، تمہارا اپنا کب تک شادی کرنے کا ارادہ ہے؟“ وہ بیٹے کے لیے گلاس میں جوس نکالتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھیں، وہ جو ناشتہ کرتے ہوئے غور سے انہیں سن رہا تھا، محض مسکرا دیا تھا۔

”ماما! صرف 4 سال دے دیں، 4 سال بعد جس سے کہیں گی، شادی کر لوں گا۔“

”راحم 4 سال بہت ہوتے ہیں، 6، 7 ماہ میں راحم کی شادی کر دی تو اس کے بچے جب تک کتنے بڑے ہو جائیں گے۔“

”اچھا ہے ماما! راحم کی شادی کر کے بہولانے کا خواب پورا کریں اور اس کے بچوں کو کھلا کر دادی بننے کا۔“

”اور تمہیں یونہی تمہارے حال پر چھوڑ دوں؟“ وہ خفا ہوئی تھیں۔

”ماما! مجبوری ہے ناں، سمجھا کریں۔“

”کیا سمجھوں؟ 4 سال بعد پتہ ہے کتنے برس کے ہو جاؤ گے؟ پورے 32 کے۔ اور بڑھے کو لڑکی کون دے گا؟“ ان کی ناراضی بڑھتی جا رہی تھی۔

”ماما! 32 سال کی عمر میں کوئی بڑھا نہیں ہو جاتا، اور میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ 4 سال بعد ہی شادی کروں گا، میں تو

بس ٹائم مانگ رہا ہوں، لیٹ ہو جاؤں گا تو شادی کر لوں گا، ابھی آپ خود بتائیں، کتنے کتنے دن میں آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھ نہیں پاتا، میرے کھانے کی، آنے جانے کی بھی کوئی ٹائمنگ نہیں ہے، میری بیوی لے آئیں گی تو میری اس ٹھٹھ لائف سے وہ بے چاری کیسے کپڑا مارتا کرے گی؟ مجھے ابھی سیٹ ہو جانے دیجئے، پھر کر لوں گا شادی۔“ اس نے نرمی سے کہتے ہوئے آہستگی سے ماں کے کاندھے پر دباؤ ڈالا تھا۔

”یہی بات ہے یا کسی لڑکی کا چکر ہے؟“

”خدا کو مانیں ماما! ایسی کوئی بات نہیں ہے، باخدا کوئی لڑکی دل و نگاہ کو اچھی لگی تو ضرور بتاؤں گا، ورنہ آپ کی پسند کی لڑکی سے شادی کر لوں گا، ابھی آپ مائدہ اور راحم کی شادی کی تیاریاں کریں اور مجھے اجازت دیں، مجھے 2 بجے لازمی پہنچنا ہے اور ابھی مجھے تیار بھی ہونا ہے، ویسے یہ پاپا کہاں ہیں؟ دکھائی نہیں دیئے۔“ نکلتے ہوئے خیال آیا تو پوچھا تھا۔

”اپنے کسی دوست کی طرف گئے ہوئے ہیں، تم جانے کی تیاری کرو جا کر، اور پلیز یاد سے ماموں کے ہاں چکر لگالینا، بھائی صاحب تمہیں یاد کر رہے ہیں۔“ بیٹے کو ہدایت کی تھی۔

”اوکے ماما! ٹائم نہیں نکال سکا تو فون پر ان سے بات کر لوں گا۔“ وہ کہتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

”مائدہ بیٹا! یہ برتن اٹھاؤ، میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں، نماز پڑھ کر کچھ دیر آرام کروں گی۔“

”ماما! کھانا نہیں کھائیں گی؟“

”ڈھائی بجے تک راحم نے آنے کا کہا تھا، ساتھ ہی کھالوں گی، تم کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کر لینا، صحت کا خیال رکھا کرو بیٹا!۔“ وہ اس کا گال تھپتھا کر بہت پیار سے کہتی اپنے روم میں آ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟“ وہ عموماً ایک ہی ریٹورنٹ میں جاتے تھے، اس لیے وہ راستہ دیکھ کر بولی۔

”اغواء کر کے لے جا رہا ہوں۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولا تھا اور اس کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

”آپ.... آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟“

”ہوں.... تم میری محبت میں جان دے سکتی ہو، تو کیا تمہاری محبت میں، میں اتنا سا بھی نہیں کر سکتا؟“ مہارت سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس کے حواس باختہ آنسوؤں سے تر چہرے پر نظر ڈالی تھی، مستقل رونے سے آنکھیں سو جی ہوئی اور ناک سرخ ہو گئی تھی جبکہ آنکھوں کا کا جل بھی پھیل گیا تھا۔

”آپ مجھ سے محبت ہی کب کرتے ہیں؟“

”محبت نہیں کرتا، اسی لیے تو اغواء کر کے لے جا رہا ہوں۔“ اس کے ہوائیاں اڑاتے چہرے کو دیکھ کر اسے مذاق سوچھا تھا جبکہ وہ اس کے مذاق کو سچ سمجھ بیٹھی تھی۔

”میں محبت میں جان تو قربان کر سکتی ہوں اسجد! مگر عزت نہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سسک اٹھی تھی اور وہ تو پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے فرسٹریشن میں ایسی بات کر دی تھی کہ وہ اسے اغواء کر کے لے جا رہا ہے مگر وہ تو سیریس ہو گئی تھی۔

”یسری! پلیز چپ کر جاؤ، تمہارے آنسو مجھے تکلیف دے رہے ہیں، میں تمہارے بارے میں ایسا ویسا سوچ بھی نہیں سکتا، اگر تمہیں لگتا ہے کہ میری نیت میں فتور ہے، تو میں تمہیں ایک لمحہ ضائع کیے بنا تمہارے گھر چھوڑ دوں گا۔“ اسے چپ ہوتے نہ دیکھ کر اس نے گاڑی بیک کرنا چاہی تھی کہ وہ اسٹیرنگ پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ گئی تھی۔

”میں نے کبھی آپ کو یا آپ کی محبت کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا، پہلے آپ نے کہا کہ مجھ سے محبت نہیں فلرٹ کر

ہے تھے، بعد میں کہا کہ اغواء کر کے لے جا رہے ہیں، میں آپ کو کیا سمجھوں؟ آپ کا کون سا روپ سچا سمجھوں! اسجد! وہ روپ جب آپ نے محبت کا اقرار کر کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں، مجھے اپنا بنالینے کے وعدے کیے تھے، یا اس روپ کو حقیقت سمجھوں جو مجھ سے میری محبت چھین لینا چاہتا ہے۔ وہ ہچکیوں کے درمیان لرزتے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”تم پلیز! چپ کر جاؤ، میں تمہیں سب بتا دیتا ہوں، تم رونا تو بند کرو۔“ اس کا رونا اسجد کو ایری ٹیٹ کر رہا تھا۔

”آپ مجھ سے محبت تو کرتے ہیں نا اسجد!“ وہ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالتے ہوئے بڑی آس سے پوچھ رہی تھی، اس کے اس طرح پوچھنے میں کتنی بے چینی اور کرب چھپا تھا، اس نے شدت سے محسوس کیا تھا۔

”فون پر آپ نے جو کچھ کہا۔۔۔“

”وہ سب جھوٹ، بکواس تھی یسری! میں تم سے فلرٹ نہیں کر رہا، ڈیم اٹ! تم سے پیار کرتا ہوں، خود سے زیادہ تمہیں

پاہتا ہوں۔“

”پھر ان سب باتوں کا کیا مطلب تھا، آپ نے مجھ سے وہ سب کیوں کہا؟ اب یہ مت کہیں گے گا کہ میں مذاق کر رہا تھا، تمہیں آزار پہنچا تھا۔“ یسری نے ہاتھ کی پشت سے آنسو گڑتے ہوئے اُسے جھوٹ نہ بولنے کی تنبیہ کی تھی۔

”میں نے وہ سب مذاق میں نہیں حقیقت میں کہا تھا، کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم اس شخص سے شادی کر لو جس سے تمہارے گھر والے کرنا چاہتے ہیں۔“ اسجد نے اس کے متورم چہرے سے نگاہ ہٹا لی تھی، اس لڑکی کو وہ بہت چاہتا تھا، اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا نہیں چاہتا تھا، مگر آج خود ہی اُسے رلا رہا تھا۔

”آپ اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں، میں ایسا کبھی نہیں کروں گی، محبت کسی سے اور شادی کسی اور سے۔۔۔ جس سے محبت کی ہے اُسی سے شادی کروں گی۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہی تھی کہ اُس نے ٹوک دیا تھا۔

”مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔“

”3 سال بعد آپ کو خیال آ رہا ہے کہ آپ مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟“

”میں بہت مجبور ہوں یسری! تم سے محبت کرتا ہوں۔“

”مگر اپنانے کا حوصلہ نہیں ہے، بزدلوں کے منہ سے محبت کے قصے اچھے نہیں لگتے اسجد! اور ایسی کیا مجبوری ہے آپ کی کہ آپ محبت کا دعویٰ تو کر رہے ہیں مگر اُسی محبت کو اپنا نہیں سکتے؟“

”میں تم سے محبت کا محض دعویٰ نہیں کرتا، محبت کرتا ہوں تم سے، مگر کیا کروں یسری! میری منگنی ہو گئی ہے اور میں کچھ نہیں کر سکا کیونکہ۔۔۔“ وہ شگستگی سے اپنی کمزوری کا اعتراف کر رہا تھا کہ وہ جو اس کے انکشاف پر لمحہ بھر کو ساکت ہوئی تھی،

”یہ ہے آپ کی محبت اسجد! کہ آپ نے کسی اور سے منگنی کر لی؟“ وہ شکستہ نگاہوں سے بے بسی کی تصویر بنے اسجد کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کہتے ہیں آپ کچھ نہیں کر سکے، منگنی کر لی، شادی کر لیتے تب کہتے کہ آپ نے کچھ کیا ہے۔“ وہ تو اس کے انکشاف پر دہل کر رہ گئی تھی۔

”مجھے منگنی سے محض 3 دن پہلے ہی پتہ چلا تھا یسری! کہ میری منگنی ہو رہی ہے۔“ اس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُسے کیسے سمجھائے۔

”منگنی ہو رہی نہیں تھی ہو گئی، مجھے 3 سال تک لٹکا کر رکھا، میں نے اپنے لیے آنے والے ہر رشتے کو ٹھکرایا صرف آپ کی خاطر، خالہ جان کے طعنے سنے کہ مجھے ان کے ٹکڑوں پر پلنے کی عادت ہو گئی ہے، خالہ کے بیٹے کو مایوس کیا آپ کی خاطر،

اور آپ نے منگنی کر لی۔۔۔ جب میں اتنی کٹھنایاں آپ کی محبت میں برداشت کر سکتی ہوں تو آپ اپنی منگنی ہونے سے نہیں روک سکتے تھے؟ روکنا چاہتے تو روکتے، مجھے اور میری محبت کو وقت گزاری ہی تو سمجھا تھا آپ نے، تو پھر کیا ضرورت پڑی تھی جو آپ میری خاطر اسٹینڈ لیتے۔“

”یسری! میری منگنی پھپھو کی بیٹی سے ہوئی ہے، میں نے ابو سے بات کرنا چاہی تھی، مگر انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا، وہ بہن کو زبان دے چکے ہیں اور میں نے یہ منگنی نہیں کی تو وہ مجھ سے ہر تعلق ختم کر لیں گے، بات اتنی سی بھی ہوتی تو میں منگنی نہیں کرتا، مگر ابو نے اپنی جان لے لینے کی دھمکی دی تو میں مجبور ہو گیا، یقین کرو میرا یسری! میں تمہیں بہت چاہتا ہوں، میں نے جو کچھ کیا مجبوری میں کیا۔“

”اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”میں تمہارا مجرم ہوں یسری! جو چاہے سزا دے دو، مگر اتنا یاد رکھنا کہ میں نے تم سے محبت کی ہے، مگر شاید ہماری محبت کے نصیب میں وصل نہیں، بھر لکھا گیا ہے، میں تو بس یہی چاہتا ہوں کہ تم جہاں رہو خوش رہو، میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی، مجھے معاف بھلے مت کرنا، مگر زندگی کے سفر میں کسی کی ہمراہی میں آگے بڑھ جانا، خواہش تو بہت تھی کہ تمہارا ہمسفر بنوں، مگر یہ خواہش۔۔۔ خواہش ہی رہ گئی۔“

”آپ کسی کا بھی ہاتھ تھام کر زندگی گزار سکتے ہیں، مگر میں اتنی باہمت نہیں ہوں، مجھ سے یہ سب نہیں ہوگا، میری جان مانگیں گے تو ہنتے ہنتے آپ کے قدموں میں جان دے دوں گی، مگر جو آپ مجھ سے مانگ رہے ہیں، وہ میری زندگی سے بڑھ کر ہے، بھرزدہ زندگی گزارنے سے تو بہتر ہے میں اپنی جان دے دوں۔“ وہ ایک دم ہی بکھر گئی تھی، اُس کی شرٹ کا کالر تختی سے مٹھی میں دبوچے آنسو بھری آنکھوں سے اس کا مقفل چہرہ تک رہی تھی۔

”یسری! ایسی باتیں مت کرو۔“

”مجھے موت کا سندیسہ دے کر آپ کہتے ہیں میں زندگی کے گیت گاؤں، تو یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔“ وہ تڑپ رہی تھی اور تڑپ تو وہ بھی رہا تھا، مگر حوصلہ کیے بیٹھا تھا کہ اگر اُس نے بھی ہمت ہار دی تو وہ مزید بکھر جائے گی اور وہ اُسے بکھرنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

”زندگی میں انسان کو سب ہی کچھ نہیں مل جاتا اور تمہارے جینے کے لیے یہ احساس کافی نہیں ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟“ اُس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اونچا کیا تھا۔

”نہیں، اسجد! میں کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتی، محبت آپ سے اور شادی کسی اور سے۔۔۔ مجھے کیوں اذیت دے رہے ہیں؟ ایک دفعہ اپنے گھر والوں سے بات تو کر کے دیکھیں، بابا نہیں مان رہے تو ماما سے بات کریں، میں آپ کے بغیر نہیں جی سکتی۔“ وہ اُس کے کاندھے پر سر رکھ گئی تھی اور اُس کا شانہ اُس کے آنسوؤں سے بھیگنے لگا تھا۔

”تم سمجھ نہیں رہیں یسری! میری کوئی بھی کوشش محبت سے بندھے رشتوں میں بے رخی کی گانٹھ باندھ دے گی، ماندہ میری پھپھو کی بیٹی ہے اور ماندہ سے جزا رشتہ توڑا تو کتنے ہی رشتے بکھر جائیں گے، بہن بھائی جدا ہو جائیں گے اور میری بہن۔۔۔ اُس کا رشتہ ٹوٹ جائے گا وہ راحم سے بہت محبت کرتی ہے اور میری وجہ سے وہ کیوں جدائی کا درد سہے؟ میں اپنوں کو دکھ نہیں دے سکتا۔“ اُس نے بے بسی سے اُسے خود سے دور کیا تھا اور گاڑی اشارٹ کرنے لگا تھا۔

”آپ کو سب کی پرواہ ہے، پرواہ نہیں ہے تو صرف میری، کسی کو دکھ نہیں دینا چاہتے اور میری پوری حیات دکھوں کے حوالے کر رہے ہیں، سب کو جدا ہونے سے بچا رہے ہیں اور مجھے جدائی کا پروانہ دے رہے ہیں، یہی ہے آپ کی محبت۔“

وہ اُس سے برگشتہ ہو رہی تھی۔

”اتنے لوگوں کی زندگی برباد ہونے سے بہتر ہے کہ ہم دونوں کے دل اُجڑ جائیں، زندہ رہنے کے لیے سانسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم بھی جی لیں گے، ابھی تم جذباتی ہو کر سوچ رہی ہو، ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو گی تو میرا فیصلہ اتنا بُرا نہیں لگے گا۔“ اسے دیکھے بغیر اس نے گاڑی اشارت کر دی تھی اور ہلکی رفتار سے اُس نے گاڑی بیک کی تھی اور نارمل رفتار سے گاڑی یسری کے گھر کی جانب بڑھنے لگی تھی۔

”میں جذباتی ہو کر سوچ رہی ہوں، تو ایسا ہی ہے اور میری جذباتیت ابھی آپ نے دیکھی نہیں ہے اسجد! اب بتاؤں گی کہ میری جذباتیت اور شدت پسندی کی حد کیا ہے، آپ کسی سے بھی شادی کریں، مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔“

”پاگل مت بنو یسری! تمہیں میری قسم ہے، خدا را! خود کو نقصان مت پہنچانا۔“

”آپ اپنی راہیں الگ کر چکے ہیں، اپنے لیے جیون ساتھی بھی منتخب کر چکے ہیں تو میری فکر اب کم از کم آپ کو نہیں کرنی چاہیے، میں جیوں یا مروں آپ کی بلا سے۔“ وہ روتے ہوئے اُس کی گاڑی سے اتر گئی تھی اور وہ اُسے روک بھی نہیں سکا تھا، یسری نے بہت تیز آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا تھا، وہ اُس کے گلی میں جانے کا منتظر تھا، مگر وہ کچھ دور جا کر اسٹاپ پر کھڑی ہو گئی تھی اور وہ پریشانی سے اُس تک آیا تھا۔

”یسری! گھر جاؤ، یہ جگہ کافی سنسان ہے۔“ دوپہر کا وقت تھا، اسٹاپ پر کوئی نہیں تھا، گاڑیاں بھی بڑی تیزی سے اِکا دُکا ہی گزر رہی تھیں۔

”آپ جانیے۔“ اُس کی آواز مستقل رونے سے کافی بھاری ہو گئی تھی۔

”میں چلا جاؤں گا، لیکن پہلے تم جاؤ، میں یہ اطمینان کیے بغیر نہیں جاؤں گا کہ تم خیریت سے اپنے گھر پہنچ گئی ہو۔“ وہ قطعیت سے بولا تھا۔

”میں پہلے کیوں جاؤں؟ آپ جاؤ، میں آپ کو نہیں چھوڑ رہی، چھوڑ آپ رہے ہیں، اس لیے میں آپ کو جاتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولی تھی۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ وہ قدرے چوسا گیا تھا۔

”پلیز اسجد! مجھے جانے کو مت کہیں، پر اس.... آپ کی گاڑی نگاہوں سے جیسے ہی اوجھل ہوگی میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ وہ لجاجت سے بولی تھی۔

”لیکن....“

”لیکن، لیکن کچھ نہیں، آپ چلے جائیں، میں یہ اطمینان کر لینا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں، آپ سے پہلے میں گئی تو میری آنکھوں میں انتظار بس جائے گا، دل خوش نہیں پال لے گا کہ شاید آپ لوٹ کر آ جاؤ اور آپ نے تو کہا ہے ہم زندگی میں آگے بڑھ جائیں اور اب خود ہی مجھے انتظار سونپنا چاہتے ہیں، کیوں آپ میری زندگی کو مذاق بنا دینا چاہتے ہیں؟ ایک طرف تو کہتے ہیں میں آپ کو بھلا دوں اور دوسری طرف مجھے الوداع کہنے نہیں دیتے، جانیے اسجد! چلے جانیے، ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر بہت دور چلے جائیں۔“ اس نے اس کے بازو پر دائیں ہتھیلی رکھ کر دھکا سادیا تھا اور وہ اُسے دیکھتا گاڑی میں آ بیٹھا تھا، اسٹیرنگ پر سر رکھ کر اُس نے اب تک روکے ہوئے آنسو بہائے تھے اور جیسے ہی یہ خیال آیا تھا کہ وہ اس کے جانے کی منتظر ہے اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی اشارت کی تھی اور آنکھوں پر آنسوؤں کی دھند سی تھی اور اُس نے آگے پیچھے بھی نہیں دیکھا تھا، اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ یسری سائیڈ سے نکل کر سڑک کے بیچ آ کھڑی ہوئی ہے اور جیسے ہی اُس نے اندھا دھند گاڑی آگے بڑھائی تھی وہ یسری کو دور اُچھالتی کافی آگے بڑھ گئی تھی، اُس کے حواس بیدار ہوئے تھے، اُس نے گاڑی کو بریک لگائے تھے، تیزی سے ڈرائیونگ ڈور کھولتا ہوا وہ باہر نکلا تھا اور بھاگتا ہوا اُس تک پہنچا

تھا۔

”یسری! یہ کیا کیا تم نے، پاگل لڑکی!“ اس کے سر سے خون نکل رہا تھا اور وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہوئے اُس کا سر اپنے زانوں پر رکھے بے تابی سے بولا تھا۔

”آئی ٹو اسجد!“ آنکھیں بند ہونے سے پہلے وہ اتنا ہی بولی تھی اور وہ اُسے اٹھائے تقریباً بھاگتے ہوئے گاڑی تک پہنچا تھا۔ اُسے بیک سیٹ پر احتیاط سے لٹایا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور وہ بڑی ریش ڈرائیونگ کرتا اُسے ہاسپٹل لے کر آیا تھا، مگر ڈاکٹر نے پولیس کیس کہہ کر علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا، اُسے فوراً ہی ارحم کا خیال آیا تھا تو وہ ارحم کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”ارحم! میں اسجد بات کر رہا ہوں۔“

”اسجد! سب خیریت تو ہے، تم بہت پریشان لگ رہے ہو؟“

”ارحم! مجھے تمہاری ہیلپ کی ضرورت ہے۔“

”بات کیا ہے؟“

”ایک لڑکی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“

”تم پریشان نہ ہو، میں آ رہا ہوں۔“

”اوکے، ارحم! بٹ تم ڈاکٹر سے بات کر لو، تاکہ وہ کم از کم لڑکی کا علاج تو شروع کریں، اگر اُس کی جان چلی گئی تو....“ یہ تصور ہی اُسے ہولا گیا تھا۔

”یو ڈونٹ وری اسجد! کچھ نہیں ہوگا۔“ ارحم نے ڈاکٹر سے بات کر کے لائن کٹ کر دی تھی اور اسجد i.C.U کے باہر کھڑا اُس کی زندگی کی دعا کر رہا تھا جو اُس کی محبت میں جان قربان کرنے چلی تھی۔

”صرف ایک دفعہ ہوش میں آ جاؤ یسری! تمہاری خاطر میں ساری دنیا سے لڑ جاؤں گا، تمہیں کچھ ہو گیا تو شاید میں بھی مر جاؤں۔“ وہ i.C.U کے باہر کھڑا اندر مشینوں میں جکڑے وجود پر نگاہ جمائے خود سے بولا تھا اور جیسی کسی نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا، اُس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ارحم تھا۔

”ارحم پلیز! اس وقت کوئی سوال مت کرو، میں کچھ نہیں بتا چاؤں گا۔“

”ریلیکس اسجد! پریشان نہ ہو، اُس لڑکی کی حالت کیسی ہے؟ کیا وہ بہت زیادہ انجڑ ہے؟“ اس کی پریشان صورت دیکھ کر پوچھا تھا۔

”اُس کا سر اور بیک بہت بُری طرح متاثر ہوئے ہیں، اُس کی ریڑھ کی ہڈی ڈنچ ہو گئی ہے، شاید ہو سکتا ہے.... اللہ نہ کرے۔“ وہ اُسے کچھ بتا نہیں سکا تھا جبکہ وہ از حد متحیر ہو گیا تھا، اسجد کا بُری طرح کانپتا ہوا لہجہ، آنکھوں میں مچلتے آنسو، چہرے پر لکھے دکھ سے۔

”کیا اسجد! اُس لڑکی کو جانتا ہے؟ اور اسی لیے وہ اُس کے لیے اتنا متفکر ہے۔“ اُسے خیال آیا تھا جسے وہ زبان پر بھی لے آیا تھا۔

”اسجد! کیا تم اُس لڑکی کو جانتے ہو؟“

”ارحم! اُس کی حالت کا ذمہ دار صرف میں ہوں، میری وجہ سے وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اب شاید کبھی چل نہ سکے، اور تم....“ وہ خود چاہ کر بھی سنبھال نہیں پارہا تھا۔

”حوصلہ رکھو اسجد! اُس لڑکی کو انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا، اور یہ بتاؤ تم نے اُس لڑکی کے گھر والوں سے رابطہ کیا؟“

”نہیں، کیونکہ ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے اس کے گھر والوں کا پتہ چلتا۔“ اُسی وقت i.c.u کا دروازہ کھلتا تھا اور وہ دونوں ڈاکٹر تک چلے آئے تھے۔

”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے، مریض کو انڈر آبزرویشن رکھا گیا ہے، 24 گھنٹوں میں ہوش آ گیا تو ٹھیک ورنہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، بس آپ دعا کریں۔“

”اجد! تم گھر چلے جاؤ، مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک....“

”میں ٹھیک ہوں۔“

”یہ حادثہ ہوا کس جگہ پر تھا، تاکہ لڑکی کے گھر والوں کو تو کم از کم انفارم کر دیں، وہ ضرور پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

اُس نے جگہ بتادی تھی کیونکہ گھر کا ایڈریس تو خود اُسے بھی معلوم نہیں تھا، ارحم نے کچھ سوچتے ہوئے کسی کو فون ملایا تھا اور اُس کے آنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

”نوید! میرا خیال ہے ہمیں مہوش کو ہاں کہہ دینی چاہیے۔“

”لیکن راشدہ! اتنے کم وقت میں ساری تیاریاں کیسے ہوں گی؟“

”آپا بیگم! مجھے لگتا ہے زرین بیٹی کی بھی رائے پوچھ لینی چاہیے، آنا فائنا رشتہ طے ہو گیا اور اب شادی۔“

”ہمیں زرین پر پورا اعتماد ہے، ہماری بیٹی کبھی ہماری بات نہیں ٹالے گی اور ہم اُس کے لیے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔“ کسی کام سے وہاں آتی زرین آواز پر ٹھٹھک کر وہیں رُک گئی تھی۔

”اور ہم نے فیصلہ کر رشتہ بہت سوچ سمجھ کر منظور کیا ہے، ہماری بیٹی کے لیے وہ ایک آئیڈیل شخص ہے اور زرین اُس کے ساتھ بہت خوش رہیں گی۔“ زرین جو اس سب قصے کو لے کر پریشان تھی، جس وقت اُسے راشدہ نے بتایا تھا کہ مہوش اُس کا ہاتھ فیصل کے لیے مانگنے آ رہی ہیں اور اُن کو مثبت جواب ہی دیا جائے گا تو اُس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے، وہ ماں سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں سکی اور اُس کی سونی کلاسیاں بھاری کنگنوں سے سج گئیں اور آج باپ کا مان بھرا لہجہ، وہ اپنے آنسو صاف کرتی وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

”آپ دیکھ لیں راشدہ! اگر آپ اتنی جلدی سب کچھ میج کر سکتی ہیں تو مہوش کو جو وہ کہیں تاریخ دے دیں، لیکن کسی چیز کی کمی نہیں ہونی چاہیے، ہم اپنی بیٹی کو وہ سب دیں گے جو اُس کا حق ہے۔“

”لیکن اُن لوگوں نے جہیز لینے سے سختی سے انکار کر دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے، سوچ کر آپ مجھے بتا دیجئے گا، فریدہ کو کبھی بلا لیں اور آپ خواتین مل کر فیصلہ کر لیں، پھر اُسی کے تحت مجھے جو کرنا ہو گا وہ کر لوں گا اور آپ پہلے زرین سے ضرور پوچھ لیں، اگر وہ وقت چاہیں تو اُن کی خواہش کا احترام کیا جائے گا۔“ انہوں نے فیصلے کی ڈور اُن خواتین کے ہاتھ میں تھمادی تھی۔

”خین کہاں ہیں، انہوں نے کھانا کھایا کہ نہیں؟“

”نہیں، کمرہ بند کیے پڑی ہے اور اُسی وقت باہر نکلے گی جب اُسے آفس جانے کی اجازت ملے گی، نہ جانے کہاں سے خناس سا گیا ہے اُس کے دماغ میں۔“ ساجدہ تو اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں، مگر وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ تھی اور وہ اُسے سخت سست سست اُس کے کمرے سے نکل آئی تھیں، اور وہ جب سے ہی لاک لگائے بیٹھی تھی۔

”اجد کہاں ہے، دوپہر میں گھر آیا تھا؟“

”نہیں، وہ جو صبح سے نکلا تو ابھی تک نہیں آیا، کیا آفس نہیں گیا؟“

”آفس آیا تو تھا مگر 12، 1 بجے کے قریب وہاں سے نکل گیا تھا، جبکہ 2 بجے اس کی ایک اہم میٹنگ بھی تھی، میں نے اُس سے رابطہ یہ سوچ کر نہیں کیا کہ وہ اتنا غیر ذمہ دار نہیں ہے کچھ سوچ کر ہی میٹنگ کینسل کی ہوگی، اور اب تو 8 بجنے والے ہیں، اب تک تو اُسے آ جانا چاہیے تھا۔“ وہ اجد کا نمبر ملانے لگے تھے، لائن کاٹ دی گئی تھی اور تقریباً 10 منٹ بعد وہ گھر میں داخل ہوا تھا اور سلامتی بھیجتا تھکے تھکے انداز میں وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”اجد! سب خیریت تو ہے بیٹا؟“

”جی امی! بس کچھ تھک گیا ہوں، یہ زرین کہاں ہے؟ اُس سے کہہ کر ایک کپ چائے بنوا دیں، سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ ارحم نے اُس سے کہا تھا کہ وہ خود سب کچھ ہینڈل کر لے گا، اس لیے وہ گھر میں کچھ نہ بتائے، ایک گھنٹہ قبل ہی اُسے ہوش آ گیا تھا، مگر ڈاکٹر زابھی بھی پُر امید نہیں تھے، ارحم نے اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے یسری کے گھر والوں کا پتہ چلا لیا تھا، کیونکہ ایچو نیل جگہ تو اجد اُسے بتا ہی چکا تھا اس لیے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی تھی، یسری کی خالہ اور ان کا بیٹا ہاں آ تو گئے تھے مگر ان کے چہروں سے پریشانی نہیں ٹپک رہی تھی، اُن کے چہروں سے بلا ٹلنے کی اُمید ٹپک رہی تھی، اور خالہ نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ بہت غریب ہیں، کسی سرکاری اسپتال میں علاج نہیں کروا سکتیں کچا شہر کے مہنگے ترین پرائیویٹ ہسپتال میں، اجد نے علاج کروانے کی ذمہ داری اٹھالی تھی اور اُن کے ہاتھ پر 10 ہزار رکھ کر وہ ارحم کے کہنے پر ہسپتال سے نکل آیا تھا۔ اجد کی اتنی مہربانیوں کو ارحم سمجھ نہیں پارہا تھا، ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ یہ سب خوف کے پیش نظر کر رہا ہے، اُس کا پڑ مردہ چہرہ ارحم کو بہت کچھ سمجھا رہا تھا، مگر اس وقت اُس نے اجد سے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا؟“

”چچی! ٹھیک ہوں میں، بس کچھ تھکن....“

”بات کیا ہے اجد! تم نے میٹنگ بھی کینسل کر دی، اور اس وقت آ کہاں سے رہے ہو؟“

”ابو! ایک دوست کی طرف نکل گیا تھا، اُس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور صبح جو کچھ ہوا گھر میں اس کے بعد میٹنگ اٹینڈ کرنا نہیں چاہ رہا تھا، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا اتنے ماہ کی محنت پل بھر میں ضائع ہو جائے۔“ وہ کچھ تلخ ہوا تھا۔

”تم صبح ناشتہ کیے بغیر ہی چلے گئے، اس کا مجھے بہت افسوس ہے بیٹا!“ ساجدہ ایک بار پھر شرمندگی کے حصار میں لپٹ سی گئی تھی۔

”پلیز چچی! میں نے آفس میں کھالیا تھا۔“ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا اور کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہتے کہتے رُک کر اُس نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا، وگرنہ اُس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

”اجد! صبح جو کچھ ہوا میں نہیں چاہتا کہ وہ پھر دوبارہ دہرایا جائے، خین کو میں نے اجازت دی ہے اور اس معاملے میں تمہیں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”وہی تو میں حیران ہوں کہ آپ نے اُسے اجازت دے کیسے دی؟“

”اب تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں؟“ اس کا تلخ لہجہ انہیں کچھ غصہ دلا گیا تھا۔

”میں نے یہ نہیں کہا ابو! لیکن یہ بات تجھے پسند نہیں ہے، اس لیے میں نہیں چاہتا کہ خین آفس جوائن کرے، اگر وہ ایسا کرے گی تو میں آفس نہیں آؤں گا، اور یہ میرا اہل فیصلہ ہے۔“ وہ کہہ کر رُکنا نہیں تھا اور خین جو باہر کھڑی اندر ہونے والی تکرار سن رہی تھی اُسے بے تحاشہ غصہ آ گیا تھا اور وہ اندر جانے کی بجائے اُس کے روم میں چلی آئی تھی، اجد اپنے سیل فون سے ارحم کا نمبر ڈائل کر رہا تھا مگر اُسے دیکھ کر رُک گیا تھا۔

”تم میرے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟“

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

”مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی، میرے کمرے سے اسی وقت چلی جاؤ۔“

”لیکن میں آپ کے روم سے بات کیے بغیر نہیں جاؤں گی۔ اس کے غصے کو وہ کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے آگے بڑھ آئی تھی۔“

”میں کم از کم اس وقت تم سے کوئی بھی بات کرنا نہیں چاہتا جنہیں! میں پہلے ہی ڈسٹرب ہوں، تم مجھے مزید پریشان نہ کرو، جو بات کرنی ہو صبح کر لینا۔“

”مجھے بات ابھی اس لیے کرنی ہے تاکہ آپ کو بتا دوں کہ صبح میں آفس جوائن کر رہی ہوں، صبح کوئی بد مزگی نہ ہو اس لیے ابھی سے بتا دیا ہے۔“

”تمہاری سمجھ میں ایک دفعہ کی بات نہیں آتی، کہہ چکا ہوں کہ تم آفس نہیں آؤ گی تو بار بار اس ذکر کو نکالنے کا مقصد؟“

اُس نے اشتعال میں آتے ہوئے اس کا بازو سختی سے پکڑتے ہوئے نہایت غصے میں کہتے ہوئے ایک جھٹکا دیتے ہوئے بازو چھوڑ دیا تھا۔

”جب مجھے بڑے ابوالجازت دے چکے ہیں تو آپ کیوں اس معاملے میں فضول میں بولے جارہے ہیں؟“ وہ اس کے غصے سے خائف تو ہوئی تھی مگر بولے بیٹا جتنی نہیں رہی تھی۔

”کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تم آفس آؤ۔“ وہ دھاڑا تھا۔

”آپ مجھے روک نہیں سکتے، میں اپنی مرضی کی آپ مختار ہوں، آپ مجھ پر اپنے فیصلے زبردستی ٹھونس نہیں سکتے۔“ وہ دوبار بول رہی تھی، یسری کو لے کر اس کا ذہن پہلے ہی منتشر تھا، جنہیں کا نڈر انداز اُس کے ذہن پر ہتھوڑے سے برسا رہا تھا۔

”اور تم میرے فیصلے کو بدل نہیں سکتیں، اب میرے کمرے سے دفع ہو جاؤ، مجھے تم سے کوئی بحث نہیں کرنی۔“

”آپ منع کرتے رہیں، میں کل آپ کو آفس آ کر دکھاؤں گی۔ اتنی بے عزتی پر تو وہ چراغ پا ہو گئی تھی، اس لیے بہت تیز لہجے میں بولی تھی۔

”تم آ کر تو دکھاؤ، ٹانگیں توڑ دوں گا میں تمہاری۔“

”آپ... آپ ہوتے کون ہیں میری ٹانگیں توڑنے والے؟ باپ مر گیا ہے لیکن میری ماں ابھی زندہ ہے، لا وارث نہیں ہوں میں۔“ وہ اب رو رہی تھی۔

”تم پلیز! اس وقت یہاں سے چلی جاؤ، میں ابوالچچی سے بات کر لوں گا۔“

”جو بات کرنی ہے مجھ سے کریں، زندگی میری ہے فیصلہ بھی میرا ہی ہوگا۔ اور آپ مجھے کچھ بھی کرنے سے روک نہیں سکتے اور آپ آفس جانے سے مجھے کیوں روک رہے ہیں؟ جتنا حق آپ کا ہے اس گھر اور بزنس پر اتنا ہی میرا بھی ہے، اس لیے آپ...“

”چنانچہ... بہت بڑی ہو گئی ہوناں جو حق کی بات کرو گی، جائیداد میں حصہ مانگو گی۔“ وہ اس کی اس بات پر اشتعال پر قابو نہیں رکھ پایا تھا اور اُس پر ہاتھ اٹھالیا تھا، وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے گال پر ہاتھ رکھے اُسے دیکھ رہی تھی۔ یک دم بہت روتے ہوئے وہاں سے نکلنے لگی تھی مگر اس نے بازو پکڑ لیا تھا۔

”جنین! آئی ایم سوری، میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا...“ وہ جھٹکے سے بازو چھڑاتی وہاں سے بھاگی تھی۔

”اوہ شٹ...!“ اسے افسوس ہو رہا تھا، مگر بجتے ہوئے موبائل نے بہت جلد اُسے اس کیفیت سے نکال لیا تھا۔

”ہاں بولو ارحم! سب ٹھیک تو ہے؟“

”یو ڈونٹ وری اسجد! سب ٹھیک ہے، وہ لڑکی اب خطرے سے باہر ہے۔“

”اوہ تھینک گاڈ!“ اس نے ایک اطمینان سا محسوس کیا تھا۔

”ڈاکٹر ز کیا کہہ رہے ہیں، کب تک اُسے ڈسچارج کر دیں گے؟“

”کچھ ہفتے یا ماہ بھی لگ سکتے ہیں، اس کی ریڑھ کی ہڈی بہت بُری طرح متاثر ہوئی ہے، اسے مکمل بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا، اور تقریباً ہفتہ تو لگے گا پھر ہی ڈاکٹر ز کچھ بتا سکیں گے کہ وہ چل سکے گی یا نہیں؟“

”لڑکی کے گھر والے... وہ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”اُن کی بے حسی تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی چکے ہو، لڑکی کے پیرنٹس تو ہیں نہیں اور وہ جو اس کی خالہ ہیں، ان کو اس کے جینے اور مرنے سے فرق نہیں پڑتا، وہ کہہ رہی تھیں کہ ہم لوگ علاج کا خرچہ اٹھا سکتے ہیں تو ٹھیک، ورنہ وہ اُسے کسی سرکاری اسپتال...“

”ہرگز نہیں ارحم! سارا خرچہ میں اٹھاؤں گا، اس کی حالت کا میں ذمہ دار ہوں، میری وجہ سے وہ موت کے منہ سے نکلی ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ وہ میری وجہ سے لاپتہ ہو جائے۔“

”اسجد! وہ سب ٹھیک ہے، ہمارا انسانی فرض بھی ہے کہ ہم اُس لڑکی کی مدد کریں، مگر ڈاکٹر ز کے مطابق وہ اُن کے ساتھ کوآپریشن نہیں کر رہی، جب سے ہوش میں آئی ہے سبھی کے لیے جاری ہے کہ اُسے زندہ نہیں رہنا، وہ مر جانا چاہتی ہے، ان باتوں کا کیا مطلب نکلتا ہے، ایکسیڈنٹ میں تمہاری غلطی نہیں تھی بلکہ وہ جان کر تمہاری گاڑی کے سامنے آئی، آئی ایم رائٹ؟“ اُس کا انداز خاص تفتیشی تھا۔

”بات کچھ اسی طرح کی ہے ارحم! وہ لڑکی اچانک ہی میری گاڑی کے سامنے آ گئی، میں بریک بھی نہیں لگا سکا، غلطی اُس لڑکی کی تھی ارحم! مگر کہیں نہ کہیں میں ذمہ دار ہوں، اسے کچھ ہو گیا تو شاید میں زندگی بھر خود کو معاف نہ کر سکوں، ضمیر کی مار مجھے جیتے نہیں دے گی اور میں اسی گلٹ سے بچنے کے لیے ہر طرح سے اُس لڑکی کے ساتھ کوآپریشن کرنا چاہتا ہوں۔“

اسجد نے اپنی محبت بھری فکر کو انسانیت کا روپ دے دیا تھا، وہ چاہتا تو اس وقت ظاہر کر دیتا، مگر اس نے ایسا جان کر نہیں کیا، کیونکہ وہ مائدہ کا بھائی تھا، اور اسجد پہلے نوید عالم سے بات کرنا چاہتا تھا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے رشتوں میں دوریاں آ جائیں، ارحم جو کچھ شکوک و شبہات میں ڈوب رہا تھا ایک دم ہی مطمئن ہو گیا تھا۔

”تم بالکل فکر مت کرو اسجد! میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”تھینکس ارحم! آج تم نہ ہوتے تو میں یہ سب بالکل منہج نہیں کر پاتا، میں تو بہت خوفزدہ ہو گیا تھا، تمہارے ساتھ نے مجھے سہارا دیا۔“

”یار! اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں، یہ بتاؤ گھر میں کچھ بتایا ہے یا نہیں؟“

”نہیں، گھر میں کچھ بھی کسی کو نہیں بتایا، تمہیں تو پتہ ہے امی ذرا اسی بات پر پریشان ہو جاتی ہیں، معاملہ تھوڑا اٹھنڈا پڑ جائے تب ابو سے ذکر کروں گا، ابھی رکھتا ہوں، بعد میں بات کروں گا، شاید مجھے ابوبلار ہے ہیں۔“ نوید عالم کی آواز آئی

”کی اور وہ لائن کا موبائل بیڈ پر اچھا لتا روم سے نکل آیا تھا۔“

”اسجد! یہ جنین کیا کہہ رہی ہے؟ تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے؟“ نوید عالم کو اُس نے اتنے غصے میں بہت ہی کم دیکھا تھا۔

”اسجد! یہ جنین کیا کہہ رہی ہے؟ تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے؟“ نوید عالم کو اُس نے اتنے غصے میں بہت ہی کم دیکھا تھا۔

نئی نئی فصل

کر دیں اماں بی کو، روک دیں، آپ کی تو سب مانتے ہیں، کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہیں، میں نہیں کروں گی آپ سے شادی، اور میں جانتی ہوں آپ بھی بے خبر ہیں ورنہ بات اتنی آگے نہ بڑھتی۔ اس بار قائمہ کا لہجہ بھی قدرے ٹھنڈا تھا، کیونکہ جانتی تھی کہ بدتمیزی وہ برداشت نہیں کرتا۔

”کہہ لیا؟ اب میری سنو! بغیر میری رضا کے میری زندگی کا فیصلہ نہیں ہو سکتا اور نکاح ہمارا ہو چکا ہے، اب اس ساری بکواس کا کیا مطلب ہے، وہی ہوگا جو اماں بی کا فیصلہ ہے، کوئی غلط حرکت کی تو تمہارے کمرے سے میرے کمرے تک کا فاصلہ زیادہ نہیں ہے، آگے تم خود سمجھدار ہو۔ وہ غزایا تھا، قائمہ کی تو گویا جان نکل گئی تھی، وہ سمجھی تھی دھمکی کام کرے گی، مگر بھول گئی تھی سامنے عمیس عالم تھا، جو صرف کہہ نہیں رہا تھا بلکہ کرنے میں ذرا تاخیر نہیں کرے گا، وہ بمشکل اپنے کمرے تک آئی تھی۔

”کیا ہوا، تم سو کیوں نہیں رہی ہو؟“ حریم نے اسے جاگتا پا کر پوچھا تھا، اُسے تو بہانہ مل گیا تھا ورو کر حریم کو بتایا کہ عمیس نے کیا کہا ہے۔

”ارے پاگل لڑکی! تم ایسا کیوں سوچتی ہو، عمیس بھائی بہت اچھے ہیں، تم اس لیے ان سے خفا ہو کیونکہ تم نے آج تک اُن کا غصہ دیکھا ہے، انہیں قریب سے نہیں جانا، یقین کرو، وہ بہت ناکس، بہت

اس نے آدھی رات کو ایک فیصلہ کیا اور اُسی فیصلے کو مکمل کرنے کے لیے وہ رات کے 3 بجے عمیس عالم کے کمرے میں موجود تھی۔

”تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“ قائمہ کی یوں سامنے دیکھ کر اسے شدید حیرت ہوئی تھی، جو لڑکی اُس کی گھر میں موجودگی پر اپنے کمرے میں مقید رہتی ہو، اُسے رات کو اس پہر اپنے روبرو دیکھ کر وہ حیران تھا۔

”ہاں میں.... آپ کیا سمجھتے ہیں، جب چاہیں گے مجھ پہ اپنی مرضی چلائیں گے، بچپن سے آج تک آپ کے احکامات کی تعمیل کی ہے میں نے، یہاں تک کہ میری پڑھائی میں بھی آپ کا عمل دخل رہا، مگر اب نہیں مسٹر عمیس حیات عالم! ہر فیصلہ آپ کا نہیں ہوگا، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی سمجھ آپ؟“ وہ اُس کے روبرو کھڑے ہو کر کہہ رہی تھی، اور وہ جو پہلے ہی اسے اپنے سامنے پا کر حیران تھا، اب اس کی ہمت پر ساکن تھا۔

”شٹ اپ! کیا بکواس کر رہی ہو تم، کیسا فیصلہ، کون سی مرضی، دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا؟“ الفاظ بھاری مگر لہجہ دھیمہ تھا اُس کا۔

”ہاں دماغ خراب ہے میرا اور سن لیں جا کر خود منع کر دیں اماں بی کو، روک دیں انہیں اس فیصلے سے جو میری موت پہ ختم ہوگا، بہتر ہے آپ خود منع

”کاشف! آپ ان دونوں کو حوالات میں لے جا کر بند کر دیں، صبح ڈیوٹی پر آنے کے بعد میں دیکھ لوں گا، اب آپ جاؤ، میں گھر خود چلا جاؤں گا۔“ سپاہی اُسے سلیوٹ کرتا جیب کی جانب بڑھ گیا تھا، ارحم ڈیوٹی آف کر کے گھر کے لیے نکلا تھا کہ اُسے خیال آیا تھا کہ وہ ماموں جان سے مل آئے، اسی خیال سے وہ اس طرح نکل آیا تھا۔

”تم اتنی رات میں یہاں کیا کر رہی تھیں؟“ وہ جیب کے آگے بڑھتے ہی ساتھ کھڑی حنین سے مخاطب ہوا تھا، مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں حنین! کہ تم اتنی رات گئے اکیلی یہاں کیا کر رہی ہو؟“ وہ دبے دبے انداز میں غزایا تھا، مگر وہ بس روئے جا رہی تھی، بولی اب بھی کچھ نہیں تھی، ارحم نے اُس کا ہاتھ پکڑا تھا اور آگے بڑھنے لگا تھا، مگر اُسے رُک جانا پڑا تھا، کیونکہ وہ وہاں سے ہلی بھی نہیں تھی۔

”اب کیا ہوا؟ چلو گھر....“

”میں گھر نہیں جاؤں گی۔“

”واٹ.....! دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، گھر کیوں نہیں جاؤ گی؟“ وہ رُک کر اُسے دیکھنے لگا تھا۔

”مجھے پھپھو کے پاس جانا ہے۔“

”گھر پر کوئی بات ہوئی ہے؟“

”میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی، مجھے اپنے گھر لے جائیں، میں تایا ابو کے گھر نہیں جاؤں گی، وہاں کسی کو مجھ سے محبت نہیں ہے، کسی کو میری ضرورت بھی نہیں ہے۔“ لہجہ جذباتی اور شکوہ کنناں تھا۔

”تم کیا بکواس کر رہی ہو، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“

”سب کو یہی لگتا ہے کہ میں بکواس کر رہی ہوں یا آپ مجھے پھپھو کے پاس نہیں لے جاسکتے تو ٹھیک ہے، میں خودی چلی جاؤں گی۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا اور کچھ نہیں، خود کیسے جاؤ گی، جیسے ابھی جا رہی تھیں ویسے؟“ وہ جاتی ہوئی حنین کا راستہ روکتے ہوئے نہایت طنز سے بولا تھا۔

”آپ کچھ بھی کہیں، مجھے اپنے گھر لے جاسکتے ہیں تو....“

”گھر پر کسی کو معلوم ہے یا تم بغیر بتائے گھر سے نکلی ہو؟“

”میں کسی کو کیوں بتاؤں، جب کسی کو میری پرواہ ہی نہیں ہے؟ مُمی نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا، تائی نے ڈانٹا اور تو اور اجہ بھائی.... انہوں نے بھی مجھے تھپڑ مارا، اب میں کبھی اُس گھر میں نہیں جاؤں گی، مجھے پھپھو کے پاس جانا ہے۔“ وہ بُری طرح روتی رہی، وہ حنین کو محض دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”اوکے، تم رو نہیں، میں تمہیں گھر لے چلتا ہوں۔“ وہ ماموں کے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کر گیا تھا۔

”گھر سے کب نکلی تھیں؟“ وہ یہ اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی کا ان لوگوں کو علم ہو گیا ہوگا یا نہیں؟

”بہت دیر ہو گئی ہوگی، میں نے تو سوچا تھا رکشہ سے آپ کے گھر چلی جاؤں گی، اسی لیے یہاں اسٹاپ تک آئی تھی۔“ مگر وہ دونوں نہ جانے کہاں سے آگئے اور مجھ سے بدتمیزی کرنے لگے۔“ وہ روتے ہوئے اُسے بتا رہی تھی۔ جیسی کافی دیر بعد ایک آٹو وہاں سے گزرا تھا جسے ارحم نے ہاتھ دے دیا تھا۔

”حنین! چپ کر جاؤ، ہم گھر چل رہے ہیں۔“ ارحم نے بمشکل اشتعال کو قابو میں کرتے ہوئے اُسے رکشہ میں بیٹھنے کو کہا تھا۔



پیار کرنے والے ہیں، اور تمہارا بہت خیال رکھیں گے، تم یہ سوچو یہ فیصلہ صرف عمیس بھائی کا نہیں ہے بلکہ اماں بی اور تمہارے والدین کا بھی ہے، تم سے زیادہ پایا نہیں جانتے ہیں، تبھی تو تمہیں ان کے حوالے کیا جا رہا ہے، کیونکہ تم بہت نازک ہو، یقین کرو، عمیس بھائی تمہیں بہت سنبھال کے رکھیں گے۔ حریم کے سبھانے اور عمیس کی دھمکی کا اثر تھا کہ وہ خاموش ہو گئی اور کر بھی کیا سکتی تھی؟ دن یوں ہی گزر رہے تھے کہ اچانک قائمہ کی زندگی شکوک و شبہات کے دائروں میں گھوم گئی، جب وہ یونیورسٹی سے واپس آئی، تو اماں بی سمیت سب لوگ ہال میں جمع تھے، اُسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔

”اس وقت تایا ابا اور بابا گھر پہ کیسے موجود ہیں؟“ اس نے سوچا۔

”السلام علیکم!“ اس نے سلام کیا، مگر سلام کے جواب میں می نے اُسے پھٹرسید کیا تھا۔

”یہ کیا ہے دیکھو یہ تصویر، یہ خط کیا بکواس لکھی ہے اس میں؟“ انہوں نے لفافہ اُس کے قدموں میں ڈالا تھا، جس میں قائمہ کی پینڈرائنگ میں رافع صدیق کو لکھا گیا خط اور چند تصاویر تھیں، اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا، کس طرح اپنی شکست کا بدلہ لیا تھا اس نے، اپنے ایک پروجیکٹ کی ناکامی سود سمیت لوٹائی تھی اُسے۔

”عارفہ! آرام سے بات کرو۔“ بڑی امی کو اس کی حالت پہ رحم آیا تھا۔

”کیا بات کروں آرام سے بھابی! اس لیے اتنا اعتماد کیا تھا اس لڑکی پر تا کہ یہ دن دکھائے۔“ امی کی آواز غصے اور غم سے رندہ گئی تھی۔

”کیا ہے یہ سب قائمہ!“ بابا نے شکستہ لہجے میں پوچھا تھا۔

”بابا، امی! یقین کریں یہ سب جھوٹ ہے، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔“ اس نے آنسوؤں

کے درمیان کہا تھا۔

”بکواس بند کرو، کیا جھوٹ ہے تمہاری رائٹنگ یا تصویروں میں تمہاری موجودگی؟ دفع ہو جاؤ میری نظروں سے، آئندہ اپنی شکل نہ دکھانا مجھے۔“ امی نے اسے باہر دھکیلا تھا، وہ اپنی صفائی دیے بغیر مجرم ٹھہرا دی گئی تھی، ایسی مجرم جس کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت تھے کہ اُسے خود اپنے ناکردہ جرم کے ہونے کا یقین ہونے لگا تھا، سارا دن روتے ہوئے گزرا مگر نہ آنسو تھمتے تھے نہ سانسیں رُکی تھیں، حریم، فاران، رابی اُسے سمجھا سمجھا کے تھک گئے تھے۔

”دیکھو! رونے سے کیا ہوگا؟ ہم جانتے ہیں تم نے کچھ نہیں کیا، سب کا وقتی غصہ ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا کچھ دن میں۔“ رابی نے سمجھایا۔

”کیا ٹھیک ہوگا رابی! مجھے میری ماں نے بے اعتبار کر دیا، بابا۔ وہ تو مجھے اپنی جان کہتے تھے، کیا کوئی اپنی جان کو خود سے الگ کرتا ہے، اتنی بے دردی سے؟“ اب تو آنسو بھی خشک ہونے لگے تھے، رات کو بڑی مشکل سے حریم نے اُسے سلا یا تھا، مگر سب کزنز جاگ رہے تھے۔

”کیا کریں؟ جھوٹی امی (قائمہ کی امی) بہت غصے میں ہیں۔“ رابی نے کہا۔

”ہاں اور حیرت ہے ات صبح کی ہے اور عمیس بھائی دوپہر کو آچکے ہیں، اُس تک انہوں نے کچھ کیوں نہیں کہا، آخر وہ کچھ کرتے کیوں نہیں ہیں؟ ان کی تو سب مانتے ہیں۔“ تینوں کو فکر لاحق تھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اگلی صبح اُسے یونیورسٹی جاتے دیکھ کر اماں بی نے روکا تھا۔

”یونیورسٹی“ قائمہ نے مختصر جواب دیا تھا۔

”بہت پڑھ لیا تم نے، کر لیا جو کرنا تھا، اب مزید ہمارا تماشا مت لگاؤ، یہ بیٹھا ہے تمہارا ذمہ دار، جس نے تمہیں آگے پڑھنے کی اجازت دی تھی، اُس سے پوچھو، ہم سے کوئی رشتہ نہیں ہے تمہارا۔“ اماں بی نے

ایک پل میں سارے رشتے توڑ دیئے تھے، وہ تحیر کے عالم میں عمیس عالم کی جانب مڑی تھی، جواب تک خاموش تھا، وہ چلتی ہوئی اس تک آئی تھی، جو آفس جانے کے لیے تیار کھڑا تھا، قائمہ نے ایک نظر اُسے دیکھا تھا اور سر جھکا لیا تھا کہ کہنے کو کچھ بچا نہیں تھا، مگر عمیس نے اس کا بھرپور جائزہ لیا تھا، سیلے کاٹن کے پرنٹ سوٹ میں روئی ہوئی سرخ آنکھیں، سپاٹ چہرہ جیسے بے جرم مجرم معافی کا خیال دل سے نکالے بس سزا کا منتظر ہو۔

”اندر جا کر بیٹھ جاؤ، کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی، مجھ سے پوچھے بغیر قدم باہر نکالنا تو اچھا نہیں ہوگا۔“ عمیس نے اسے سختی سے باور کروایا تھا، قائمہ نے جھک کر اٹھا کر جن میں کوئی شکایت نہ تھی اُن خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا، کیونکہ اس شخص سے تو بھلائی کی توقع تھی بھی نہیں، وہ خاموشی سے اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

”یہ کیا ہو گیا ہے آپ سب کو؟ بغیر تصدیق کے اُسے مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں؟“ سارے کزنز اس کی حمایت میں بولے تھے۔

”خبردار! کوئی اس معاملے میں نہیں بولے گا۔“ عمیس نے سب کو وارن کیا تھا، دو دن بعد قائمہ نے فاران سے کہا تھا کہ۔

”مجھے کچھ کرنا ہے پلیز! مجھے اپنا فون دو، مجھے پولیس سے مدد لینا ہے، کب تک خاموش رہوں میں؟“ تو فاران نے اسے بتایا کہ عمیس نے فاران سمیت سب کے موبائل لے لیے ہیں، پتہ نہیں کیوں قائمہ کی آخری کوشش بھی دم توڑ گئی تھی، کسی نے اس کی نہیں سنی تھی، مگر ایک دربار ایسا ہے جو سب کی سنتا ہے، اُس نے بھی سجدوں میں گڑ گڑا کر اُس رب سے مدد مانگی تھی، اُس کی مدد کی گئی تھی کہ سچے دل کی آواز آنسوؤں سے لبریز صدا وہ کبھی نہیں ٹالتا۔ ٹھیک چند دن بعد بڑے ابا نے اُسے بلایا تھا،

اُس واقعے کے بعد اُس کا پہلا بلاوا تھا، وہ خاموشی سے چلتی ہوئی باہر آئی تھی اور بڑے ابا کے پاس آ کر رُک گئی تھی، مگر بیٹھی نہیں تھی، اُسے دیکھتے ہی اماں بی اور امی اس کی طرف بڑھی تھیں۔

”بیٹا! ہمیں معاف کر دو، ہم سے غلطی ہو گئی، تم نے کچھ کہا کیوں نہیں؟“ امی کہہ رہی تھیں، وہ اب بھی خاموش تھی، اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، تب بڑے ابا نے ہی اُس کی اُلجھن دور کی تھی۔

”بیٹا! رافع صدیق کو گرفتار کر لیا گیا ہے، اُس نے اعتراف کیا ہے کہ تم بے گناہ ہو، اُس نے تم سے اپنی انا اور غرور میں بدلہ لیا تھا، ہمیں تمہارا یقین کرنا چاہیئے تھا۔“ امی نے اُس کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو وہ یک دم پیچھے ہوئی تھی۔

”آپ لوگوں نے سنی تھی میری کوئی بات؟“ اس نے انتہائی سرد لہجے میں کہا تھا۔

”سارے رشتے ختم ہو گئے تھے مجھ سے، ٹھیک ہے خدا حافظ!“ بے گناہی ثابت ہوئی تو اعتماد بحال ہوا اور اُس نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے، مگر چند قدم اٹھے تھے کہ اہنی گرفت میں بازو آچکا تھا، عمیس نے اسے اپنی جانب کھینچا تھا۔

”بہت زبان چلتی ہے تمہاری، اتنی دیر سے سب کہہ رہے ہیں، سمجھ نہیں آ رہا تمہیں؟“

”ہاتھ چھوڑیں، کوئی رشتہ نہیں ہے آپ سے بھی میرا۔“ قائمہ نے اس کی بات کاٹی تھی، سرخ آنکھیں لیے جب وہ پلٹی تو نہ جانے کیا ہوا اچانک آنکھوں تلے اندھیرا آیا تھا، اس سے پہلے کہ زمین بوس ہوتی، عمیس عالم اسے تھام چکا تھا اور اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔

”یہ شدید ذہنی دباؤ میں مبتلا ہیں، انہیں سکون کی ضرورت ہے، ایک دو گھنٹے بعد انہیں ہوش آ جائے گا۔“ ڈاکٹر نے عمیس کو کچھ ہدایات دی تھیں۔

”پاپا، چھوٹی امی! آپ سب آرام کریں، میں

سنبھال لوں گا اسے، آپ سب کو سامنے پا کر اور غصہ کرے گی۔“ اس نے سب کو سمجھا کر بھیج دیا تھا اور خود اس کے سر ہانے بیٹھ گیا تھا، سوچی ہوئی آنکھیں، چہرے پر آنسوؤں کے نشانات، کچھ ہی دن میں کتنی کمزور ہو گئی تھی وہ، جب اُسے ہوش آیا تو خود کو عمیس کے کمرے میں پا کر وہ بیڈ سے اُتری تھی کہ عمیس اس کے سامنے آ گیا تھا، ایک جھٹکے سے سارا منظر اس کی آنکھوں میں گھوما تھا اور شدید غصے کی حالت میں وہ دروازے کی سمت بڑھی تھی کہ عمیس نے راہ روک لی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ بہت پیار سے پوچھا تھا۔

”نہیں آگے سے، مجھے جانا ہے، نہیں رہنا اس گھر میں، جہاں کوئی میرا اپنا نہیں ہے۔“ گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔

”مجھے چھوڑ کے جاؤ گی، میرا کیا قصور ہے؟“ اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھر کے پوچھا تھا۔

”سب سے زیادہ قصور آپ کا ہے، آپ ہی نے تو میری پڑھائی بند کروائی تھی، اور آپ کو تو موقع مل گیا تھا، ویسے بھی نفرت کرتے تھے مجھ سے، کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی میں آپ سب۔“ اس کے ہاتھ جھٹک کر وہ دور ہوئی تھی۔

”ادھر آؤ میرے پاس، اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔“ اسے اپنی بولتی آنکھوں کے سحر میں مقید کیا تھا، اپنے قریب کیا تھا، قائمہ ہمیشہ اس کی آنکھوں سے ڈرتی تھی، سب کزنز کہتے تھے عمیس بھائی زبان سے کچھ نہ بولیں مگر اُف تو بہ... ان کی آنکھیں بولتی ہیں۔

”رافع صدیق نے نقلی خط اور تصاویر بھیجیں، تم سے انتقام لینے کے لیے اور صرف تم سے نہیں مجھ سے بھی اس کی دشمنی تھی اور وہ جانتا تھا تم میری جان ہو، میری بیوی ہو، اس لیے تمہارے ذریعے مجھے زچ کیا، مگر میری کوشش سے اب وہ جیل میں ہے،

پڑھائی بند نہیں کروائی، رُکوائی تھی، کچھ دنوں کے لیے، تاکہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے، تمہارے بہت احمق حمایتی تھے انہیں بھی بچانے کے لیے موبائل لے لیے، سمجھیں نا سمجھ لڑکی! ارے میں کیسے یقین کر لیتا؟ جس لڑکی نے کبھی اپنے مجازی خدا کو خط تو کیا ایک پھول نہ دیا ہو ڈر کے مارے، وہ کسی ابرے غیرے کو کیا خط لکھے گی؟ مجھے پتہ ہے تم کتنے پانی میں ہو، تمہاری ہمت جانتا ہوں میں۔“ اب وہ اسے زچ کر رہا تھا، قائمہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتی باہر کی جانب بڑھی تھی۔

”اے! کہاں جا رہی ہو؟ اب یہی تمہارا کمرہ ہے، مطلب ہمارا کمرہ ہے، نکاح ہو چکا تھا، سمجھ لو رخصتی بھی ہو گئی، مسز قائمہ عمیس عالم!“ اُس نے شرارت سے کہا تھا، قائمہ کی تو گویا جان نکل گئی تھی، بچ کرے میں وہ کھڑا تھا، بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔

”پلیز! مجھے جانے دیں۔“ وہ رو دینے لگی۔

”کیوں تنگ صرف تم ہی کر سکتی ہو، اب میری باری ہے، تیار ہو جاؤ۔“ وہ گھمبیر لہجے میں کہتا اس کی جانب آیا تھا۔

”بہت دور تک جانا، مگر لوٹ آنا مجھے تم سے تم ہی تک کے فاصلے اچھے لگتے ہیں۔“

عمیس نے مسکرا کر اُسے باہر جانے کا راستہ دیا تھا، مگر قائمہ نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا اور عمیس کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا تھا، ایک آنسو اس کی قمیض میں جذب ہوا تھا۔

”اب کبھی مت رونا، یہ تو عمر قید ہے تمہاری۔“ عمیس نے پوروں پر موتی چُن لیے تھے۔

”مجھے منظور ہے یہ عمر قید، آپ کی ہمراہی میں۔“ قائمہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔

سافرخ سرک اور سلکوت

کارڈور میں داخل ہوتے ہوئے عاطف کی نظر پولیس کانسٹیبل کے ساتھ کھڑے شاہ رخ تک گئی تھی جواب ای جانب آرہا تھا۔



”اگر کچھ دیر پہلے آپ آتے تو دیکھتے کیسا کھسمان کا رن پڑا تھا یہاں۔ معیز کے سپورٹرز یہ احتجاج لے کر آئے تھے کہ اس پر تشدد کر کے ہڈیاں توڑی گئی ہیں، جبکہ چھوٹے بھائی نے تو بھاگ دیا کہ اگر اس پر تشدد ہوتا تو اس وقت وہ ہاسپٹل کے بجائے قبر میں اتر چکا ہوتا۔“ عاطف کے کسی سوال کا انتظار کیے بغیر وہ تفصیل بتا رہا تھا۔

”بہت اچھا ہوا کہ چھوٹے بھائی معیز کو اس ہاسپٹل میں نہیں لائے، ورنہ زینب کے بھائی تو خون کے پیاسے ہو رہے ہیں، وہ تو پیل پڑتے معیز کے سپورٹرز پر، اگر پولیس بچ بچاؤ نہ کرتی۔“

”مہراں ابھی نیچے ملا تھا مجھے، اسے انوالو کر کے اچھا کیا، میں تو چاہتا ہوں وہ سفاک آدمی ہاسپٹل سے نکل کر سیدھا مارچریل میں جائے۔“ عاطف شدید ناگواری سے بولا تھا۔

”سارہ کیسی ہے؟ پولیس نے کوئی بیان لیا اُس سے؟“



”سارہ تو ابھی کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور زینب i.c.u میں ہے کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔“ شاہ رخ کے تشویش زدہ لہجے پر وہ مزید کچھ بول نہیں سکا تھا، تب ہی موسمو تیز قدموں کے ساتھ ان دونوں کی طرف

آئی تھی۔

”میں ابھی زینب کو دیکھ کر آ رہی ہوں، ایسڈ نے اس کے کندھے سے لے کر کہنی تک اثر دکھایا ہے، اس کی بہن سے بات ہوئی تھی میری، وہ تو بے ہوشی میں بھی تکلیف سے کرا رہی ہے، مجھ سے تو....“ مومو کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹکا تھا۔

”رونے کے بجائے تم اس کے لئے دعا کرو گی تو زیادہ بہتر ہوگا، وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔“ اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے عاطف نے اسے تسلی دی تھی حالانکہ اس وقت اس کی اپنی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

روم میں داخل ہوتے ہوئے اس نے کچھ حیرانگی سے عاشر کے بگڑے تیوروں کو دیکھا تھا، روم میں اس وقت عاشر کے دونوں بڑے بھائی، ان کی بیویاں اور بہنیں بھی موجود تھیں، سدرہ اور شمس تو مستقل سارہ کے پاس ہی تھے۔

”اتنی دور یہ تنہا گھر سے نکل کر چلی گئی اور تم کہہ رہی ہو کہ تمہیں کچھ خبر نہیں، کل کو خدا نخواستہ اس سے بھی بڑا حادثہ ہوا تو تب بھی تم یہ بیان دو گی؟“ عاشر بگڑے انداز میں سدرہ سے باز پرس کر رہا تھا۔

”اگر تم اس کا خیال نہیں رکھ سکتی ہو تو بہتر ہے کہ اسے ہمارے حوالے کر دو۔“ عاشر کے مزید کہنے پر شیت کی رگوں میں خون کھول اٹھا تھا۔

”عاشر! یہ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہے جو تم حوالے کرنے کی بات کر رہے ہو، تمہارا غصہ جائز ہے مگر اس قسم کی غلط بات دوبارہ مت کرنا، ناگہانی آفات کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ نازل ہو سکتی ہیں، سدرہ اسے زبردستی باندھ کر نہیں رکھ سکتی تھی کیونکہ وہ جانا چاہتی تھی، اسے بھی نہیں معلوم ہوگا کہ وہ کس مشکل میں گرفتار ہونے والی ہے۔“ شمس مزید عاشر کی باتیں برداشت نہیں کر سکے تھے اس لیے کچھ برہم ہو کر بولے تھے۔

”وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں عاشر! جو ہونا تھا ہو گیا، ہمیں تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ سارہ محفوظ ہے۔“ شمس کے تیور بھانپ کر عاشر کے بڑے بھائی عظیم نے بات کو سنبھالا تھا۔

”سوری! میں واقعی کچھ زیادہ ہی کہہ گیا۔“ یکدم احساس ہونے پر عاشر نے شمس کے ساتھ سدرہ کو بھی مخاطب کیا تھا۔

”تم کیوں معذرت کر رہے ہو؟ سارا قصور تو اس کا ہے۔“ بڑی دیر سے ضبط کیے بیٹھیں سدرہ اس پر بھڑکی تھیں۔

چادر میں چہرہ چھپائے لیٹی تھی۔

”اس کی وجہ سے ہم یہاں پریشان بیٹھے ہیں اور ایک پڑی ہے i.C.U میں....“

”سدرہ!....“ شمس نے ناگواری سے انہیں روکا تھا۔

”بدلے کی آگ میں جل رہا تھا وہ شخص، آج یا کل اسے اپنی اوقات دکھانی تھی، شکر ہے کہ سارہ وہاں موجود تھی اور جانے اس لڑکی کا کیا حال ہوتا۔“

”اگر ابھی سارہ ڈسچارج ہو جاتی ہے تو ہم اسے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں؟“ عظیم کی بیوی نے شمس سے اجازت چاہی تھی۔

”یہ ابھی کافی انجڑ ہیں، میری بات ہوئی ہے ڈاکٹر سے، انہوں نے منع کر دیا ہے ابھی ڈسچارج کرنے سے۔“

کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ سرد لہجے میں سب کو اطلاع دیتا روم سے نکل گیا تھا۔ باہر آتے ہی اس نے اشارے سے مومو کو اپنی طرف بلا یا تھا جو کاریڈور کے آخری سرے پر کچھ لڑکیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

”چھوٹے بھائی! ان لڑکیوں کی ہمت نہیں ہو رہی یہاں آنے کی، دو منٹ کے لیے میرے ساتھ آ جائیں وہ آج

سے آؤ گراف لینا چاہ رہی ہیں۔“ قریب آتے ہی مومو نے التجائی نظروں سے اس کے خطرناک سنجیدہ چہرے کو دیکھا تھا۔

”ان سے کہہ دو فضول کاموں کے لئے وقت نہیں ہے میرے پاس، یہاں تفریحاً نہیں گھوم رہا میں۔“ اس کے بری طرح گھرکنے پر مومو خفیف سی ہو گئی تھی۔

”اور ذرا غور سے سنو، اس کے جو ویل وٹرز بیٹھے ہیں وہ چلے جائیں تب بھابی سے کہہ دینا کہ سارہ ڈسچارج ہو گئی ہے، اسے لے کر گھر پہنچیں۔“ سختی سے اسے ہدایت دیتا وہ اپنے سیل پر آنے والی کال ریسیو کرتا آگے بڑھ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

نیند ٹوٹی تھی تو اس نے خالی خالی نظریں ارد گرد دوڑا کر وجہ جاننے کی کوشش کی تھی، مگر وال کلاک میں وقت دیکھتی اٹھ بیٹھی تھی، لبوں سے ایک سسکی سی نکلی تھی کہ زخمی وجود ذرا سی حرکت پر چنچنے لگا تھا، چند لمحوں تک وہ خاموشی سے بیٹھی زینب کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی، زینب دنیا و مافیاء سے بے خبر جس اذیت کے کھنور میں پھنسی تھی، اس اذیت کے سامنے تو اس کے زخم کچھ بھی نہیں تھے، اس کی آنکھوں میں سرچیں سی بھرنے لگی تھیں، ماحول اتنا خاموش اور گھمبیر تھا کہ اسے وحشت ہونے لگی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی کے آثار کمرے میں ہیں نہ کمرے کے باہر، ورنہ عموماً شیری کی آوازیں تو سنائی دے ہی جاتی تھیں، کمرے سے باہر آتے ہوئے اس نے ویران پڑے لاؤنج کو دیکھا تھا، ابھی وہ سدرہ کے کمرے کی جانب بڑھنے کا ارادہ کر رہی تھی جب ڈرائنگ روم سے ابھرتی مانوس آوازیوں نے اس کے قدم روک لیے تھے۔

”تمہاری منطق میری سمجھ سے باہر ہے، اگر تمہارے دلچسپی نہ لینے کے باوجود سارہ نے ایک سے زائد بار زینب کا ذکر جس مقصد کو سامنے رکھ کر کیا ہے تو اس کے پیچھے کوئی تو محرک ہوگا۔“ شیت کی آواز بخوبی سنائی دی تھی۔

”شیت! اب تم دوبارہ اس موضوع پر مجھ سے کوئی بحث نہ کرو۔“ عاطف کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”مگر میں پھر تم سے کہوں گا کہ اگر سارہ کسی لڑکی کو تم سے منسلک کرنا چاہتی ہے تو یقیناً وہ لڑکی معمولی نہیں ہو سکتی۔“

”مجھے اس کے معمولی یا غیر معمولی ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”عاطف! سارہ کبھی تمہیں نہیں بتائے گی مگر مجھے یقین ہے کہ زینب انٹر سٹڈ ہے۔“ شیت نے جیسے اسے کچھ سمجھانا چاہا تھا۔

”وہ ایک بے وقوف لڑکی ہو سکتی ہے جو ایک اسٹک کے سہارے چلنے والے شخص کی ہمدردی میں حد سے بڑھنے کی خواہش رکھتی ہے اور میں سارہ کی بات مان کر اپنے شرمندہ ہونے کے مواقع حاصل نہیں کرنا چاہتا، اس کا فیائی بعد میں جیسا بھی نکلا مگر اس کے بڑوں نے یہی دیکھ کر اسے چنا ہوگا کہ وہ ہر طرح سے مکمل ہے، وہ ان کی بیٹی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتا ہے، پھر میں کیسے....؟“ یکدم ہی عاطف کے خاموش ہو جانے پر شیت جو صوفے پر نیم دراز تھا چونک کر اٹھ بیٹھا تھا۔

”آؤ سارہ! وہاں کیوں رکی ہو؟“ اسٹک تھام کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے عاطف نے کچھ گڑبڑا کر اس کے سپاٹ نہرے کو دیکھا تھا۔

”جب آپ مجھے زینب کے لیے بار بار انکار کر چکے ہیں تو پھر اپنے دوست کے ساتھ بیٹھ کر اسے ڈسکس کیوں کر رہے ہیں؟“ وہ سرد لہجے میں عاطف سے سوال کر رہی تھی۔

”یہاں کوئی اسے ڈسکس نہیں کر رہا ہے۔“ شیت کو اچھا نہیں لگا تھا اس کا یہ کہنا۔

”میں تم سے بات نہیں کر رہی ہوں، اس لیے تم خاموش رہو۔“ سارہ کے سخت ناگوار لہجے پر شیت کے چہرے کا رنگ

کے انکار کی اہمیت خود ان کے نزدیک کچھ نہیں، سارہ نے تو گن گن کر بدلے لینے ہیں ان سے۔ مومو کی بات کا ثاؤد بولا تھا۔

”واصف بھائی کی طرح نہ لٹک جانا جو بیٹھے ہیں عاطف بھائی کے انتظار میں۔“ وہ بیڑاری سے بولی تھی۔
 ”ایسا کچھ نہیں ہوگا، یہ آنے والا نیا سال ہمیں جدا جدا نہیں رہنے دے گا، ویسے بھی میں اب اور زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔“ مہم می مسکراہٹ کے ساتھ وہ گہری نظروں سے اس کے گلانی ہوتے رخساروں کو دیکھ رہا تھا۔
 ”اچانک مجھ پر مہربان ہو کر یہ کیسے سوچ لیا تم نے؟“ اس کی دالہا نہ نظروں کی تپش سے جھٹکتی وہ اٹھلائی تھی۔
 ”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے مومنہ! تم کیا جانو میں تمہارے بارے میں کیا کیا سوچتا ہوں۔“ وہ ٹھنڈی آہ بھر کے بولا تھا۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا لپچڑا انسان؟“ پلک جھپکتے ہی وہ پھر اُئی تھی تو شاہ رخ سرعت سے اُٹھ کر دوڑ گیا تھا۔
 ”بتا کر جاؤ مجھے خبیث، کیا کیا سوچتے ہو تم؟“ وہ غزائی ہوئی اس کے پیچھے گئی تھی جو قہقہے لگاتا مزید اسے جلاتا بھاگ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

لاؤنج میں آتے ہوئے شمس نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا جو خاموش بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔
 ”ہاسپٹل گئی تھیں تم چیک اپ کے لیے؟“
 ”جی، شان کے ساتھ گئی تھی۔“ سوگوار، مدھم لہجے میں وہ بولی تھی۔
 ”زینب کی طبیعت کیسی ہے؟“ ان کے سوال پر وہ سر جھکائے بس خاموش رہی تھی۔
 ”سارہ! مجھے یہ بتاؤ اس طرح خاموش اور کمرے میں بند رہنے سے کیا زینب بالکل صحت یاب ہو جائے گی؟“
 کمرے کھڑے ہی وہ ناراضی سے پوچھ رہے تھے۔
 ”کسی سے بات کرنے کا دل ہی نہیں چاہتا۔“ وہ بھرائے لہجے میں بولی تھی۔

”یہ مایوسی بالکل نہیں بچ رہی تم پر، تمہیں تو خود کو مضبوط رکھ کر زینب کا حوصلہ بڑھانا ہے، اسے نارمل زندگی کی طرف واپس لانا ہے، اس کے لئے جو کچھ تم کر سکتی ہو وہ اس کے گھر والے بھی نہیں کر سکتے، اسے تمہاری ضرورت ہے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ ان کے سوال پر وہ اس بار بھی خاموش رہی تھی۔

”چلو اٹھو ذرا، باہر جاؤ، طبیعت کچھ سنبھلے گی، عاطف تمہارا پوچھ رہا تھا، میں نے اس سے کہا ہے کہ تمہیں بھیج رہا ہوں۔“ نرم لہجے کے ساتھ شمس نے اس کے سر کو دھیرے سے تھپتھپایا تھا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اٹھنا پڑا تھا۔
 منتظر بیٹھے عاطف کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے گراؤنڈ میں موجود شیٹ کو دیکھا تھا، جو بچوں کو باسکٹ بال کھیلنے کے لئے رکھا ہوا تھا۔

”میں تمہاری طبیعت معلوم کرنے آنا چاہتا تھا، مگر پھر تمہاری ناراضی کے پیش نظر قدم رک گئے۔“ عاطف نے نجیدگی سے کہا تھا۔

”میں آپ سے ناراض نہیں ہوں، شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ سے بہت غلط طریقے سے بات کی تھی۔“ نظر نہ کئے وہ مدھم آواز میں بولی تھی۔

”تم نے مجھے موقع نہیں دیا سارہ! ورنہ میں تمہیں بتاتا کہ مجھے اپنی کسی کی پر کوئی احساس کمتری کبھی نہیں رہا، میری کمی کمر میں کسی کو محسوس نہیں ہو سکتی، تمہیں بھی نہیں، شاید زینب کو بھی نہیں، مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ زینب کے گھر والوں کو یہ محسوس ہو جائے؟“ بلا تہدید عاطف نے سوالیہ لہجے میں کہا تھا۔

”اگر وہ مضبوط بیک گراؤ نڈر رکھتے والی ہائی اسٹیٹس لڑکی ہوتی تو وہ کبھی آپ کو بے وقوف نہ لگتی، میں تو سمجھتی تھی کہ آپ جیسے انسان کے نزدیک اس کی سادگی کی بہت اہمیت ہوگی مگر.....“ شدید تاسف سے بولتی وہ ایک پل کوڑکی تھی۔

”کسی کے دل میں اپنی محبت اور جگہ بنانا آسان نہیں ہے مگر آپ کو کوئی محنت کیے بغیر یہ مقام مل گیا، اس کے باوجود بدلے میں آپ کسی کے جذباتوں کی قدر نہیں کر سکے، محبت اور ہمدردی میں فرق آپ سمجھتے ہیں یا نہیں؟“ چبھتے لہجے میں وہ عاطف سے سوال کر رہی تھی۔

”آپ مجھے صاف یہ بتا دیتے کہ مجھ پر کوئی بھروسہ کر کے آپ اپنی شرمندگی کے مواقع نہیں حاصل کرنا چاہتے تھے، اگر آپ کو اس کے جذبے صرف ہمدردی لگتے ہیں تو یہ آپ کی غلطی ہے اس کا کوئی قصور نہیں، اور نہ ہی یہ اس کا قصور ہے کہ آپ اسٹک کے بغیر وہ قدم نہیں چل سکتے۔“

”سارہ! بہت زیادہ بول چکی ہو تم، مگر بس اب اس سے زیادہ نہیں۔“ یکدم ہی شیٹ نے برہمی کے ساتھ اسے روکا تھا۔

”براہ مہربانی اب زینب کا نام بھی میں کسی کی زبان پر آتا نہ سنوں، ہاسپٹل کے کمرے میں پڑی اس بے وقوف لڑکی کو اپنی بے وقوفیوں کی سند کسی سے نہیں چاہیے۔“ تیز نظروں سے عاطف کو دیکھتی وہ بولی تھی اور اگلے ہی پل ڈرائنگ روم سے نکل گئی تھی۔

”عاطف! میں سارہ کی طرف سے تم سے معذرت.....!“
 ”نہیں یہ مت کہو، اس نے کچھ غلط نہیں کہا۔“ عاطف نے سنجیدگی کے ساتھ اسے روکا تھا جبکہ شیٹ نے شرمندہ ہو کر اس کے چہرے پر لہراتے سائے کو دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

کرسی پر پیر چڑھائے بیٹھی وہ گرم صم کیفیت میں تھی جب اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتا شاہ رخ ٹیبل کے کنارے ہی بیٹھ گیا تھا۔

”کہاں گم ہو؟ کل سے اب دکھائی دے رہی ہو مجھے۔“

”کچھ نہیں، بس ایسے ہی طبیعت بیزار ہو رہی ہے، سارہ اور زینب کی کنڈیشن نے ہر چیز سے دل اُچاٹ کر دیا ہے۔“ پیشانی پر بکھرتی تراشیدہ ٹیس سینٹے ہوئے وہ واقعی روہا سی ہوئے گی تھی۔

”زہر لگ رہی ہو اس طرح منہ لٹکائے۔“ شاہ رخ نے خشمگین نظروں سے اس کے آزرہ چہرے کو دیکھا تھا۔
 ”سارہ بس اپنی دوست کی وجہ سے خاموش سی ہو گئی ہے، فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تمہارے لیے یہ کہنا آسان ہے، مگر میرے لیے عمل کرنا مشکل ہے۔“ ناخن کریدتے ہوئے وہ افسردگی سے بولی تھی۔

”سیدھی دل میں اتر رہی ہو اس وقت۔“ شاہ رخ نے وارفتگی سے اس کے ہونٹوں پر بکھرتی مسکراہٹ کو دیکھا تھا۔
 ”تیار ہو جاؤ، میں کل ہی تمہاری اور اپنی شادی کی بات کر رہا ہوں بھابی سے۔“ وہ یکدم ہی سنجیدگی سے بولا تھا۔

”تم مذاق کر رہے ہو؟“ مومو مشکوک تھی۔
 ”کم از کم اس معاملے میں، میں مذاق برداشت نہیں کر سکتا۔“

”مجھے خواب مت دکھاؤ، چھوٹے بھائی سے پہلے تمہاری شادی ہو نہیں سکتی اور وہ تو پہلے ہی انکار کر چکے ہیں۔“
 ”مجھے سب معلوم ہے، ان سے پہلے تو اپنی شادی کا میں سوچ بھی نہیں سکتا، مگر شادی ساتھ ساتھ تو ہو سکتی ہے۔“

”ایک بار مجھ پر بھروسہ کر کے آپ اپنے خدشات کا ذکر تو کرتے، میں خود کو داؤ پر لگا دیتی، مگر کوئی انگلی آپ کی طرف نہ اٹھنے دیتی، آپ نہیں جانتے خدا نے آپ کو جو منفرد شخصیت اور آپ کی زبان میں جو شیرینی دی ہے وہ آپ کی ہر کی غالب ہے، آپ کی ذات سچ میں عزت و محبت کے قابل ہے۔“ وہ غم آنکھوں کے ساتھ بولی تھی۔

”سارہ! تمہارے دل میں اتنی زیادہ اہمیت ہے میرے لیے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ عاطف نے دنگ نظروں سے اس کے جھکے سر کو دیکھا تھا۔

”مگر اب ان سب باتوں کا ذکر بے معنی ہے، اب سب کچھ بدل چکا ہے۔“ وہ مدھم آواز میں بولی تھی جس پر عاطف چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گیا تھا۔

”نہیں! کوئی مزید کتنا عرصہ ہاسپٹل میں رہنا ہوگا؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”ابھی کچھ کنفرم نہیں ہے۔“

”وہاں اس کے علاج سے تم مطمئن ہو؟“ عاطف نے بغور اس کے پریشان چہرے کو دیکھا تھا۔

”مطمئن تو ہوں مگر.....!“ وہ جھجک کر رکی تھی۔

”بات مکمل کرو۔“ عاطف چونکا تھا۔

”اس ہاسپٹل میں پیسہ پانی کی طرح خرچ ہو رہا ہے، نہ سب کی فیملی فنانسلی بہت اسٹرونگ نہیں ہے، وہ سب اپنے خود دار ہیں کہ کسی سے مدد بھی نہیں لیں گے، ہاسپٹل کے اخراجات کسی نہ کسی طرح تو پورے ہو جائیں گے، مگر نہ سب کی سرجری ہونی بھی تو ضروری ہے۔“ وہ پریشان انداز میں بتا رہی تھی۔

”اس کی سرجری ضرور ہوگی، اگر تم میری مدد کرو گی تو میں یہ کام آسانی سے کر سکتا ہوں۔“ عاطف کے سنجیدہ لہجے پر وہ دنگ ہوئی تھی۔

”اس معاملے میں نہ سب کے بھائی میری مداخلت بھی برداشت نہیں کر سکتے، پھر آپ ہمدردی کرنے کا یہ حق کیے حاصل کر سکتے ہیں؟“

”ہمدردی کے لفظ استعمال کر کے مجھے ہرٹ مت کرو سارہ! جو حق میں حاصل کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد اگر میں اس لڑکی کے لئے اپنا آپ بھی فروخت کر دوں تو کسی کو اعتراض کرنے کا حق بھی نہیں ہوگا اور تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“ عاطف کے حتمی لہجے پر وہ بس دنگ بیٹھی ساکت نظروں سے اس کے پرسکون چہرے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”چچی جان تو بہت خوش ہو جائیں گی، اکثر باتوں باتوں میں وہ مجھے باور کروا چکی ہیں کہ وہ اب مومو کی شادی کرنا چاہتی ہیں، انہوں نے تو ساری تیاری مکمل کر رکھی ہے۔“ کھانے کے دوران سدرہ مسلسل خوشی کا اظہار کرتیں شاہ رخ کو بھی خوشی سے پھلار رہی تھیں۔

”ظاہر ہے اپنی بلا ہمارے سر منڈھ کر چچی نے خوش ہی ہونا ہے۔“ شمس کے سنجیدہ لہجے پر شان نے ہنستے ہوئے رخ کو دیکھا تھا۔

”شمس! جلدی کھانا ختم کریں، واضح بھی گھر میں ہوگا، سب کے سامنے بات ہو جائے گی۔“ سدرہ مزید عجالت میں بولی تھیں، جس پر سارہ نے مسکراتی نظروں سے شاہ رخ کو دیکھا تھا جو سنجیدہ رہنے کی کوشش میں کامیاب تھا۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے کھانے سے ہی ہاتھ روک لینے چاہئیں، پتہ نہیں کس بات کی جلدی ہے تمہیں؟“ پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے شمس نے خشکی نظروں سے سدرہ کو دیکھا تھا جو فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔

”بس اٹھیں، اب چلتے چلتے پانی پی لیجئے گا۔“ سارہ نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا جو زبردستی شمس کا بازو پکڑے وہاں سے لے ہی گئی تھیں۔

”ایسی بھابی ہونی چاہیے ہر دیو کی، کیوں چھوٹے بھائی؟“ شاہ رخ نے اس سے تائید چاہی تھی جو ان کی کیے اپنے کھانے کی طرف متوجہ رہا تھا۔

”سارہ! ابھی بھی وقت ہے سوچ لو، شاہ رخ تمہارے لیے اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے۔“ شان نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہوگی، ویسے بھی میری بہن کو مشورہ دیا گیا ہے کہ میرے لیے کسی بہترین شخص کا انتخاب کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ جلد کسی بہترین شخص کو میرے لیے ڈھونڈ لیں گی، مجھے بھی اب اسی شخص کا انتظار ہے۔“ طنزیہ لہجے میں بولتے ہوئے سارہ نے ایک نگاہ شیٹ پر ڈالی تھی جو ایک سنگتی نظر اس پر ڈالتا سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ ایک جھٹکے سے اٹھا تھا اور کسی بھی جانب دیکھے بغیر وہاں سے چلا گیا تھا۔

”اب نہیں بچنے والی ہو تم۔“ شان نے اسے ڈرایا تھا۔

”تو میں کون سا چھوڑنے والی ہوں۔“ وہ نخوت سے بولی تھی۔

”اب بنا ہے جوڑ دنگ۔“ شاہ رخ نے ٹیبل بجا دی تھی، جبکہ وہ ناگواری سے ان دونوں کے ہنستے چہرے دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

دستک دے کر وہ کمرے میں داخل ہو گئی تھیں۔

”شیٹ! تم نے کیوں ڈانٹ دیا شان کو، وہ دودھ کا گلاس ہی تو دینے آیا تھا؟ نہیں چاہیے تھا تو منع کر دیتے، وہ ناراض ہو گیا ہے۔“ لائٹ آن کرتے ہوئے وہ اسے گھر کر رہی تھیں جو تکیے میں چہرہ چھپائے لیٹا تھا۔

”میں کیا پوچھ رہی ہوں، کیوں ڈانٹ کر بھگایا تم نے شان کو؟“

”آپ اسے بلائیں، میں اس کے پیروں میں بیٹھ کر معافی مانگ لیتا ہوں۔“ تکیہ چہرے سے ہٹا کر وہ بگڑے انداز میں بولا تھا اور پھر دوبارہ چہرہ تکیے میں چھپایا تھا۔

”آخر ہوا کیا ہے؟ کیوں اتنے آگ بگولہ ہو رہے ہو؟“ سدرہ نے ہنستے ہوئے اس کے شانے کو ہلایا تھا۔

”کچھ نہیں ہوا ہے، میری فکر نہ کریں گھر کے باقی لوگوں کی فکر کریں۔“ ناراضی سے بولتا وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

”اتنے بڑے ہو گئے ہو مگر حرکتیں تمہاری ابھی بھی بچوں جیسی ہیں۔“ مسکراتے ہوئے سدرہ نے اس کے بکھرے بال سنوارنے چاہے تھے مگر وہ سر جھٹکتا پیچھے سرک گیا تھا۔

”ہوا کیا ہے؟ چہرہ دیکھو آئینے میں، شیری بھی ہنس پڑے گا تمہیں دیکھ کر۔“ سدرہ بے ساختہ ہنسی تھیں، تب ہی شاہ رخ دندنا تا ہوا چلا آیا تھا۔

”تم کیوں آئے ہو یہاں؟“ شیٹ نے ناگوار نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”سوئے آیا ہوں، پیچھے سرک جائیں۔“ شاہ رخ ڈھٹائی سے بولا تھا۔

”نورا چلے جاؤ میرے کمرے سے، ایک سیکنڈ بھی نہیں رکنے دوں گا یہاں۔“ وہ بگڑ کر بیڈ سے اتر تھا۔

”میری خوشی دیکھی نہیں جا رہی ناں تم سے؟ دو دن میں تمہیں جلا جلا کر سورج مکھی سے کالا گلاب نہ بنا ڈالو ناں بدل دینا۔“ چہرے پر ہاتھ پھیرتا وہ شیٹ کو جتا رہا تھا، مگر اگلے ہی پل بلبلاتا تھا جب شیٹ ایک ہاتھ میں اس کی گردن دبوے کمرے سے کھینچتا لے گیا تھا، جبکہ سدرہ ہول کر دونوں کے پیچھے گئی تھیں، لاؤنج میں موجود سارہ نے حیرت سے اوپر دیکھا تھا جہاں شاہ رخ ایک ہی دھکے میں لڑکھڑاتا سیڑھیوں کی طرف آیا تھا۔

”دیکھو دنیا والو! یہ کس طرح اپنے چھوٹے بھائیوں پر تشدد کرتے ہیں۔“ شاہ رخ دہائی دے رہا تھا۔
 ”اس کو سمجھالیں ورنہ ماروں گا اسے۔“ شیث نے بگڑے انداز میں سدرہ سے کہا تھا، جو بے شکل ہنسی رو کے کھڑی تھیں۔
 ”چھوٹے بھائی! آپ اتنے خوش باش کیوں نظر آ رہے ہیں؟“ کمرے سے باہر آتے شان نے پوچھا تھا، مگر اگلے ہی پل اس کے تیروں پر بدک کرواپس کمرے میں گھس گیا تھا۔
 ”مجھے پتا ہے تم مجھ سے جل رہے ہو۔“ شاہ رخ کی لکار پر پھر وہ بھڑک کر اس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا، مگر سدرہ درمیان میں آ گئی تھیں۔

”بس کرو، کیوں اتنا غصہ کر رہے ہو؟“ سدرہ نے ہنستے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف کیا تھا۔
 ”پاگل ہو گیا ہوں میں۔“ وہ بری طرح جھجھلاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔
 ”بہت زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سارہ نے خشمک نظروں سے شاہ رخ کو گھورا تھا۔
 ”سارہ جی! رتی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔“ وہ مزے سے بولا تھا۔
 ”شاہی! اب دوبارہ اسے کچھ مت کہنا ورنہ خیر نہیں ہے۔“ سدرہ اسے تاکید کرتیں کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں جہاں شمس کو دیکھتے ہی ان کی ہنسی پھر شروع ہو گئی تھی۔
 ”تم دیور بھابی مل کر میرے بچے کو کتنا تنگ کر رہے ہو۔“ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے شمس نے کہا تھا۔
 ”آپ کے بچے نے بھی ہم سب کو کم تنگ نہیں کیا ہے، ویسے شاہ رخ کا آئیڈیاز بدست ہے، شیث شادی جیسا معرکہ پہلے شاہی کو سر ہرگز نہیں کرنے دے گا۔“ وہ بولی تھیں۔
 ”اس آئیڈیے میں پہلا فائدہ تو شاہی کو ہی حاصل ہوا ہے، کائیاں آدمی ہے وہ۔“ شمس کے کہنے پر سدرہ ایک بار پھر ہنس پڑی تھیں۔

☆.....☆.....☆

مضطرب نظروں سے سارہ نے اس کے برف کی طرح سفید اور نقاہت زدہ چہرے کو دیکھا تھا اور پھر مدھم آواز میں اسے پکارتے ہوئے اس کے سرد ہاتھ کو تھاما تھا، اس کی زندگی سے خالی بے رونق آنکھوں نے سارہ کے دل کی حالت عجیب کر دی تھی، مگر وہ پھر بھی لبوں پر مسکراہٹ سجاتی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھی۔
 ”کیوں جینے کی خواہش سے منہ پھیر رہی ہو، اتنے محبت کرنے والے رشتوں کو کیوں اذیت سے دوچار کر رہی ہو؟“ وہ مدھم لہجے میں بولتی اس کی بند آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔
 ”جب جینے کی خواہش باقی نہ رہ جائے تو انسان بے حس ہو ہی جاتا ہے۔“ کسی کھائی سے زینب کی آواز ابھری تھی۔
 ”بوجھ بن گئی ہوں میں خود سے جڑے ہر رشتے پر، میرا جھلسا وجود اس نے پہلے کہ خود میرے لیے ناقابل برداشت ہو جائے، تم دعا کرو مجھے نجات مل جائے۔“
 ”خدا نہ کرے.....!“ سارہ دھک سے رہ گئی تھی۔
 ”اتنی مایوسی زینب.....! اتنی بیزاری.....؟“ اس کی بند آنکھوں سے گرتے گرم قطرے سارہ کو اپنے دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے۔

”تم تو خوش نصیب ہو کہ اللہ نے تمہیں آزمائش کے لیے پنا ہے، وہ کتنی محبت کرتا ہے تم سے اس کا اندازہ بھی تم نہیں لگا سکتیں، مگر میں نے دیکھا ہے وہ ابلیس بالکل تمہارے سامنے کھڑا جو نقصان تمہیں پہچانا چاہتا تھا کس طرح ناکام ہو کر اب لاچار پڑا ہے، اور تم.....! تمہارے چہرے پر ایک خراش تک نہیں آئی ہے زینب! اس مہربان ہستی کا شکر ادا کرنے کے

لیے میرے پاس الفاظ تک نہیں ہیں، تمہارے یہ زخم بھی وقت کے ساتھ مندمل ہو جائیں گے زینب! کیا اب تک تمہیں احساس نہیں ہوا کہ اللہ کتنی محبت رکھتا ہے تم سے؟ تمہیں نقصان پہنچانے والا سیاہ دھبہ لگا چکا ہے اپنے چہرے پر، اور تم، تم کتنی محبتوں، کتنی دعاؤں میں گھری ہو، کس طرح اس نے تمہاری نگہداشت کی ہے، محفوظ کیا ہے، سرخرو کیا ہے، کیا تمہیں احساس نہیں ہوا؟ کیا وہ تمہیں اپنی شہرہ رگ کے قریب محسوس نہیں ہوتا؟“ زینب کے چہرے کے گرد ہاتھ رکھے وہ اس کی سہکت نظروں میں دیکھتی بولتی چلی گئی تھی۔ خاموشی کے ساتھ وہ زینب کی سسکیاں سنتی رہی تھی اور پھر دھیرے سے اس کی ہنسی آنکھوں اور ترچہرے کو صاف کیا تھا۔

”جانتی ہو، عاطف تمہارے لیے بہت فکر مند ہیں، روز وہ مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھتے ہیں، مگر یہاں آتے ہوئے جھکتے ہیں۔“ اس کے ہاتھ کی پشت کو سہلاتے ہوئے سارہ نے مدھم آواز میں بتایا تھا۔
 ”وہ فون پر تمہاری خیریت تم سے دریافت کرنا چاہتے ہیں، کیا تم ان سے بات کرو گی؟“ سارہ کے سوال پر اس کی بے یقین نظریں گرم سیال سے دھندلانے لگی تھیں۔

”مجھے ان کے ترس کی ضرورت ہے نہ ہمدردی کی۔“ وہ لرزتی آواز میں بولی تھی۔
 ”ایسا مت کہو زینب! وہ بہت.....!“
 ”مجھے ان کا ذکر نہیں سننا۔“ آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے سارہ کو روک دیا تھا۔
 ”میں نے تم سے کہا تھا کہ ان کے لیے جن جذبات کا اظہار تم نے کیا ہے ایک دن تمہارے لیے بھی وہ کچھ ایسے جذبات کا اظہار کریں گے، تمہیں خوشی نہیں ہوئی کہ میری پیشن گوئی کسی قدر درست ثابت ہوئی ہے؟“ سارہ کے سرگوشیانہ لہجے پر زینب نے چہرہ دوسری جانب پھیر لیا تھا، جس پر سارہ ناچاہتے ہوئے بھی مسکرا اٹھی تھی۔
 ”بس اب جلدی سے اس ہاسپٹل سے نکلو، کوئی بہت بے چینی کے ساتھ دن گن گن کر تمہارے لوٹنے کا انتظار کر رہا ہے۔“ اس کے مسکراتے لہجے پر بھی زینب نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

آواز لگانے پر وہ اوپر جاتے ہوئے اس جانب متوجہ ہوا تھا اور بس ایک نظر اس پر ڈالی تھی، جو اس کی جانب دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔
 ”ارے پکڑ کے لاؤ اسے، اتنی محنت کی ہے میں نے اس کی سڑی شکل پر۔“ شاہ رخ سے کہتے ہوئے اس نے سارہ کو گھورا تھا۔
 ”انہیں پکڑ کے لانے سے بہتر ہے اس کو ہی اوپر لے جاؤ ان کے کمرے میں۔“ شاہ رخ کے مشورے پر وہ بس اسے ناگواری سے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”اندھیر مچی ہے کیا.....! لاکھوں روپے خرچ کرو پہلے پھر میں خود اسے لے کر جاؤں گی اس کے کمرے میں، اتنی بڑی رقم تو میرج بال والے ہی لے لیں گے۔“ بولتے ہوئے مومو نے کھلکھلا کر سارہ کے بگڑتے چہرے کو دیکھا تھا۔
 ”اتنی رقم خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، سارہ تو اتنی رحم دل ہے ایسے ہی پہنچ جاتی ہے ان کے کمرے میں، کلاب جامن لے کر۔“ وہ مسکراتے ہوئے سارہ کو دیکھ رہا تھا، جس کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔

”ارے.....! زکو میں تو مذاق کر رہا تھا یا!“ وہ بگڑے انداز میں خاموشی سے جارہی تھی، جب شاہ رخ نے فوراً ہی اسے روکنے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑا تھا، اور اس کے ساتھ ہی سارہ کی چیخ بلند ہوئی تھی۔

”بیٹا آج تو گیا، اب تجھے کوئی میرے ہاتھوں سے نہیں بچا سکتا، کلمہ پڑھنے کا وقت بھی نہیں دوں گی۔“ مومو غزاتی

ہوئی آگے بڑھی تھی۔
 ”رانا بھائی! تمہیں قسم ہے اگر تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو۔“ اس کے ہاتھوں سے بچے ہوئے شاہ رخ وھاڑا تھا۔
 ”کیا کر رہی ہو تم۔۔۔ پھر دورہ پڑ گیا کیا تمہیں؟“ کمرے سے باہر آتے ہوئے شمس نے ناگواری سے مومو کو دیکھا تھا۔

”بڑے بھائی! آج درمیان میں نہیں آنا، میں بتا دیتی ہوں آج یہ نہیں بچے گا، آج تو میں اسے ادھیڑ کر ہی دم لوں گی۔“ شاہ رخ کا کار اپنے قبضے میں لیے وہ بگڑ کر شمس سے بولی تھی۔
 ”ارے چھوڑیے ہمیں، شرم تو آتی نہیں ہے، دن دھاڑے مردوں کے کپڑے کھینچتے ہوئے۔“ ایک جھٹکے سے اپنا کارل چھڑاتے ہوئے شاہ رخ بگڑا تھا۔

”میرا دماغ مت گھمانا شاہ رخ! میں بتا رہی ہوں، دوبارہ میرے سامنے یہ حرکت کی تو ادھیڑ ڈالوں گی۔“ وہ غصیلے انداز میں شاہ رخ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی تھی۔
 ”بات سنو! وہ کیا تمہیں کوئی رضائی کد نظر آ رہا ہے، جو ادھیڑ ڈالو گی، ہوش میں ہو یا نہیں؟“ شمس نے اسے گھبراہٹ سے دیکھا تھا۔

”بڑے بھائی! یہ جو کہہ رہی ہے ناں اسے کرنے دیں اور آپ بھی دیکھیں، چلو بھی آ جاؤ میدان میں۔“ شمس کو مخاطب کرتے ہوئے شاہ رخ نے اسے دعوت دی تھی۔

”ارے جا، منہ نہ لگ میرے۔“ ناک پر سے مکھی اڑاتے ہوئے مومو نے ناگواری سے سر جھٹکا تھا۔
 ”تمہارے منہ لگنا بھی کون چاہتا ہے، آ جاؤ آج تو کر ہی دو میرا تیا پانچ۔“ شاہ رخ سینہ ٹھونک کر چیلنج کرتا ہوا اس کی طرف بڑھا تھا۔

”بڑے بھائی! آپ سمجھا لو اسے ورنہ۔۔۔!“ مومو نے بری طرح کھول کر شمس کو مخاطب کیا تھا۔
 ”اب نہیں کیوں لا رہی ہو درمیان میں؟“ شاہ رخ نے اسے گھورا تھا، دوسری جانب سارہ نے مسکراتے ہوئے شمس کو دیکھا تھا جو مسکراتے ہوئے ان دونوں کو ہی دیکھ رہے تھے۔

”اب کھڑی گھور کیا رہی ہو، آؤ ادھیڑ مجھے، شکل جا کر پہلے آئینے میں دیکھ لو، نفسیاتی۔۔۔!“ شاہ رخ نے اسے گھورا تھا۔

”سن رہے ہیں، نفسیاتی بول رہا ہے مجھے، ابھی میں نے کچھ کہہ دیا تو سب کو آگ لگ جائے گی۔“ مومو نے بھڑک کر شمس کو دیکھا تھا۔

”کوئی غلط بات نہیں کی اس نے، بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ مسکراہٹ چھپائے وہ اطمینان سے بولے تھے۔
 ”جاری ہوں میں، اب شکل بھی نہیں دکھاؤں گی، دو دن نہیں نظر آؤں گی ناں تو دماغ ٹھکانے آ جائیں گے سب کے۔“ شدید ناراضی کے ساتھ تن فن کرتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

”بیٹا! تو باہر تو آ ذرا اب۔“ جاتے جاتے وہ جس طرح چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شاہ رخ کو دھمکاتی ہوئی گئی تھی، بے ساختہ ٹھکھلا کر ہنستے ہوئے اس نے شاہ رخ کے شرمندہ چہرے کو دیکھا تھا، جبکہ شمس خود بھی مسکراتے ہوئے جانے کے لیے پلٹ گئے تھے۔

”بڑی ہنسی آ رہی ہے تمہیں، ایسے ہی جھگڑے کرواتی رہیں ناں تو ساتھ گزارہ مشکل ہے۔“ مصنوعی خفگی کے ساتھ شاہ رخ نے بتایا تھا۔

”مجھے الزام مت دو، تمہیں ہی شوق ہے اس سے مار کھانے کا۔“ وہ مسکراہٹ چھپائے بولی تھی۔
 ”ہاں یہ تو ہے، قسم سے مارتے کے لیے بچ کرتی ہے تو رگ رگ میں زندگی دوڑ جاتی ہے۔“ وہ شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا، جبکہ وہ خود بھی ایک بار پھر ہنسی گئی۔

”اوائے ہوئے، بھابی کیا لگ رہی ہیں آپ، ساڑھی میں لٹش پٹش۔“ وہ اب سدرہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا، جو شیریں کو گرد میں اٹھائے کمرے سے باہر آ رہی تھیں۔

”مجھے چھوڑو، میرے بیٹے کو دیکھو، لگ رہا ہے نا پورا چاند؟“ سدرہ نے مسکراتے ہوئے سوئڈ بوئڈ شیریں کا چہرہ اس کی طرف کیا تھا۔

”اللہ معاف کرے روتا ہوا چاند، وہ بھی ڈنر سوٹ میں۔“ اس کے کوٹ کی جیب میں دودھ کی بوتل یاد سے رکھ دی تھی۔
 ”شاہ رخ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”کبھی میرے بچے کی عزت مت کرنا۔“ سدرہ اسے گھورتے ہوئے میز ہیوں کی جانب بڑھ گئی تھیں۔
 ☆.....☆.....☆

ڈرائیونگ پر رکھی گلاب کی نازک منہ بند کلی کو اٹھاتے ہوئے اس نے ساتھ ہی رکھے اس خوبصورت سے کارڈ کو بھی اٹھایا تھا۔

”تم اور سورج دونوں ایک جیسے ہو
 دونوں آنگن میں اتر تو پھل ملنے لگتی ہے
 دونوں کی حدت سے دل کی برف پگھلنے لگتی ہے
 دونوں آنکھ کی وسعت سے بڑھ جاتے ہو
 دونوں آنکھیں چندھیاتے ہو
 دونوں آگ میں جھلساتے ہو“

چند لمحوں تک اس مانوس تحریر کو دیکھتے رہنے کے بعد کچھ چوکتے ہوئے، اس نے سرعت سے وہ دونوں چیزیں ڈرائیونگ کی وراز میں رکھی تھیں اور پھر پلٹ کر دروازے کی سمت دیکھا تھا۔

”بھابی! اس نے چلنا کب سے شروع کر دیا؟“ خوشگوار حیرت کے ساتھ سدرہ سے پوچھتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر شیریں کو گود میں اٹھایا تھا، جولا کھڑائے قدموں کے ساتھ اس کی طرف ہی آ رہا تھا۔

”تمہیں اس سے کیا، اتنی فرصت تو ہے نہیں تمہارے پاس کہ میرے بیٹے کی طرف ہی دیکھ لو۔“ ناراضی سے اس کو گھمکتے ہوئے وہ ڈرائیونگ کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھیں۔

”میں اسے ہی تو دیکھتا ہوں، ہے ناں شیریں؟“ وہ شیریں کے چہرے پر پیار کرتے ہوئے اس سے ہی پوچھ رہا تھا۔
 ”آپ کہیں جا رہی ہیں کیا؟“ وہ ان کی طرف متوجہ ہوا تھا، جو آئینے کے سامنے کھڑی ادھ کھلے بالوں میں برش پھیر رہی تھیں۔

”کیوں پوچھ رہے ہو؟“ فوراً ہی ابرو چڑھا کر وہ آئینے میں اس کے عکس کو گھور رہی تھیں۔
 ”کیونکہ آپ گھر میں تو اس طرح نہیں رہتی ہیں تو۔۔۔!“

”تم لوگ نہیں رہنے دیتے ہو مجھے اس طرح۔“ فوراً ہی اس کی طرف پلٹتے ہوئے وہ غرائی تھیں جس پر اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”ذرا سی لپ اسٹک بھی لگا لوں، تو سب مل کر میرا ریکارڈ لگا دیتے ہو، دیور ہیں کہ پتا نہیں دشمن۔“ ان کے مزید ناراض ہونے پر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

”میں کہاں آپ کو کچھ کہہ رہا ہوں، صرف یہ پوچھ رہا ہوں آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ وہ بولا تھا۔

”پچھو کی طرف، ان کے گھر میں خوشی ہے تو ظاہر ہے جانا تو ضروری ہے۔“ وہ بولی تھیں۔

”اچھا.....!“ ایک طنزیہی مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھڑی تھی۔

”لگتا ہے آپ کی بہن نے پچھو کے صاحبزادے کے لیے ہاں کر کے آپ کی خوشیوں کو بھی دو بالا کر دیا ہے۔“

”خبردار! جو کوئی فضول بات کی تم نے؟“ سدرہ نے فوراً ہی اسے گھورا تھا۔

”خوشیاں میری نہیں پچھو کی دو بالا ہوئی ہیں، ایک تو یہ کہ عاشق کی اپنی بیوی سے صلح ہو گئی ہے اور وہ اب اس کے ساتھ ہی ہے اور دوسرا یہ کہ وہ آج اپنے بچے کا عقیقہ کر رہا ہے، دنیا میں رہو، تو کوئی خبر ہونا تمہیں۔“ وہ ڈپٹے والے انداز میں بولی تھیں جبکہ وہ ان کی بات سنتے ہوئے چند لمحوں کے لئے دنگ ہی رہ گیا تھا۔

”اور اب ذرا تم بھی شرافت سے میرے میاں جی سے صلح کر لو، سیدھے منہ ان سے بات تک نہیں کرتے ہو، دماغ پھر گیا ناں ان کا تو ہوش درست ہو جائیں گے تمہارے بھی۔“ ان کے گھر کئے والے انداز پر وہ خاموش ہی رہا تھا۔

”اسے ذرا سنبھالو، یہ تو تیار ہو گیا ہے مگر ابھی ان کے والد محترم کی تیاریاں باقی ہیں، میں دیکھ لوں ذرا جا کر۔“ اس سے کہتے ہوئے وہ دروازے کی سمت بڑھ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”ابھی تک ایک ٹائی نہیں مل سکی ہے تمہیں، میرے ہی کاٹھوں کے لیے ہاتھوں میں سستی آ جاتی ہے۔“ وہ ان کے کمر پر کھڑے مستقل جھلارے تھے جو مزید بوکھلا گئی تھیں۔

”اور یہ تمہیں مشورہ کس نے دیا تھا، اس قسم کا واہیات لباس پہننے کا، اولو کوئی ڈھنگ کا لباس نہیں تھا؟“ وہ مزید ان کے

مقتضہ ہوئے تھے، جو بار بار ساڑھی کی قال میں ابھی جا رہی تھیں، دوسری جالنت ڈریسنگ کے سامنے کھڑی سارہ نے

نیرت سے پلٹ کر پہلے شمس کو پھر سدرہ کو دیکھا تھا، آف وہاٹ اور سلور اسٹراج کی ساڑھی میں بلاشبہ وہ غضب ڈھاری

تھیں اور اس پر ان کی پشت پر لہراتے سیدھے سیاہ بال، اس وقت تو ان کی چھب ہی قیامت خیز تھی۔

”بڑے بھائی! ذرا دھیان سے دیکھیں، بھابی اس ڈریس میں ”مس“ ایشیا پیسیفک“ نظر آ رہی ہیں۔“ جو نے

الٹ کر نشان ڈرتے ڈرتے ان سے اختلاف کر ہی گیا تھا۔

”تم بھی ذرا دھیان سے یہ جوتے پالش کرو، ورنہ ایسا نہ ہو کہ یہی جوتا ہو، اور نیچے تمہارا سر ہو، اتنا تو ہوتا نہیں ہے کہ

بڑے بھائی کا کوئی کام بولے بغیر کرو، سارے زمانے کے ٹکے کام چور میرے گھر میں بھرے پڑے ہیں۔“ نشان کو کوئی

طرح ڈانٹتے ہوئے وہ ڈریسنگ کی طرف بڑھتے تھے۔

”تم تو ہٹ جاؤ اب یہاں سے، اور ج سنور کے جاؤ تا کہ تمہاری پچھو صاحبہ ایک کے بعد اب اپنی کسی دوسری ٹائی

اولاد کے لئے تمہارے نام کی مالا جپنا شروع کر دیں۔“ ان کے گھر کئے پر وہ فوراً ہی آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھیں۔

”ویسے تمہاری پچھو کے پاس بھی بڑا ٹائم تھا، بغیر کسی بریک کے لڑکوں کی لائن لگا رکھی ہے انہوں نے۔“ پر لپٹا

اسپرے خود پر کرتے ہوئے وہ جس طرح بولے تھے وہ تو بمشکل ہی ہنسی روک سکی تھی، مگر شان کی ہنسی بلند ہوئی تھی، جس پر

سدرہ کو آگ ہی لگ گئی تھی۔

”کیا بول رہے ہیں آپ، بزرگ خاتون ہیں انہیں تو بخش دیں۔“ وہ شدید ناراضی سے انہیں دیکھتے ہوئے

آ رہی تھیں، جو خود بھی مسکرا رہے تھے، مگر دروازے کی سمت نگاہ جاتے ہی سنجیدہ ہو چکے تھے۔

شیری کو گود میں اٹھائے اندر آتے ہوئے بس ایک نگاہ غلط اس پر ڈالی تھی، جو اپنا سیاہ جھللا تا دوپٹہ سنبھالتی

جھکائے باہر نکلتی چلی گئی تھی۔

”ٹائی باندھ رہی ہو یا میری گردن میں پھندا ڈال رہی ہو؟“ وہ خواہ مخواہ سدرہ پر بھڑکے تھے۔

”بھابی! آپ اسے سنبھالیں، میں ٹائی باندھ دیتا ہوں۔“ شیری کو سدرہ کے حوالے کرتے ہوئے اس نے ٹائی

کے ہاتھ سے لی تھی۔

”رہنے دو، میں یہ کام خود کر سکتا ہوں۔“ ناگواری سے اسے روکتے ہوئے شمس نے اس کے ہاتھ سے ٹائی لینا چاہا

تھی جو کہ اس نے نہیں دی تھی۔

”بڑے بھائی! چھوٹے کو یہ کام کرنے دیں ورنہ آج آپ کے سرال میں بھی سب کو پتا چل جائے گا کہ آپ کو ٹائی

باندھنی ہی نہیں آتی ہے۔“ کمرے سے باہر نکلتے شان کی ہدایت پر وہ مسکراتے ہوئے ان کے قریب ہوا تھا۔

”میں منع کر رہا ہوں، سنائی نہیں دے رہا تمہیں؟“ سختی سے وہ اسے روکتے ہوئے بولے تھے مگر وہ ذرا بھی پرواہ کیے

بغیر ٹائی بڑے ماہر انداز میں باندھنا شروع کر چکا تھا، البتہ مسکراتی نظروں سے ان کے ناراض چہرے کو ہی دیکھ رہا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو اس طرح، زہر تنگ کر رہے ہو اس وقت مجھے۔“ وہ ناگواری سے اسے ٹوک گئے تھے۔

”آپ کو دیکھ رہا ہوں، یہ دن بدن نکھرتے کیوں جا رہے ہیں آپ؟“ مسکراہٹ چھپائے وہ ان سے پوچھ رہا تھا

دوسری جانب وہ چند لمحوں تک اس کے چہرے کو دیکھتے رہے تھے، پھر بے اختیار ہی اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

”مجھ سے ناراض مت ہو کر یار! میں دنیا سے کیا اپنے آپ سے بھی بیزار ہو جاتا ہوں۔“ اس کی پشت کو دھیرے

سے پیچھتاتے ہوئے وہ گہرے سنجیدہ لہجے میں بولے تھے۔

☆.....☆.....☆

رات کافی ہو چکی تھی، مگر نیند سے خالی آنکھوں کے ساتھ درود پوار نکلتے ہوئے پتا نہیں وہ کن سوچوں میں گم تھی۔

قریب ہی سوئی ہوئی ہنسی کے بالوں میں لٹکیاں پھیرتے ہوئے وہ چوکی تھی، اور پھر یکدم ہی اٹھ کر تیزی سے کھڑکی کی

بہت بڑھی تھی، ذرا سا پردہ سر کا کر اس نے باہر تاریکی میں کچھ دیکھنے کی کوشش کی تھی، جہاں وہ گرل بند کرنے کے بعد اب

اندرونی سمت ہی آ رہا تھا، کھڑکی سے ہٹ کر وہ تیز قدموں کے ساتھ دروازے کی سمت چلی گئی تھی، بس ایک پل کو ٹھٹھک کر

وہ اس کی جانب متوجہ ہوا تھا، جو اچانک ہی کمرے سے باہر نکل آئی تھی، اگلے ہی پل اس پر سے نظر ہٹائے آگے بڑھ گیا

تھا، تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ بروقت ہی اپنی جگہ پر رکھا تھا، کیونکہ وہ بہت سرعت سے سیڑھیاں چڑھتی

اس کے مقابل آؤ کی تھی، خاموش نظروں سے وہ بس اسے دیکھ رہا تھا، جس کی سانسیں اس وقت پھولی ہوئی تھیں، دوپٹہ

شانے سے پھسل چکا تھا، چہرے اور گردن کے گرد بالوں کی بے ترتیب لٹکیں کھڑکی تھیں، بہت مدھم روشنی میں لابی پلکوں

کے سامنے اس کے صبح چہرے کو کچھ اور پراسرار بنا رہے تھے، دوسری جانب وہ جو اسے مخاطب کرنا چاہ رہی تھی، اس کی

نہری نگاہوں میں زیادہ دیر تک دیکھ بھی نہیں سکی تھی، سوا ایک بے بسی کے ساتھ نظر پڑا گئی تھی، مگر پھر چونک کر رینگ پر

دھرے اپنے ہاتھ کی جانب دیکھا تھا جس کے نیچے رکھا وہ اپنا ہاتھ دھیرے سے نکال چکا تھا۔

”میں جانتی ہوں تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے مگر.....!“ وہ کترا کر نکل رہا تھا، تو اس نے فوراً اس کے سینے پر ہاتھ

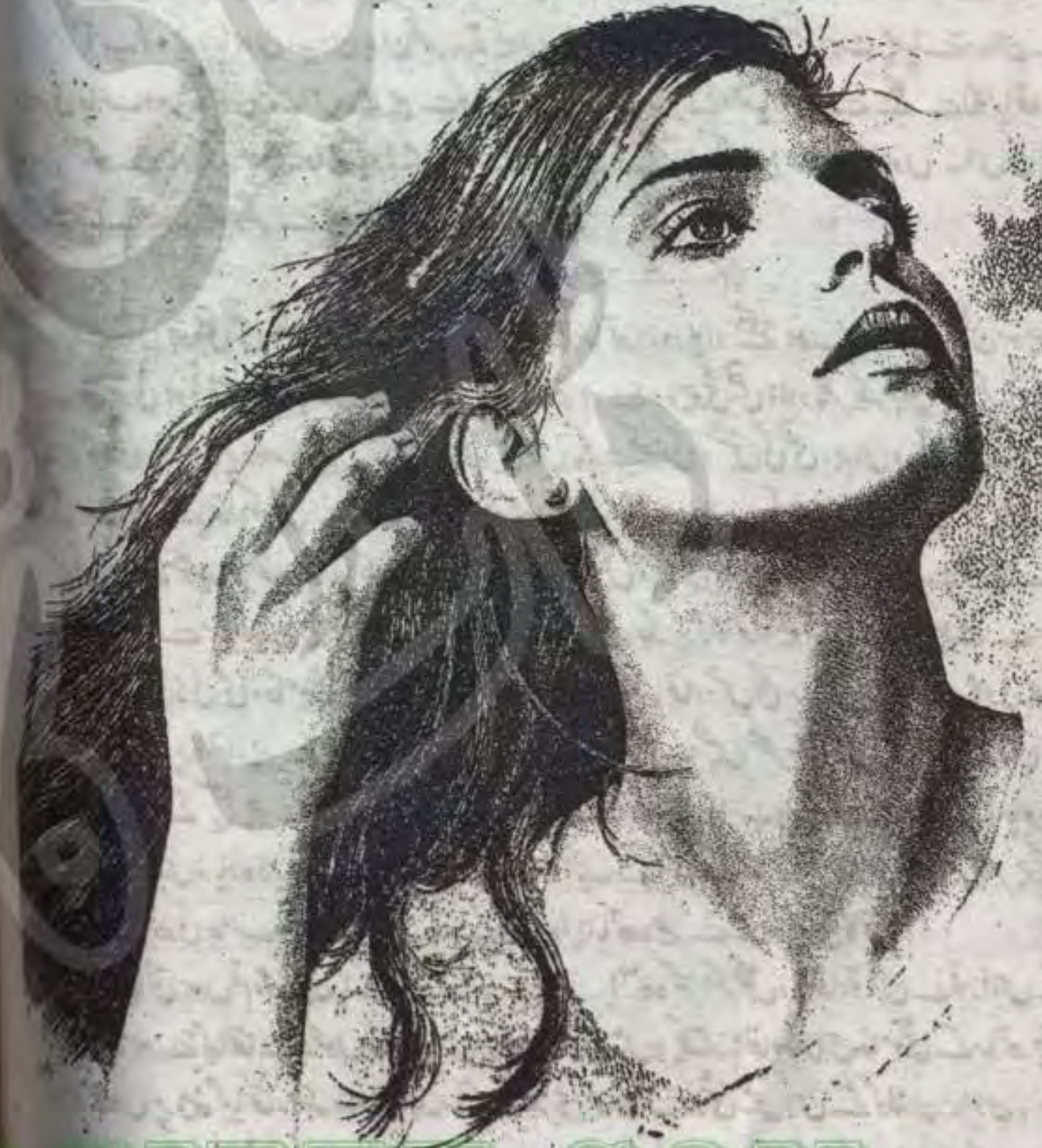
دکھ کر روکتے ہوئے کہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ اس کی نم آنکھوں میں دیکھا رہا تھا، پھر اسی خاموشی کے ساتھ پیچھے ہٹتے ہوئے

ایلی میز میوں پر بیٹھ گیا تھا، جبکہ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی خوابناک روشنی میں اس کے گولڈن براؤن بالوں کی خمیدہ کن

ہلک کو دیکھ رہی تھی۔ خاموشی بڑھنے لگی تھی، جب وہ اس کے منہ سر لڑ دیتے ہوئے قریب آئی تھی۔ (جاری ہے)

اسے کہنا

ورجینیا کے خوبصورت ساحل پر کھڑے ہوئے شاہرہ جس پر اس نے ہوش سنبھالتے ہی قدم رکھ دیے
آج پھر اس کا شدت سے دل چاہا کہ اپنے ماضی کی وہ تھے ایک بار پھر گھوم کر آئے وہ شاہراہ جس پر چلتے چلے



جب وہ 20 سال کا ہوا تو اپنے پہلو میں ہمیشہ اسے دیکھا ہمیشہ اس کا ہاتھ تھام کر چلنے کی خواہش کی اپنے قدموں کے نشانوں کے ساتھ ہمیشہ اس کے قدموں کے نقش دیکھے وہ شاہراہ جس کی فضا میں ہمیشہ اس کی مہک محسوس کی وہ جانتا تھا اس سیر کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلے گا وہ وہیں آکھڑا ہوگا جہاں اب کھڑا ہے مگر دل نے دھکے دے دے کر اسے مجبور کر دیا اس نے آنکھیں بند کیں تو اس شاہراہ پر اسے ایک چند سالہ خوبصورت سا بچہ نظر آیا جو بہت ضدی تھا بہت ہٹ دھرم تھا جس کی ماں اس کو جنم دیتے ہی مر گئی تھی جس



اسے نومی مل گیا، لا پرواہ اور ہنس مکھ سانوی جس نے بڑے مان اور بھروسے سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس نے چند لمحوں بعد تھام لیا اور یوں اس سفر میں اسے ایک سا بھی مل گیا، اس میں اور نومی میں صرف ایک فرق تھا، وہ اپنے خول کے اندر تھا اور نومی اپنے خول سے باہر پھر ایک دن نومی نے اسے اس شاہراہ کے کنارے پر بنا ایک خوبصورت سا گھر دکھایا۔

”یہ کیا ہے نومی.....؟“ وہ حیران ہوا تھا۔
 ”میری اور تیری دوستی کی نشانی۔“ نومی ہنس کر بولا تھا اور اس گھر کے لان میں بھی، بھی اس کے اور نومی کے علاوہ ایک اور فرد کا بھی اضافہ ہو جاتا اور وہ تھی نومی کی چھوٹی بہن تانیہ..... اسے شدت سے احساس ہوتا کہ نومی والی سائیڈ پر گھر زیادہ ہیں اس کے باپا کی شفقت کا گھر اس کی ماما کی محبت کا گھر اس کا اپنا گھر تانیہ کا گھر، لیکن اس کی والی سائیڈ پہ کوئی گھر نہیں تھا، نومی والی سائیڈ زیادہ خوشنما تھی، خوشیوں کے درخت، مسکراہٹوں کے پھول، قہقہوں کے پرندے، لیکن اس کی والی سائیڈ پر صرف ریگستان تھا، خاموش اور وحشت ناک، ایک بار اس نے نومی سے اس بارے میں سوال کیا تو وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا تھا۔

”عکرمہ! تیرے پاس محبتیں نہیں ہیں، زندگی رنگین اور خوبصورت تب ہوتی ہے جب کوئی آپ سے محبت کرے یا پھر آپ کسی سے محبت کریں۔“ وہ حیران ہوا۔
 ”مجھ سے محبت کرنے والا تو کوئی بھی نہیں ہے نومی!“ نومی مسکرایا۔

”تو پھر تو کسی سے محبت کر لے۔“ وہ چند لمحے بول نہ سکا۔

”کس سے.....؟“
 ”جو تجھے اچھی لگے جسے ایک بار دیکھ کر دل بار بار دیکھنے کو کرے، جو نگاہوں کے سامنے سے نہ ہٹے جسے دیکھ کر تو باقی سب بھول جائے۔“ اور وہ اسے تب ملی جب اس نے اور نومی نے یونیورسٹی میں قدم رکھا۔ بی بی

اسے کی پہلی اسائنمنٹ کے لئے ان چاروں کا گروپ بنا تھا، ”عکرمہ“ نومی، اریش اور زرتاشہ، اریش ظاہری طور پر لاہور کی ماڈرن لڑکیوں جیسی تھی، بلیو جینز، پنک نی شرٹ، کمر تک آتے بال اور کندھے پر پڑا بیگ اور ہاتھوں میں پکڑی فائل لیکن اندرونی طور پر وہ بالکل اس جیسی تھی، محروم، مغرور اور اکھڑ، زرتاشہ ملتان سے تھی اور اریش سے قطعی مختلف، گاؤں اور اسکارف میں ملبوس، صاف چہرہ اور شائستہ انداز و قاص جیسا چھپورا لڑکا بھی اسے ”آپ“ کہہ کر بلاتا تھا، آہستہ آہستہ اسے پتہ چلا کہ اریش جیسی بھی تھی لیکن خلوص سے مالا مال تھی، اس نے ایک بار زرتاشہ کا ہاتھ تھامو تو پھر دوبارہ نہیں چھوڑا پہلے سیکسٹر کے دوران ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اپنی کلاس میں وہ سب سے زیادہ ذہین ہے، ذہین تھا، امیر تھا، لڑکیاں اس کی طرف کھینچی چلی آتیں، لیکن اس کے خول سے ٹکرا کر واپس چلی جاتیں، اب اس سفر میں وہ چار ہو گئے تھے، آہستہ آہستہ اسے لگا جیسے اس کی سائیڈ والے ریگستان میں ہلکا ہلکا سبزہ پھوٹ رہا ہے، لیکن اس نے اسے اپنا وہم سمجھا پھر دل باغی ہونے لگا، اسے لگا جیسے صحرا کی تندہی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہو، جیسے بادل اکٹھے ہو رہے ہوں لیکن دل کا کیوس ابھی تک خالی تھا، ابھی تک آنکھوں میں کوئی شبیہ نہیں بنی تھی، ایک دن یونہی اس نے زرتاشہ سے کہا تھا۔

”زری! میں بہت تنہا ہوں، کیا کروں.....؟“ وہ مسکرائی تھی۔

”میں نے بھی ایک دفعہ کسی سے پوچھا تھا یہ سوال جانتے ہو مجھے کیا جواب ملا تھا۔“ اس کی نظریں سوال ہو گئیں۔

”زرتاشہ! تم محبت کر لو، محبت کرنے والے کبھی تنہا نہیں ہوتے، محبت انہیں تنہا ہونے ہی نہیں دیتی۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”یعنی میں محبت کر لوں.....؟“ اس نے پوچھا تو زرتاشہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اس سے پوچھ

نہ سکا۔

”کیا تم نے بھی کر لی محبت.....؟“ پوچھ لیتا تو شاید آج یوں اس ساحل پر تنہا نہ کھڑا ہوتا۔

یونہی چلتے چلتے اسے ہوش آیا، جب ایک گاڑی زن سے اس کے پاس سے گزری، وہ ٹھک گیا، اس گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے چہرے نے پہلی بار اسے اس کی محبت کا ادراک کروایا تھا اور اس گاڑی میں بچتے میوزک نے پہلی بار اسے اس کی محبت کا یقین دلایا تھا، اس نے ماضی میں کھو کر ایک دفعہ پھر چلنا شروع کر دیا، فاطمہ دوسرے سیکسٹر کے شروع میں آیا تھا، رفتہ رفتہ اس کی فاطمہ سے ناپسندیدگی بڑھتی گئی اور جس دن فاطمہ نے اس کے اور نومی کے سامنے زرتاشہ کا ہاتھ پکڑا اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”چھوڑو اس کا ہاتھ۔“ اس روز اپنے سر دلچسپ سے وہ خود گھبرا گیا تھا، اسے غصہ کیوں آیا، وہ سمجھ نہ سکا لیکن وہ حیران رہ گیا، جب اس نے ریگستان میں اگے چھوٹے چھوٹے سبز پودے دیکھے۔

بجی پاس بلاؤ نا یہ دل آج ٹوٹا ہے
 سا جن مان جاؤ نا کہ وہ آج روٹھا ہے

جب اس نے پہلا گانا گایا تھا تو یہ ہی گایا تھا، اس دن بجی کے روپ میں اس نے صرف زرتاشہ کو دیکھا تھا، اپنی آنکھوں میں صرف اسے ڈھونڈا تھا، اپنی زندگی کے ہر پل میں صرف اسے سوچا تھا، اپنے دل کے کیوس پر صرف اس کی تصویر بنائی تھی، اس دن اسے یقین ہو گیا کہ اسے زرتاشہ سے محبت ہے، اس دن صحرا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، اس دن اس کی والی سائیڈ سبزہ زار ہو گئی، زرتاشہ کی محبت کے پھول اس نے خود لگائے اور ایک دن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ درختوں اور بادلوں میں پھجا بہت خوبصورت محل اس کی والی سائیڈ پر کھڑا ہے، یہ اس کی محبت کا محل تھا لیکن یہ اس کی منزل نہیں تھا۔

”میری منزل وہ محل ہوگا جو زرتاشہ میرے لئے

بنائے گی۔“ اس نے جیسے خود سے عہد کیا۔

”میں زرتاشہ سے بہت محبت کروں گا، اتنی کہ وہ میرے لئے محل ضرور بنائے گی اور جس دن بنائے گی اس دن اس کا ہاتھ تھام کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے اپنالوں گا۔“ اس نے اپنی محبت کا محل زرتاشہ کو نہ دکھایا، اس کا پیارا اپنی آنکھوں میں سجا کر اس کی محبت کا محل ڈھونڈنے چل پڑا۔

خود پر یقین اتنا تھا کہ راستوں کی طوالت نظر انداز کر دی، خود پر مان اتنا تھا کہ ایک لمحے کو بھی نہ سوچا کہ محل نہ ملا تو کیا کرے گا، اس کے بغیر کیسے جیے گا، اس دن اس نے بہت عام سی زرتاشہ کو اپنے دل میں بہت خاص جگہ دے دی، اپنی تمام تر خوبصورتی، دولت اور ذہانت کے ساتھ اس کے آگے جھکتا چلا گیا، اس دن کے بعد سے اس کے ہونٹوں پر دائمی مسکراہٹ سج گئی، اس کی والی سائیڈ دن بدن خوبصورت ہوتی چلی گئی، اور اس نے زرتاشہ سے پوچھے بغیر دل کے کورے صفحے پر اس کا نام لکھ لیا، پوچھ لیتا تو آج یوں تنہا اس ساحل پر نہ کھڑا ہوتا۔

تجھی وہ اچانک رک گیا، شاہراہ پر ایک طرف ایک بورڈ لگا ہوا تھا، اس پر اس کی اور نومی کی تصویر تھی اور نیچے لکھا تھا۔

Pepsi Forever Taste

Forever اس کا اور نومی کا بینڈ، اس بینڈ سے دو گانے گانے کے بعد اس کی جھولی میں ایک اور چیز آ گری، شہرت، اور تب اسے احساس ہوا کہ شہرت دولت سے بھی زیادہ تیز نشہ ہے، اپنی الہم کے پہلے گانے کا آخری مصرعہ اسے آج بھی یاد تھا۔

”اسے کہنا

جی تو لوں گا اس بن مگر

کیا واقعی یہ زندگی ہوگی

اور آج ساحل پر کھڑا اس کا وجود چیخ چیخ کے اس

مصرعے کی تصدیق کر رہا تھا، وہ زندہ تھا، اس کے بغیر سانس لے رہا تھا لیکن کیا واقعی وہ زندہ تھا؟ اس بات کا جواب ڈھونڈتے ہوئے اسے پورے اڑتالیس ماہ یعنی چار سال ہو چکے تھے تبھی اسے اپنے سینے پر کسی کا لمس محسوس ہوا، اس دن وہ سو رہا تھا، جب اسے پتہ چلا کہ زرتاشہ اغواء ہو گئی ہے اس دن زرتاشہ کو ڈھونڈتے ہوئے اسے لگا جیسے اس کے سارے جذبات عیاں ہو جائیں گے۔

”کل فاطر آیا تھا ہاسٹل زرتاشہ سے ملنے“ اسے کہنے لگا مجھ سے شادی کر لو زرتاشہ نے منع کر دیا، جاتے جاتے اسے دھمکی دے گیا کہ تمہیں دیکھ لوں گا، آج جب میں اور زرتاشہ مارکیٹ گئے تو وہ اغواء ہو گئی۔ عمارہ زرتاشہ کی روم میٹ نے روتے ہوئے بتایا، اسے زرتاشہ کو ڈھونڈتے صبح سے شام ہو گئی، ہاسٹل کا معاملہ ایش نے سنبھالا، اسے آج بھی یاد تھا جب پورے اڑتالیس گھنٹوں بعد وہ اور نومی فاطر کو زبردستی وہاں لے کر آئے جہاں زرتاشہ بندھی تو وہ دروازہ کھول نہیں سکا تھا، اور جب کھولا تو بغیر دوپٹے کے کھلے بالوں والی زرتاشہ اس کے وجود سے آگئی، وہ اس قدر حیران ہوا تھا کہ اس کے گرد بانہیں بھی نہیں پھیلا سکا تھا۔

”عکرمہ! مجھے چادر لادو مجھے یہاں سے لے چلو“ اس کی شرٹ بھگوتے ہوئے وہ صرف اتنا کہہ رہی تھی، اس کے صرف دو دن بعد اس نے فاطر کو یونیورسٹی سے نکلوا دیا، اس دن ان کے گروپ میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوا، فراز، جس کی دنیا ایش سے شروع ہو کر ایش پر ختم ہو جاتی تھی، اس نے ہی فاطر کو ڈھونڈا تھا۔

”فراز تم سے بہت پیار کرتا ہے ارشی“ اس نے ایک بار کہا تھا۔

”مگر میں اس سے پیار نہیں کرتی“ اس نے صاف جواب دیا۔

”تو پھر کس سے کرتی ہو.....؟“

”میں جس سے پیار کرتی ہوں وہ مجھ سے پیار نہیں کرتا اور مجھے اس دن کے آنے کی کوئی امید بھی نہیں، جب وہ میری طرف آئے گا“ اس نے ایش کی نگاہوں میں جھانک کر نظریں چرائی تھیں اور اگلی صبح وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سفید موتیوں کا ایک محل اس کی والی سائیڈ پر کھڑا ہے، یہ اس کے لئے ایش کی محبت کا محل تھا، ایش اسی محل کے دروازے پر اس کی طرف ہاتھ بڑھانے لکڑی تھی، لیکن یہ محل اس کی منزل نہیں تھا، وہ چند لمحے رکا پھر ایش کو خالی ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا، اسے زرتاشہ کے محل میں جانا تھا۔

☆.....☆.....☆

اب کہ وہ رک نہیں چلتا رہا، اسے بہت کچھ نظر آیا، بہت سے سائنگ بورڈ جو Forever کی شہرت کے گواہ تھے، شاہراہ کے دونوں طرف بنے کنسرٹس ہال جہاں Forever کے لئے پورا لاہور جمع ہوتا تھا، بڑی بڑی سلور اسکرین اور چھوٹی اسکرین، جس کے پردے پر صرف فلم اشار ایش کی تصویریں چلتی تھیں، بہت سے مارننگ شو، جہاں صرف فارایور کو بلوانے کی فرمائش ہوتی تھی، وہ تینوں وقت کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہے تھے اور وقت ان پر شہرت لٹا رہا تھا، وہ کئی انٹرنیشنل کنسرٹس بھی کر چکے تھے، ایش کے سامنے ڈراموں، فلموں اور ماڈلنگ کی آفرز کے انبار لگے ہوئے تھے، پھر اچانک وہ رک گیا، شاہراہ کے سائیڈ پر بنا اس کی اور نومی کی دوستی کا خوبصورت گھر جسے بنے 15 سال ہو گئے تھے، تباہ ہو چکا تھا، کیا ہوا تھا، اس نے سوچا، کچھ بھی نہیں، اسے اپنی مرضی پلانے کی عادت تھی، دھونس جمانے کی عادت تھی، اس کی اور نومی کی دوستی صرف اس لئے تھی کہ وہ کہتا اور نومی مان لیتا، اب جب اس نے کہا اور نومی نے نہ مانا تو مسئلہ ہو گیا وہ اپنی جگہ سے نئے کو تیار نہ تھا اور نومی خود کو غلط کہلوانے پر تیار نہ تھا، ایش اور زرتاشہ روکتی رہ گئیں مگر وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

”تو صاف صاف کہہ نومی کہ مجھ سے جھگڑا گیا ہے“ وہ سرد لہجے میں بولا۔

”میں نے تو ایسا نہیں کہا“ نومی نے کندھے اچکائے۔

”کہنا تو یہ ہی چاہتا ہے نا“ وہ بولا۔

”میں نے کچھ نہیں کہا، نہ کہنا چاہتا ہوا، تو ایسا سمجھ رہا ہے تو سمجھ لے“ نومی بولا۔

”مجھ سے تیری دھونس برداشت نہیں ہوتی“

”اب تک کیوں کرتا آیا ہے پھر؟“ اسے بھی غصہ آیا۔

”کیونکہ میں بیوقوف تھا“

”تو ٹھیک ہے اب عقل پکڑ لے کیونکہ میں تو عادت بدل نہیں سکتا“ زرتاشہ اور ایش نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا وہ اٹھا اور چلا آیا پھر ان دونوں نے لاکھ سمجھالیا لیکن وہ نامانا، نہ نومی، تانبہ نے بھی بھائی کو سمجھایا مگر بے سود، فراز نے دونوں کی صحت کروانی چاہی لیکن وہ جھکنے کو تیار نہیں تھا اور نومی اسے جھکائے بغیر جھکنا نہیں چاہتا تھا، دوستی کا گھر بلے کا ڈھیر بنتا چلا گیا، فارایور ٹوٹ گیا، وہ الگ ہو گیا، نومی نے وقاص کے ساتھ مل کر بینہ بنالیا، وہ اپنی طرف آ گیا اور نومی شاہراہ کے دوسری طرف چلا گیا، وہ دونوں کبھی اس کے ساتھ چلتیں، کبھی نومی کے ساتھ چھ ماہ گزر گئے لیکن دونوں میں سے کوئی بھی نہ جھکا، تبھی زن سے کوئی گاڑی اس کے پاس سے گزری اور اس میں بیٹھے چہرے وہ دیکھ کر اسے وہ دن یاد آ گیا، جب وہ لاسٹ سمسٹ کے بعد زرتاشہ کے ساتھ ملتان گیا تھا، دونوں یونیورسٹی کی طرف سے آئے تھے وہیں زرتاشہ نے اسے اس سے ملوایا تھا۔

”عکرمہ! میرا کزن ہے حاشر“ اسے حاشر خاصا متول لگا تھا اور بھی وہ ایک فیصلہ کر کے اگلے دن اس سے ملنے آ گیا تھا۔

”پتہ نہیں مجھے یہ بات آپ سے کرنی چاہئے یا نہیں، لیکن اگر میں نے زرتاشہ سے کی تو وہ ناراض ہو

گئی“ حاشر حیران ہوا تھا۔

”کون سی بات.....؟“

”حاشر! آپ کے ہاں ذات برادریوں کا تو کوئی سسٹم نہیں ہے نا، میرا مطلب ہے برادری سے باہر شادیاں کرنے، رواج ہے؟“ حاشر ہنک گیا۔

”کیوں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں.....؟“

”دراصل میں زرتاشہ کو پر پوز کرنا چاہ رہا تھا“

حاشر چپ رہ گیا۔

”آپ پلیز خفا نہ ہوں لیکن میں نے سوچا کہ آپ مجھے بہتر بتا سکتے ہیں“ حاشر چند لمحے چپ رہا پھر بولا۔

”کے بھیجیں گے آپ.....؟“ وہ مسکرایا۔

”اپنے پایا کو.....“ حاشر مسکرایا۔

”بھیج دیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا“ اور وہ مسکراتا ہوا واپس آ گیا تھا، کاش وہ یہ بات حاشر سے کرنے سے پہلے زرتاشہ سے کر لیتا تو آج یوں بے سرو ساماں ساحل پر نہ کھڑا ہوتا۔

☆.....☆.....☆

اچانک وہ رک گیا، بادلوں اور درختوں میں چھپا وہ خوبصورت محل جو اس نے زرتاشہ کی محبت میں بنایا تھا، زمین بوس ہو چکا تھا، اس کا دل شدت سے دکھا، وہ ایک بار پھر زرتاشہ کے سامنے اس آڈیو ریم میں جا کھڑا ہوا، جہاں چار سال پہلے کھڑا ہوا تھا۔

”مجھے یہاں کیوں لائی ہو زری!“ وہ حیران ہوا۔

”تم آتے ہوئے حاشر سے میرے اور اپنے بارے میں کیا الٹا سیدھا بکواس کر کے آئے ہو“ وہ الفاظ سے زیادہ اس کے بچے کی تختی پر ٹھک گیا۔

”کیا مطلب زری.....؟“ وہ بس اتنا کہہ سکا۔

”مطلب یہ کہ تم جس شخص کے سامنے میرے اور اپنے عشق کی الٹی سیدھی سچی جھوٹی داستانیں سنا کر آئے ہو وہ منگیتر ہے میرا“ پہاڑ تھا جو اس کے سر پر گرا تھا۔

”وہ پتہ ہے مجھ سے کیا کہہ رہا تھا زری! اس خوبصورت اور مغرور لڑکے کے سادہ سے چہرے پر پھیلے

محبت کے رنگ میں نے ایک لمحے میں دیکھ لئے تو تمہیں کیا چار سالوں میں نہ نظر آئے بولو عکرمہ! کیوں اپنے اور میرے بارے میں یوں الٹا سیدھا ہانک کر آئے ہو۔ اس کی بس ہو گئی۔

”زری! تم مجھے جو مرضی کہہ لو لیکن میرے سچے اور پاکیزہ جذبوں.....“ زرتاشہ نے اس کی بات کاٹ دی۔
”ہونہہ..... پاکیزہ جذبے خود غرض جذبے کہو دقتی جذبے۔“ وہ کچھ بول نہ سکا اسے زرتاشہ کا محل مل گیا تھا۔ مگر دروازے بند تھے اسے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی، مسافر وہ تھا مگر منزل کسی اور کے لئے تھی منزل اس کی تھی مگر نام کسی اور کے تھی۔

”عکرمہ! میں نے بچپن سے ہی بہت محرومیاں دیکھی ہیں نہ ماں کی محبت ملی نہ باپ کی شفقت بڑی مشکلوں سے میں نے حاشر کو اپنی تنہائی کا ساتھی بنایا ہے خدا کے لئے تم مجھ سے میری خوشیاں نہ چھینو مجھے میری محبت سے دور نہ کرو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں عکرمہ! تم میرے اور حاشر کے بیچ مت آؤ تم میرے راستے کی دیوار نہ بنو تم جاؤ میری زندگی سے دور بھول جاؤ مجھے۔“ دونوں ہاتھ باندھے زرتاشہ رو رہی تھی اسے لگا جیسے وہ زبردستی اس کے محل میں داخل ہو رہا ہے اور وہ بمشکل اسے روک رہی ہے اس نے زرتاشہ کے بندھے ہاتھ کھول دیئے۔

”زری! تم چاہتی ہو میں یہاں سے چلا جاؤں گا“ چلا جاؤں گا تم جانتی ہو میں تمہارے اور حاشر کے بیچ نہ آؤں نہیں آؤں گا لیکن تم چاہتی ہو میں تمہیں بھول جاؤں سوری زری کیا تم سانس لینا بھول سکتی ہو پلک جھپکنا بھول سکتی ہو.....؟“ زرتاشہ رو رہی تھی۔

”اگر بھول سکتی ہو تو شاید پھر میں بھی تمہیں بھول جاؤں۔“ اس رات اسے پتہ چلا کہ محبت ہمیشہ حاصل نہیں ہوتی محبت حاصل ہو جانا اتنا آسان ہو تو ہر کوئی محبت کرنے لگے اس رات اسے احساس ہوا کہ محبوب کی بات نالنا کتنا مشکل ہوتا ہے لیکن ساتھ یہ بھی پتہ

چلا کہ محبوب کی خاطر مر جانا آسان ہے محبوب کی خاطر اسے چھوڑ دینا مشکل ہے اور اس نے چھوڑ دیا اس نے زری کو حاشر کے لئے چھوڑ دیا ہر میوزیکل شو کی ہیڈ لائن بن گئی فار ایور کے سنگر کی امریکا رو آگئی اریش نے سنا تو دوڑی آئی اور اس کی حالت دیکھ کر سن ہو گئی مایوس چہرہ شکستہ وجود۔

”کیا ہوا عکرمہ! امریکا کیوں جا رہے ہو.....؟“ وہ بولی۔

”کیونکہ یہ میری محبت کی خواہش ہے۔“ وہ بے خور ہو رہا تھا۔ محبت کے علاوہ قدرت نے ہر چیز اس کی جھولی میں ڈال دی لیکن اسے کچھ نہیں چاہئے تھا اسے صرف محبت چاہئے تھی وہی نہیں مل رہی تھی جو اس نے نہیں مانگا تھا وہ مل گیا تھا اور جو مانگ رہا تھا وہ نہیں مل رہی تھی اریش رو پڑی اس کا پیار کسی اور کے پیار میں مرا جا رہا تھا۔

”رک جاؤ عکرمہ! میرے لئے.....“ وہ بڑی آس سے بولی۔

”نہیں اریش! اس نے پہلی بار مجھ سے کوئی خواہش کی ہے اور ویسے بھی محبت صرف ایک بار ہوتی ہے۔“ اریش نے سر جھکا لیا۔
”واقعی عکرمہ! محبت صرف ایک بار ہوتی ہے۔“ اس نے چہرہ موڑ لیا۔

”میں تمہارا انتظار کروں گی عکرمہ!“
”نہیں اریش! تم میری منزل نہیں ہو بلکہ میری تو کوئی بھی منزل نہیں ہے۔“ وہ بولا تھا۔
”تو ٹھیک ہے جب تھک جاؤں گی تو اپنا محل تو زکر فراز کے محل میں چلی جاؤں گی۔“

وہ ایک دم رک کا شاہراہ ختم ہو گئی تھی اور وہ کنارے پر کھڑا تھا اس کے سامنے لامحدود سمندر تھا جس رات وہ یہاں آیا تھا اس رات اس کا شدت سے دل چاہا تھا کہ روئے مگر وہ بے بس تھا اس نے بہت چھوٹی عمر

میں ہی رونا بھلا دیا تھا یہاں آ کر اسے پتہ چلا کہ تنہا جینا کیا ہوتا ہے اپنے ملک میں بھی وہ تنہا تھا اور یہاں بھی مگر فرق یہ تھا کہ اپنے ملک کی تنہائی زخموں پر مرہم رکھتی تھی اور یہاں کی تنہائی زخم ادھیڑتی تھی آج اس کی جلاوطنی کی سزا کا ایک اور دن ختم ہو گیا تھا یہاں آ کر اس کی ہر چیز ختم ہو گئی اکڑ، مغرور، تکبر، انا، دھولس، سب ختم ہو گیا بہترین دوست وہ پہلے ہی کھو چکا تھا محبت اس نے چار سال پہلے کھو دی زرتاشہ اس کی زندگی میں کیوں آئی کیونکہ۔

Spacial peoples come in our life, only to tech us, how to live without them

زرتاشہ اس کی زندگی سے کیوں نکل گئی کیونکہ۔
”جب کچھ لوگ آپ کی زندگی سے دور جانے لگیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ظالم ہیں بلکہ آپ کی اسٹوری میں ان کا جتنا رول تھا وہ ختم ہو گیا۔“ زرتاشہ ظالم نہیں تھی وہ اسے صرف یہ سمجھانے آئی تھی کہ زندگی تنہا بھی گزاری جاسکتی تھی کسی کا ساتھ ضروری نہیں ہوتا زندگی پلیٹ فارم ہوتی ہے جہاں سے مختلف مسافر گزرتے رہتے ہیں لکڑی کی میز پر تنہا بھی چڑھا جا سکتا ہے انسان محبت کے ملنے سے پہلے بھی جیتا ہے اور بعد میں بھی جیتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جیتے کے لئے سانس لیتا ہے اور بعد میں سانس لینے کے لئے جیتا ہے وہ بھی صرف سانس لینے کے لئے جی رہا تھا اور پھر جیسے قدرت کو اس پر رحم آ گیا اس کی زندگی کی شاہراہ سمندر کے سائیڈ سے گزر کے آگے کو چلی گئی اور اس شاہراہ پر اسے حاشر مل گیا لیکن اس کے پہلو میں زرتاشہ نہیں تھی۔

”زرتاشہ کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”تمہیں پتہ ہوگا۔“ حاشر بولا۔
”جیسے.....“ وہ حیران ہوا۔
”ہاں تمہیں میں نے اسے آزاد کر دیا تھا اور کہہ دیا

تھا کہ تمہاری طرف لوٹ جائے تم اسے مجھ سے زیادہ خوش رکھ سکتے تھے۔“ اس کی دنیا زیر ہو گئی وہ صرف زرتاشہ کی خوشی اور آسودہ زندگی کی خاطر یہ جلاوطنی کاٹ رہا تھا اور زرتاشہ..... وہ دیوانوں کی طرح اپنی زندگی کی شاہراہ پر زرتاشہ کو ڈھونڈنے دوڑ پڑا وہ امریکا سے واپس آ گیا اپنی زندگی کا ہر لمحہ اس نے زرتاشہ کی تلاش کے لئے وقف کر دیا۔

یونہی زرتاشہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک دن وہ حیران رہ گیا اریش کا محل زمین بوس ہو چکا تھا اسے خوشی ہوئی۔

”خوش قسمت ہو اریش تم محبت تمہارے لئے حاصل نہ بن سکی تم کسی کی محبت بن کر حاصل بن گئیں۔“ اس نے فراز اور اریش کے محل کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس سے کہا تھا اریش نے سر جھکا لیا۔
”زرتاشہ آئی تھی میرے پاس۔“ وہ بولی وہ حیران ہوا۔

”کب.....؟“
”جس رات تم گئے تھے اس سے اگلی صبح۔“ وہ سن رہ گیا۔
”تمہیں ڈھونڈ رہی تھی پھر چلی گئی۔“ وہ بول نہ سکا۔

”میں نے اس سے سب کچھ پوچھا عکرمہ! اور اس نے مجھے سب بتا دیا لیکن جب میں نے پوچھا کہ زرتاشہ تم تو خود محبت کی راہوں کی مسافر تھیں پھر عکرمہ کی آنکھوں کے دیپ تمہیں نظر کیوں نہ آئے تو کہنے لگی کہ.....“

”کہ.....“ اس نے پوچھا۔
”کہ یہ دیپ تو مجھے تمہاری آنکھوں میں بھی نظر آتے ہیں تم روک لیتی اسے۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔
”لیکن عکرمہ! زرتاشہ کی محبت زیادہ مضبوط تھی۔“ اور عکرمہ مزید وہاں نہ ٹھہر سکا ایک بار پھر وہ اپنی شاہراہ

محل ٹوٹ گیا ہے وہ کہاں جائے؟ آخر اس نے اریش سے نمبر لے کر زرتاشہ کو فون کیا۔

”ہیلو.....“ چند لمحے وہ کچھ بول نہ سکا۔
”زری! مجھے کوئی گلہ نہیں ہے کوئی شکوہ نہیں ہے بس اتنا بتا دو کہ تمہاری خواہش پوری کرنے کی اتنی بڑی سزا کیوں.....؟“ اس کی آواز بھرائی۔
”اگر جاشر کے سوا کوئی بھی تو پھر میں کیوں نہیں؟“ زرتاشہ چیپ تھی۔

”میں اس قابل بھی نہیں تھا کہ تمہاری سیکنڈ چوائس بن جاتا.....؟“ زرتاشہ کی سسکیاں ابھریں۔

”میرا قصور کیا ہے زری! جو سزا ہر بار مجھے ملتی ہے۔“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا زرتاشہ صرف رو دی۔

”نومی! مجھے کل پنڈی سے لے کر آیا ہے عکرمہ۔“
”میں کوشش کروں گا زری! تمہیں بھولنے کی

حالات تک یہ ناممکن ہے ایک دفعہ تمہاری خواہش پر جلا وطنی کاٹی تھی اب اپنی خواہش پر کاٹ لوں گا۔“ اس نے

فون بند کر دیا 20 سال پہلے زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھا تھا 5 سال پہلے یہ شاہراہ سمندر نے بند کر دی اور سال

پہلے اسے دوبارہ راستہ ملا لیکن آج پورے 27 سال بعد اس نے خود اس شاہراہ کے سفر کو ختم کر دیا ایک بار

پھر اسی ساحل پر آ کھڑا ہوا کوئی پوچھتا۔
تم نے شادی کرنی جواب دیتا ہاں

کس سے کی ہے کسی کی یادوں سے
کس نے پڑھایا نکاح مستقبل کے خوابوں نے

کیسی گزر رہی ہے زندگی۔ وہ بولنے لگتا ہی تھا کہ
آنسو چھلک پڑتے۔

”اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے“ حق مہر میں زندگی لکھ دی ہے۔

اور پھر رونا شروع کر دیتا بہت روتا حالانکہ وہ رونا بھول چکا تھا۔ محبت کرنے والے بھی تنہا نہیں ہوتے تو پھر وہ کیوں تنہا تھا.....؟

☆.....☆

پر تنہا تھا لیکن آج اس کی شاہراہ سرسبز تھی اس نے دوبارہ زرتاشہ کی محبت کا محل تعمیر کر لیا اور اب ایک بار پھر اس کی محبت کا محل ڈھونڈ رہا تھا لیکن اس کی محبت کا محل تو تباہ ہو چکا ہوگا اس نے سوچا جب جاشر نے اسے دھتکارا ہوگا تو اس کا محل تو اسی دن تباہ ہو گیا ہوگا۔

”میں زرتاشہ کو اپنے محل میں لاؤں گا۔“ اس نے فیصلہ کیا ایک بار پھر وہ جینے کے لئے سانس لینے لگا

ایک بار پھر اس کی زندگی گانوں مارننگ شوز اور سائن بورڈز سے سج گئی یونہی ایک دن اس کی نظر اپنے اور نومی کے دوستی کے گھر پر پڑی وہ رک گیا۔

”میں اس دوستی کو دوبارہ تعمیر کروں گا۔“ کہتے ہوئے اس نے گاڑی نومی کے گھر کی طرف موڑ دی

لیکن یہ کیا؟ اصل شاہراہ پر نومی کا گھر کھڑا تھا اور اس کی شاہراہ پر نومی کی محبت کا محل کھڑا تھا وہ حیران ہوتا ہوا اندر آ گیا۔

”کوئی فنکشن ہے تانیہ.....؟“ اس نے پوچھا تو تانیہ اسے دیکھ کر ہی دم بخود رہ گئی۔

”آج نریمان کا نکاح ہے۔“ نومی کے ابو نے بتایا۔
”نومی دیکھو کون آیا ہے۔“ نومی اسے دیکھ کے

ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔
”آج تو نہ آتا تو کل میں نے آ جانا تھا۔“ وہ

صرف مسکرا سکا۔
”تیرے لئے ایک اور سر پرانز My wife

zertasha۔“ نومی زرتاشہ کا ہاتھ پکڑ کے اپنے محل میں لے گیا۔

تم میری آس تم میری سانس تم میرا جیون جان
تم میری یادیں تم میرے وعدے

تم میرا دکھ سکھ جان جان
نہیں ہو خوابوں کی تعبیر نہیں ہو تم میری تقدیر

وہ اس کا سب کچھ تھی بس قسمت نہیں تھی وہ پلٹ آیا اریش کا محل ٹوٹا تو اسے فرازل گیا زرتاشہ کا محل ٹوٹا

اسے نریمان مل گیا اور وہ..... وہ کیا کرے؟ اس کا بھی

قرآن

ہر ایک کے لئے

کیا آپ جانتے ہیں کہ اللہ آپ سے کس قدر محبت کرتا ہے۔ آپ کی صلاح و بہبود کس طرح چاہتا ہے اور آپ کے کیا توقع رکھتا ہے؟ آپ کو اللہ کی محبت، شفقت اور اس کی رحمت کا اندازہ صرف اور صرف قرآن کو پوری طرح سمجھ کر پڑھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

تفسیر

سورۃ القصص

مؤلف
مشتاق احمد قریشی

قرآن کی ایک ایسی مختصر سورۃ جس کے بارے میں امام ابو حنیفہ اور دیگر ائمہ کا قول ہے کہ اگر کسی نے سورۃ القصص کو سمجھ لیا تو یوں سمجھ لو پورے

قرآن کو سمجھ لیا کہتے ہیں دو درمالت میں جب دو اصحابی ملتے تھے تو وہ اس وقت تک رخصت نہیں ہوتے تھے جب تک ایک دوسرے کو سورۃ القصص نہ سنالیتے۔

آپ قرآن کو سمجھنا اور اپنی روح میں سمونا چاہتے ہیں لیکن عربی سے ناواقف ہیں اگر تو یہ کتاب صرف اور صرف آپ ہی کے لیے ہے جس کے مطالعے سے آپ اپنی

عافیت اور آخرت کا انتظام بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔
منگوانے کا پتہ

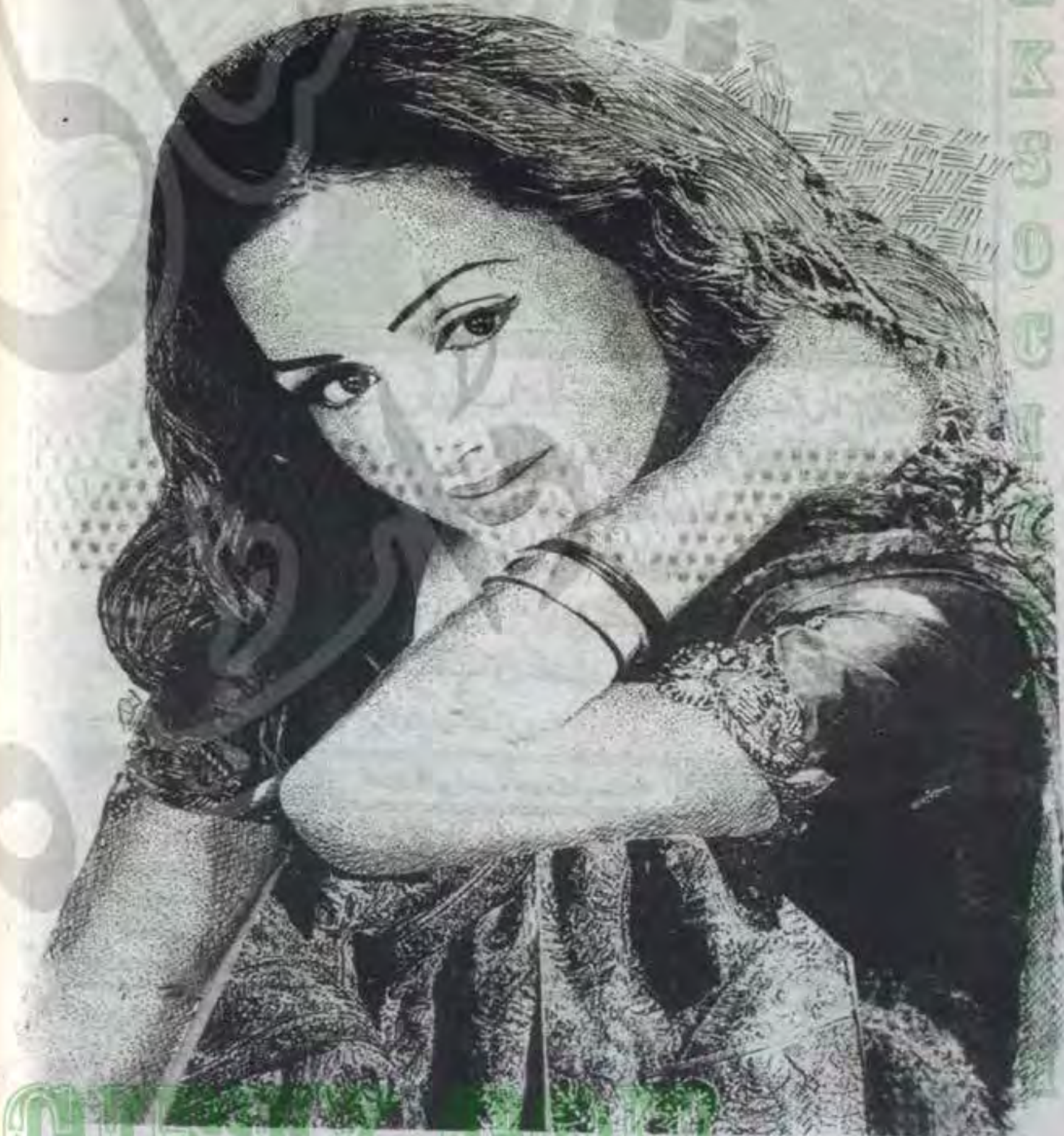
نئے آفیس گروپ آف پبلیکیشنز ڈاکٹر بلوایا اسٹریٹ آئی جی ڈی گروپ، کراچی

مکتبہ القویۃ، اردو بازار، لاہور

سلیم احمد خٹاط

اسی دن میں بس موتی

”وہ اپنے لیے نہیں کہہ رہی تھی میں، آپ جانتے ہیں ہم سب کو ادینہ بہت عزیز ہے، اُس وقت بھی ہم میں سے کوئی اُس کا بُرا نہیں چاہتا تھا اور نہ اب ہم اُسے ناخوش دیکھنا چاہتے ہیں۔“ ماہی نے پھر سے اُس کی بات کاٹ کر



وضاحت دی، اور بڑی سہولت سے اُسے اپنی ذات سے ہٹا کر کہتے ہوئے اُسے دیکھنے لگی۔
”تو کیا ادینہ..... ماہی! ادینہ خوش تو ہے نا، اُس کے ساتھ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟“ ادینہ کے ذکر سے وقار کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر ابھرا تھا، جو ماہی کی سمجھ سے باہر تھا، وہ وقار کے اس انداز کو اُس کی ادینہ کے لیے فکر مندی کہتی یا پھر کچھ اور..... اُسے کچھ سمجھ نہ آیا۔

”اللہ نہ کرے کہ اُس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو، یادہ ناخوش ہو، وہ معید بھائی کے ساتھ خوش ہے۔“ اور فوراً وقار کو بتایا۔

”اچھی بات ہے۔“ جواباً وہ اتنا ہی بولا، چہرہ اب کے بغیر کسی تاثر کے سنجیدہ تھا۔
”وقار بھائی! ایک بات بتائیں گے مجھے؟“ قدرے توقف کے بعد ماہی نے اُسے دیکھتے ہوئے اجازت طلب استفسار کیا۔
”پوچھو!“



”ادینہ سے شادی سے انکار کی کیا وجہ تھی، کیوں آپ اُس وجہ کو چھپا رہے ہیں اتنے عرصے سے؟“ اس نے ہمت کر کے پوچھا، شاید اُسے اپنی زندگی کے سلجھاؤ کے لیے بھی اس سوال کا جواب اور وقار کے انکار کی وجہ جانتی ضروری لگی تھی۔

”وجہ صرف میرے لیے معقول ہے، تم سب کے لیے وہ وجہ اہمیت نہیں رکھتی۔“ وہ بولا۔

”آپ بتائیں تو سہی۔“

”میں کسی اور سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“ وہ بتانے لگا۔

”پھر آج تک کیوں نہیں کی؟“

”ضرور کرتا مگر کچھ دن بعد ایک ایکسڈنٹ میں اُس کی ڈیٹھ ہو گئی تھی، سو میں نے کسی کو کچھ بتانا ضروری نہ سمجھا، آج اس لیے تمہیں بتا رہا ہوں کہ کم از کم تم مجھ سے نالاں مت ہو، میں بہت بُرا بھی نہیں ہوں۔“ وہ سر جھکائے اُسے بتانے کے بعد دھیرے سے بولا۔

”میں اب کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ جس سے کرنا چاہتا تھا وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے اور جس کی شادی مجھ سے ہو رہی تھی وہ میری وجہ سے رُسا ہوتے ہوتے بچی، اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ کسی تیسری لڑکی کو مجھ سے کوئی تکلیف ہو۔“

”اب آگے سب ٹھیک ہوگا بھائی!“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”ان شاء اللہ!“ وقار نے فوراً کہا، پھر برادرانہ شفقت سے اُسے دیکھتے ہوئے ساتھ لگا کر بولا۔

”میں ہمیشہ تمہاری خوشی کی دعا کروں گا، اللہ تمہیں خوش و آباد رکھے۔“

”آمین!“ آہستگی سے کہتے ہوئے وہ سر جھک گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا۔“ فلک حیران کھڑی تھی، جیسی عثمان نے آگے بڑھ کر اُس کے چنگی کاٹی، وہ اُچھل کر اُس کی طرف مڑی۔

”آہ.....!“ دکھ بھری ”آہ“ منہ سے نکالی اور خونخوار نظروں سے اُسے دیکھا۔

”بد تمیز! چنگی کیوں کاٹی مجھے؟“

”اس لیے کہ تمہیں یقین آئے کہ تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہیں، واقعی میں پاس ہو گئی ہو، مرتے مرتے ہی سہی ہر F.A کلیر ہو گیا ہے تمہارا۔“ عثمان نے وضاحت دیتے ہوئے اُسے یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی۔

”مرتے مرتے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ اچھے خاصے نمبروں سے پاس ہوئی ہوں میں۔“ وہ گھور کر اُسے دیکھتی بڑے فخر سے بولی، چہرے پر بے پناہ خوشی رقصاں تھیں۔

”جیسی یقین نہیں آ رہا ہوگا۔“ تیمور نے پُر مزاح لہجے میں طنز کیا۔

”تم تو کچھ نہ ہی بولو موٹو!“ فلک نے اپنے مخصوص انداز میں اُسے گھر کا۔

”شٹ اپ.....!“ تیمور اپنی شان میں گستاخی کہاں برداشت کر سکتا تھا، برجستہ اُسے کہا، مگر آج وہ اچھے موڈ میں تھی، بجائے جواب پر جواب دینے کے مٹھائی کا ڈبہ لیے اُس کی طرف بڑھی جو عارف شاہ اُس کے پاس ہونے کی خبر سننے پر خوشی سے لائے تھے، مشارب کو ابھی تک نہیں پتہ تھا، وہ آفس میں تھا، البتہ وہ اس کے واپس آنے پر اسے خوشگوار سر پر اندر دینا چاہتی تھی، جیسی فون کر کے بھی نہ بتایا، گھر کے باقی مکین اُس کی کامیابی پر خوش تھے۔

”آج کے دن میں تم سے لڑنا ہرگز نہیں چاہتی، سو لو! ایک اور مرتبہ منہ میٹھا کرو، میں صرف پاس ہی نہیں بلکہ اپنی محنت سے کامیاب ہوئی ہوں، اس لیے خوشی ڈبل ہے، تو مٹھائی بھی ڈبل کھاؤ۔“

”ضرور، ضرور.....!“ تیمور تو تھا ہی بیٹھے کا شوقین، فوراً اُسے اُس کا کہنا مانا اور مٹھائی اٹھا کر منہ میں ڈالی۔

”پھر تو ٹریٹ بھی ڈبل ہوئی چاہیے۔“ عثمان نے اُس کی خوشی کا فائدہ اٹھانے کے لیے فوراً فرمائش کی۔

”ہاں ہاں! کیوں نہیں، مگر نہیں۔“ جوش میں سر اثبات میں ہلاتے ہوئے یک دم اُسے کچھ یاد آیا، تو فوراً ڈائریکشن چھینچ کر کے سرنفی میں ہلایا۔

”کیوں نہیں؟“

”اس لیے نہیں کہ ٹریٹ نہیں دوں گی بلکہ اس لیے نہیں کہ میں نہیں دوں گی، کیونکہ مستبشرہ نے کہا تھا کہ اگر میں پاس ہوئی تو ٹریٹ وہ دے گی، اور میں نے ابھی تک یہ خوشخبری سنائی ہی نہیں، تم دونوں یہاں بیٹھو، میں اُسے فون کر کے بتاتی ہوں تاکہ جلد از جلد ٹریٹ کا بندوبست ہو سکے۔“ اپنی عادت سے مجبور فلک نے باتوں کا پہاڑ کھڑا کیا اور بات ختم کرتے ہی فون کی طرف بڑھی، ریسپور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا، دو تین تیل جانے کے بعد کال ریسپو کر لی گئی تھی۔

”ہیلو!“ دوسری جانب مستبشرہ ہی تھی۔

”ہیلو مستبشرہ! کیسی ہو؟“ فلک نے خوشگوار کھنکھاتی آواز میں پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ مستبشرہ کی آواز تھکی تھکی سی تھی، ان دنوں علی کو لے کر اُس کے خط اور اپنی کیفیت سے وہ بُری طرح الجھی ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہو تو پھر جلدی سے مجھے مبارکباد دو۔“ فلک کا انداز ہمیشہ کی طرح اپنی ہی خاصیت لیے بہت پیارا استحقاق بھرا تھا۔

”کس بات کی؟“ اُس نے پہلے وجہ پوچھنی چاہی۔

”میں نے K-2 کی چوٹی سر کر لی ہے۔“ وہ شوخی سے مسکراتی ہوئی بولی۔

”امیزنگ..... کیسے مگر؟“ مستبشرہ اُس کی عادت و شوخ و شریر طبیعت سے واقف اُسی کے انداز میں پوچھنے لگی، ایک مقصد فلک سے باتوں کا اپنے ذہن پر چھائی بے زاریت اور تھکاوٹ سے جان چھڑانا بھی تھا، بہت دنوں بعد فلک کی کال سے اُسے یہ موقع ملا تھا، جسے وہ شاید گنوا نا نہیں چاہتی تھی۔

”وہ ایسے کہ مابدولت نے انگلش کو مات دے کر F.A کلیر کر لیا ہے۔“ اُس نے بتایا۔

”اوہ رینلی.....! بہت بہت مبارکباد۔“ مستبشرہ سن کر خوش ہوئی تھی۔

”تھینک یو، بٹ خالی خالی مبارکباد سے کام نہیں چلے گا، تم نے ٹریٹ کا وعدہ کیا تھا، سو آج تمہیں ہمارے گھر آنا ہوگا ٹریٹ دینے۔“ فلک صاف اور سیدھا بولی۔

”آج نہیں فلک!“ یک دم وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے منع کر گئی، خود پر حیران بھی ہوئی، وہ فرار چاہ رہی تھی، مگر شاید علی کی یاد کو اب اُسے آزاد چھوڑنا گوارہ نہ تھا۔

”آج کیوں نہیں؟“ فلک نے منہ بسورا۔

”میری طبیعت سیٹ نہیں ہے۔“

”بہانہ نہیں چلے گا، تھوڑی دیر پہلے تم نے خود کہا تھا کہ تم ٹھیک ہو۔“ فلک نے اُسے یاد دلایا، ٹریٹ کے علاوہ بھی وہ مستبشرہ کو اپنی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی خوشی میں ساتھ چاہتی تھی۔

”ہاں کہا تھا، مگر میری جگہ میں طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں کئی دن سے اسکول بھی نہیں جا رہی، تم اماں سے پوچھ سکتی ہو۔“

”میں کسی سے نہیں پوچھ رہی، تم نے کہہ دیا، میں نے مان لیا۔“ وہ خفا سی ہوئی۔
”پلیز فلک ڈیز! ناراض مت ہونا۔“ مستبشرہ کو خود بھی اُسے منع کر کے اچھا نہیں لگا۔
”اوکے پھر تم وعدہ کرو کہ طبیعت ٹھیک ہوتے ہی آؤ گی یہاں۔“

”پکا وعدہ۔۔۔ ٹریٹ پھر ڈیوڑھی، ہاں گفت جلد ہی تم تک پہنچ جائے گا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے فوراً بولی۔
”میں انتظار کروں گی، اور تم پچھو کو یاد سے بتانا میرے پاس ہونے کا، میں آؤں گی ان کی طرف ایک دو دن میں۔“

”اوکے بتا دوں گی، اللہ حافظ!“ کہتے ہوئے مستبشرہ نے اجازت چاہی اور راجیلے کے منقطع ہوتے ہی مشارب شاہ کا نمبر ڈائل کیا، اُس کے کال ریسیو کرنے پر گھر جانے سے پہلے اپنی طرف آنے کو کہا، تو اُس نے حامی بھرتے ہوئے اجازت چاہی، مستبشرہ نے فلک کے پاس ہونے کا اماں اور بابا کو بتایا، وہ بھی سن کر خوش ہوئے تھے، کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھ کر وہ باہر لان میں چلی آئی۔

شام کے سائے پھیلتے جا رہے تھے، سردیوں کی شامیں، خشک آلود فضا نہیں، ٹھنڈی ہوائیں اُسے شروع سے بہت پسند تھیں، اُس نے کرسی سے ٹیک لگا کر نگاہیں اوپر کھلے آسمان پر نکا دیں، جہاں سفید بادلوں کے بے شمار ٹکڑوں کے نیچے دن بھر آوارہ گردی کرنے کے بعد چند پرند اپنے اپنے آشیانے کی طرف قافلے کی صورت میں پرواز تھے، وہ انہماک سے انہیں دیکھنے لگی، دل کچھ بوجھل سا ہونے لگا، شام لچھ لچھ گزرتی اُسے بے چین کرنے لگی تھی، یہ سرد شام سے پھیلتی ٹھہری ہوئی اُداسی تھی یا اندر پنہاں وحشت و ویرانی کی کہانی، جو اُس کی سمجھ سے بالاتر تھی، وہ غیر مرئی نقطے کو گھورتی خالی ذہن کے ساتھ اُسی حالت میں بیٹھی رہی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد مشارب شاہ وہاں آ گیا تھا۔

”یہاں باہر اتنی سردی میں کیا کر رہی ہو؟“
”بس یوں ہی دل چاہ رہا تھا۔“

”اچھا۔۔۔ دیے میں سمجھا کہ کہیں میرا انتظار کر رہی تھیں۔“ وہ ہنسنا، ساتھ ہی چاہت بھری نظروں سے اُسے دیکھا، مستبشرہ ان نظروں سے انجان مسکرائی۔

”تم سمجھ سکتے ہو کیونکہ میں نے تمہیں بلایا ہے، تمہارا استقبال بھی مجھی کو کرنا ہے۔“
”ٹھیک کہا تم نے، لیکن تم کچھ پریشان، اُداس سی لگ رہی ہو، خیریت؟“ وہ پوچھنے لگا، مستبشرہ کا چہرہ دیکھنے میں بھی اترا ہوا لگ رہا تھا، کچھ اُس کی پرشوق آنکھوں کا بھی کمال تھا، جو اپنی اپسرا کے مدھم رنگ و بھجھی آنکھوں کو بے تاثر دیکھ کر بے تاب سی ہوئیں۔

”خیریت ہے سب، مشارب! تم سے مجھے ایک کام تھا۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔
”کہو میں حاضر ہوں۔“

”تم جاتے وقت مارکیٹ سے میری طرف سے فلک کے لیے کوئی بھی اچھا سا گفٹ لیتے جانا، جو اُسے پسند آئے، میں خود لے کر جاتی، لیکن آج میں نہیں جاسکتی۔“ مستبشرہ نے اُسے بلانے کا اصل مدعا بیان کیا۔

”فلک کے لیے گفٹ۔۔۔ کیوں؟“ مشارب حیران ہوا۔
”میں نے اُسے کہا تھا کہ جب وہ پاس ہوئی تو میری طرف سے ٹریٹ ہوگی، لیکن میں آج نہیں جاسکتی وہاں،

رداؤ انجسٹ 196 اکتوبر 2012ء

اس لیے سوچا تمہارے ہاتھوں اُسے گفٹ ہی بھجوا دوں۔“

”کیا۔۔۔ فلک پاس ہوگئی؟“ وہ شدید حیرت کا مظاہرہ کرتا خوش بھی ہوا۔
”ہاں، اس نے صبح ہی فون پر بتایا ہے مجھے۔“
”کمال ہے، اُس نے مجھے نہیں بتایا۔“

”ہو سکتا ہے وہ تمہیں فون کے بجائے رو برو بتانا چاہتی ہو۔“ مستبشرہ نے اس کی حیرت کو رفع کرنا چاہا، آصفہ شاہ کی طرح اُس نے بھی دونوں کو لے کر اپنا ہی اندازہ بہت پہلے لگا لیا تھا، جیسی فلک کی سوچ سے سوچ کر بولی۔
”یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ اُس نے تصدیق کی۔

”اچھا پھر میں نکلتا ہوں۔“ ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، اُس سے اجازت لی۔
”تھوڑی دیر تو رکو، اندر اماں کے پاس بیٹھو، میں جب تک چائے بناتی ہوں تمہارے لیے۔“ مستبشرہ نے اخلاق نبھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں پھر کبھی سہی، تم پچھو اور اور پچھا جان کو میرا سلام کہہ دینا۔“ اُس نے منع کیا۔
”اوکے، مگر گفٹ یاد سے لے جانا، اللہ حافظ!“ مستبشرہ اُسے چھوڑنے دروازے تک آئی۔

”اللہ حافظ!“ وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل آیا، مستبشرہ واپس جا چکی تھی، اُس نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے مارکیٹ کی راہ لی، اپنی اور مستبشرہ کی طرف سے فلک کے لیے الگ الگ گفٹ پیک کروایا اور گھر کی طرف روانہ ہوا، شام کے سائے ڈھل رہے تھے، راستے میں سے اُس نے فلک شاہ کی من پسند آئیں کریم بھی پیک کروالی، جانتا تھا دیوانی سی فلک سردی میں آئیں کریم کی دیوانی تھی، باقی کا راستہ جلدی سے طے ہوا، اس کی گاڑی کا ہارن سن کر مین گیٹ چوکیدار کے بجائے فلک شاہ نے ہی کھولتے ہوئے خوشگوار مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کیا۔

”میرے پاس تمہارے لیے ایک گڈ نیوز ہے مشارب شاہ!“ اور اس کے گاڑی روکنے کا انتظار کیے بنا ہی ہانک لگائی۔ مشارب شاہ اُس کے انداز پر مسکرایا، مستبشرہ کا کہا کچھ لگا، وہ اُسے رو برو بتانے کے چکر میں اب اس کے سامنے کھڑی تھی، وہ فی الحال گاڑی کے اندر تھا، مشارب نے شیشہ نیچے کیا ہوا تھا، فلک جھک کر بازوؤں سے ٹیک دروازے سے لگا کر اُسے دیکھنے لگی۔

”مجھے پتہ ہے۔“
”تمہیں کیسے پتہ ہو سکتا ہے؟“ وہ حیران ہوئی، مستبشرہ سے متعلق خیال اس وقت اُسے آن نہیں سکتا تھا۔
”بس ان ہواؤں سے میری دوستی ہے جو تمہاری ہر بات مجھے بتا دیتی ہیں۔“ کہتے ہوئے وہ فرنٹ ڈور کھول کر باہر نکلا، ساتھ ہی آئیں کریم اور گفٹس بھی ہاتھ میں لیے، جن کی طرف فلک کا دھیان نہیں گیا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“ اُسے یقین نہ آیا، سوچونک کر اُسے دیکھا۔
”کیوں نہیں ہو سکتا بھلا؟“ وہ الٹا اُس سے پوچھنے لگا۔
”تمہیں عثمان یا تیمور میں سے کسی نے بتایا ہوگا؟“

”آں ہاں۔۔۔ کہاناں کہ مجھے ہواؤں نے خبر دی ہے۔“ وہ اُسے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہا تھا، فلک نے اُسے گھورا۔

”بچوں جیسی باتیں مت کرو مشارب شاہ!“ اور حیکمے انداز میں کہنا چاہا۔ مشارب شاہ اپنی پاگل سی دوست کے انداز پر کھل کر مسکرایا۔

”اچھا دادی اماں! نہیں کرتا۔“

”بتاؤ ناں مجھے سچ سچ تمہیں کس نے بتایا ہے؟“

”بتانے سے پہلے مبارک باد دے دوں؟“ مشارب کا مقصد اُسے تنگ کرنا تھا، سو شریر مگر اجازت طلب نظروں سے اُسے دیکھا۔

”نہیں، پہلے مجھے اس کا نام بتاؤ، جس نے میرے سر پر انز کا ستیاناس کر دیا ہے، میں کب سے تمہیں بتانے کے لیے اتنی سردی میں باہر کھڑی تھی، مگر سب بے کار میں گیا۔“ وہ بولی۔

”مستبشرہ نے مجھے بتایا ہے، بلکہ مجھے بلایا اور تمہارے لیے گفت بھیجا ہے، سو میں نے بھی تمہارے لیے گفت لیا ہے اور تمہارے لیے تمہاری پسند کی آکس کریم بھی لی ہے، مجھے بہت خوش ہوئی ہے کہ تم اپنی محنت سے پاس ہوئی ہو۔“ بتاتے ہوئے مشارب نے گفتس اور آکس کریم اُسے تھمائی، فلک کے چہرے پر بھرپور خوشگوار مسکراہٹ تھی۔

”تھینک یو سوچ مشارب!“

”یو ویلکم... اچھا اب جلدی سے آکس کریم سب کو کھلاؤ اور خود بھی کھاؤ، پکھل رہی ہے۔“ اُس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے اُسے کہا۔

”اوکے... پھر میں نے مستبشرہ کو بھی تھینکس کہنے کے لیے کال کرنی ہے، مگر تم تو رکو... تم نے مجھے مبارک باد نہیں دی اور اندر چل دیے۔“ وہ اس کے پیچھے لگی۔

”اوہ سوری... مبارک ہو تمہیں، لیکن آئندہ آگے بھی ایسی ہی محنت کرنا، میری بیسٹ وئزر ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں گی۔“ وہ مڑا اور خوش دلی سے بولا۔

”تھینکس!“ وہ آنکھوں میں انبساط کے رنگ لائی، مسکرائی، اور اپنے تئیں اُس کے لہجے سے محبتوں کا رس نکال کر گنگنائی ہوئی کچن کی اور چل دی۔

☆.....☆.....☆

اس ایک ہفتے میں وہ ذہنی طور پر قدرے تھک چکی تھی، مگر مکمل طور پر وہ ریلیکس ہو کر بے غم نہیں ہونا چاہتی تھی، ایک جنگ سی اُس کے اندر چھڑ گئی تھی، اپنی بے قدری کا ملال وہ مکمل طور پر توڑا نہیں کر سکتی تھی، مگر اُس کے اثر کو کچھ بہت کم ضرور کرنا چاہتی تھی، مراد کے کھیل میں اُسے اب اپنا کردار تھوڑا بہت ادا کرنا تھا، ایک عام لڑکی بن کر، خود کو کچھ بھی اچھا ہونے کے دھوکے سے نکال کر۔

بڑی گستاخ ہے تیری یاد اُسے تمیز سکھا دو

دستک بھی نہیں دیتی اور دل میں اتر جاتی ہے

وہ اپنی ہی سوچوں میں منہمک تھی، جب پریش نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے با آواز بلند بڑی ترنگ میں شعر پڑھ کر اُس کی محویت کو توڑا۔ مہروش نے قدرے چونک کر اُس کی طرف دیکھا تو جہاں وہ مسکرا رہی تھی وہیں آنکھوں میں خوشی و شرارت لیے موبائل اسکرین اُس کی آنکھوں کے سامنے ہلایا۔

”یہ کیا ہے؟“

”ایک خوبصورت میسج... آپ کے لیے۔“

”میرے لیے؟“ وہ حیران ہوئی۔

”جی ہاں، صرف آپ کے لیے، لیکن آپ اپنے خیالوں میں اتنی مجبوس ہیں کہ آپ کا دھیان میسج کی طرف گیا ہی

نہیں، سو مجھے ہی غیر اخلاقی حرکت مجبوراً کرنی پڑی، آپ کا میسج اوپن کر لیا، اور یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔“ پریشے تفصیل سے بولی۔ مہروش نے اُسے گھورتے ہوئے موبائل اُس کے ہاتھ سے لینا چاہا، مگر اُس نے فوراً ہاتھ اوپر اٹھایا۔

”اب جب غیر اخلاقی حرکت کر چکی ہوں تو میسج بھی پورا پڑھوں گی میں۔“

”جی نہیں۔“ مہروش نے نفی میں سر ہلایا، دل میں کھٹکا سا لگا کہ کہیں آگے مراد منصور نے کوئی طنزیہ بات یا کچھ بھی غلط نہ لکھا ہو، جسے اگر پریشے پڑھ لیتی تو اُس کے لیے ہینڈل کرنا مشکل ہو جاتا۔

”مجھ سے کیسا بھید مانی! میں سب جانتی ہوں۔“ وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا جانتی ہو تم؟“ مانی ایک دم سنجیدہ ہوئی، بظاہر مصنوعی حیرت سے اُسے دیکھا، مگر درحقیقت بے یقین ہو کر، کہیں واقعی مراد نے کوئی ایسی بات تو نہیں لکھ دی جس سے پریشے سب کچھ جان گئی ہے؟

”یہی کہ صرف آپ ہی مراد بھائی کے پیار میں پاگل دن رات انہیں نہیں سوچتیں، بلکہ وہ بھی آپ کے بنا نہیں رہ سکتے۔“ پریشے بولی، مہروش نے ایک دم سکھ کا سانس خارج کیا کہ اُس کی بے بسی پر پردہ اُٹھنے سے بچا تھا۔

”اسی لیے مراد بھائی آج شام کو آپ کو لینے آئیں گے، یہ انہوں نے میسج کے ساتھ ہی لکھا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ وہ آپ کے بنا زیادہ دن اکیلے نہیں رہ سکتے، جس کا اندازہ ہوتے ہوئے بھی آپ جانتے بوجھتے انہیں تڑپا رہی ہیں۔“ پریشے نے مزید بتاتے ہوئے میسج اُسے سنایا۔ مہروش نے اُس کے سامنے آنکھوں میں چمک اور چہرے پر حیا کی لالی لائی، لیکن مراد کی انہی باتوں میں چھپے مطلب سے واقف اس کا ذہن منتشر ہوا تھا، وہ کچھ دن مزید رہنا چاہتی تھی، پر مراد کی بات تو پتھر پر لکیر ہوئی تھی، اُسے آج شام پھر اُس کے ساتھ جانا تھا۔

”اچھا اب موبائل دو گی تم مجھے؟ میں انہیں Reply کر دوں۔“

”شیور، وائے ناٹ!“ پریشے نے مسکراتے ہوئے موبائل اُسے تھمایا۔

”آپ کے ساتھ یہ ہفتہ اتنی تیزی سے گزرا ہے کہ اندازہ تک نہیں ہوا، پھر کب آئیں گی؟“

”ابھی میں گئی نہیں ہوں اور میسج میں تم نے پڑھ لی ہے اپنے جیجائی کی بے تابی کی کہانی، سو جب زیادہ دن تک میرے بغیر رہنے لگے تب آ جاؤں گی۔“ مانی نے شریر انداز میں کہتے ہوئے دھیما سا قہقہہ لگایا۔

”دیش ناٹ فیئر... آئی نو مراد بھائی کا پیار ساری عمر آپ کے لیے ہر دن زیادہ سے زیادہ بڑھتا رہے گا، آپ ہیں ہی اتنی پیاری کہ مراد بھائی ایک لمحے کو آپ کے بنا رہنے کا سوچیں گے بھی نہیں، آپ تو لگتا ہے ان سے فرصت نکالنا ہی نہیں چاہتیں، جیسا ایسا کہہ رہی ہیں۔“ پریشے فل موڈ میں تھی۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ ہنسی، دل میں محض الگ افسوس کیا، سب مراد کے روپ کے بہروپ سے خوش تھے۔

”آپ کی اگلی آمد پر دیکھ لیا جائے گا۔“ پریشے بولی۔ مہروش نے شام سے پہلے تک اپنا تمام سامان پیک کیا، ڈریس چینج کیا، اور باہر لاؤنج میں چلی آئی، جہاں باقی تمام مکین بیٹھے ہوئے تھے، سعید احمد شام کا اخبار پڑھنے میں مجھو تھے، وقار نی وی کا ولیم دھیمے رکھے چینل سرچ کر رہا تھا، نفیسہ بیگم اور پریشے بھی آپسی باتوں میں مصروف تھیں، مانی اُن کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ڈور بیل کی آواز ہوئی، وقار اُٹھ کر گیا، مراد اپنے سنجیدہ چہرے کے ساتھ کھڑا تھا، وقار نے گلے لگ کر اُس کا استقبال کرنا چاہا، مگر مراد نے مصافحہ کرنے پر اکتفا کیا، وقار نے بُرا مانے بغیر اُسے اندر

آنے کو کہا، وہ خاموشی سے اندر چلا آیا، نفیسہ بیگم کو دور سے سلام کیا، پریشے کے سلام کا جواب دیا اور سعید احمد کے گلے لگا۔

”السلام علیکم ماموں!“

”وعلیکم السلام! کیسے ہو بیٹا؟“ انہوں نے خوشگوار انداز میں پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اُس نے مختصراً کہتے ہوئے ایک نظر مدد پر ڈالی تھی۔ مدد روش نارمل سی نفیسہ بیگم کے ساتھ ہو کر بیٹھی، پریشے فوراً سے بچن کی طرف گئی تھی کیونکہ مراد منصور زیادہ دیر بیٹھتا نہیں تھا۔

”کلوٹم کو بھی ساتھ لاتے، بہت دن ہوئے اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔“ سعید احمد اُس کی طرف متوجہ تھے، وہ صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

”ماموں! میں تو سیدھا آفس سے یہیں آیا ہوں، ورنہ امی کو ساتھ لے آتا، اگلی بار آیا تو انہیں ساتھ لے آؤں گا، آپ اور ممانی جان بھی آئیں ناں کبھی ہمارے گھر۔“ اُس نے بتایا، ساتھ ہی انہیں دعوت دی، ماہی نے کن انھیوں سے اُس فراڈ شخص کو دیکھا۔

”ضرور بیٹا! کبھی آئیں گے۔“ انہوں نے حامی بھری۔

”اور تمہارا کام کیسا جا رہا ہے؟“

”کام بالکل ٹھیک جا رہا ہے۔“ وہ بولا، اتنے میں پریشے مختلف لوازمات کے ساتھ چائے لائی اور اُسے سر دی، چائے سے فراغت کے بعد مراد نے اجازت چاہی، وقار تمام وقت میں وہیں خاموشی سے بیٹھا رہا تھا۔

”ماموں! پھر آئیے گا ضرور.... چلیں مدد روش!“

”مراد بیٹا! کھانا کھا کر جانا، سب کچھ تیار ہے۔“ نفیسہ بیگم نے کہا۔

”آج نہیں ممانی جان! امی بھی ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی، انشاء اللہ پھر کبھی آپ سب کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔“ اُس نے سہولت سے منع کیا۔

”چلو ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ بولیں، جب تک مدد روش جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا امی! اللہ حافظ!“ پہلے امی اور پھر ابو سے مل کر اجازت چاہی، پریشے کے گلے لگی، پھر خاموش بیٹھے وقار کی طرف متوجہ ہوئی۔

”وقار بھائی! آپ میری طرف چکر لگاتے رہا کریں، اور پلیز اپنا خیال رکھیں، مجھے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ اچھی لگتی ہے نہ کہ سنجیدگی۔“ مقصد مراد منصور کو اندر تک جلائے اور وقار کو پریشانی سے نکالنا تھا، کیونکہ مراد کا مقابلہ کرنے کے لیے وقار سے بہتر رویہ و محبت و لگاؤ کا اظہار اُس کا ہتھیار بن سکتا تھا۔ ماہی کی بات پر جہاں وقار دھیرے سے مسکرا کر اٹھتے ہوئے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ رہا تھا، وہیں مراد نے شدید ناگواری سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے غصہ ضبط کیا تھا۔

”ماہی! چلیں اب.... دیر ہو رہی ہے۔“ اور فوراً بولا۔ وہ ایک خاموش نظر اُس پر ڈالتی باہر نکل آئی، مراد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اُسے دیکھا، فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد وہ بالکل سامنے دیکھ رہی تھی، وہ گاڑی اشارت کرنے کے ساتھ ہی زبان کو بھی حرکت میں لایا۔

”کیسا گزرا یہ ایک ہفتہ؟“

”آپ کی سوچ سے بھی زیادہ پرسکون اور شاندار۔“ وہ خوشگوار سے بولی۔

”ہمممممم.... ضرور ہر لمحہ پھر میں ہی تمہارے حواسوں پر چھایا رہا ہوں گا، جواتنی خوش ہو۔“ وہ طعنیہ شرارت آمیز لہجے میں کہتا اُسے دیکھنے لگا۔

”ہوں.... بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔“ وہ بھی اُسے دیکھتی تحمل سے بولی۔

”مگر آپ کے بے ہودہ شعراور بیج کی طرح بالکل بھی نہیں۔“

”اچھا.... تو پھر کیسے سوچا تھا مجھے؟“ ماہی کی بات و انداز پر حسب معمول اُسے غصہ تو بہت جلد آیا تھا، مگر فی الوقت وہ غصے پر قابو پا گیا تھا۔

”بالکل ایسے جیسے آپ کے لیے سوچا جا سکتا تھا۔“ چہرے پر ڈر و خوف کی کوئی شکن لائے بغیر وہ بولی۔

”اندر کا الاؤ کم نہیں ہوا تھا تمہارا، اس ایک ہفتے میں؟“ جواباً طعنے ہوا۔

”آج سے کم ہوگا۔“ وہ مختصراً اُسی کے انداز میں بولی۔

”جسمی آنے سے پہلے جھوٹا مظاہرہ کرنے کی سعی کر رہی تھیں۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

”جھوٹے آپ خود ہیں، اس لیے سب آپ کو جھوٹ اور فریب لگتا ہے۔“ وہ برجستہ سپاٹ انداز میں بولی، مراد کا وقار سے متعلق طعنیہ رویہ اُسے اندر سے مضبوط کرتا بولنے پر مجبور کر رہا تھا۔

”مجھے زیادہ بکواس پسند نہیں ہے۔“ جس پر مراد کی برداشت ختم ہونے کو تھی، اُسے گھورتے ہوئے تلخ ہوا۔

”ایک بات اور....!“ ساتھ ہی تنبیہی نگاہ اُس پر ڈالی۔

”مجھے وقار میرے گھر میں نظر نہ آئے، پتو سے باندھ لو، یہ میرا حکم ہے اور میں اپنے حکم کی عدولی برداشت نہیں کروں گا۔“

”آپ کا گھر اب صرف آپ کا نہیں ہے، میرا بھی ہے، اور بھائی ہونے کے ناطے وہ میرے گھر آئیں گے، ایک بار نہیں بلکہ بار بار آئیں گے، میں آپ کے سامنے انہیں بلاؤں گی اور آپ انہیں روک نہیں سکیں گے۔“ بے خطر آواز میں کہتی وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، جہاں اُس کے تاثرات بگڑ چکے تھے اور چہرہ لال بھبھوکا بن گیا تھا۔

”کیوں کہ جہاں آپ نے خاندان کو جوڑنے کے لیے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا، وہاں اُس اعلیٰ ظرفی کو اعلیٰ مقام پر پہنچانے کے لیے آپ کو چپ رکھنا ہوگی، بصورت دیگر بول کر یا دل کا خناس باہر نکالنے کے لیے آپ کو اپنے معتبر مقام سے دستبردار ہونا پڑے گا، جو آپ کی انا اور عزت نفس پر گراں گزر سکتا ہے، اس لیے آپ چاہتے ہوئے بھی اپنی یہ حسرت پوری نہیں کر سکتے، سو ایسی کوشش بھی مت کریئے گا، جس سے آپ سب کی نظروں میں مشکوک ٹھہریں۔“ ماہی نے چپ ہوئے بنا صاف شفاف لفظوں میں اُسے کہہ سنایا، جانتی تھی مراد جیسا انا پرست بندہ اپنا نام، مقام سب سے اونچا رکھنے کے لیے جہاں سینت سینت قدم رکھتا ہے وہاں کسی ایسی معمولی سی لغزش کو انورڈ نہیں کر سکتا جو اُس کے تمام کئے کرائے پر پانی پھیر دے۔

”تم میری فکر نہ کرو، میں تمہارا ایسا حشر کروں گا کہ تم خود مظلومیت کی داستان بنی پھرोगی۔“ لہجے میں دبی غراہٹ کے ساتھ وہ بولا۔

”مجھے اب آپ سے ڈر نہیں لگتا، یہ میں آپ کو پہلے بتا چکی ہوں، مجھے بار بار دھمکی دینے یا ڈرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

”ماہی!.... ماہی!.... کیوں مجھے ہاتھ اٹھانے پر مجبور کرتی ہو؟“ گاڑی ایک جھکے سے روک کر اُس نے کھولتی

نظروں سے اُسے دیکھا۔ مانی لب بھینچے اُس کی بات پر مسکرائی۔
”مجھے مظلومیت کی داستان آپ صرف باتوں سے بنانا چاہتے ہیں۔“ اور تسخیرانہ بولتے ہوئے بات جاری رکھی۔

”آپ جس حد تک جاسکتے ہیں جائیں، میں بھی آپ کا مکمل وحشی پن دیکھنا چاہتی ہوں، محبت کے نام پر دھوکہ اور فریب کھانے کے بعد آپ مجھے انتقام کی بھیٹ چڑھانا چاہتے ہیں، وہ بھی مجھے خبردار رکھ کر، یہ کسی مذاق سے کم نہیں ہے۔“ وہ متعجب تھی، مراد کا شعلہ جوالہ روپ اس لمحے اُسے مذاق ہی لگا تھا۔
”بس مہ روش!“ مراد نے کاٹ دار آواز میں اُسے روکا۔

”مراد منظور مذاق کرتا ہے نہ مذاق برداشت کرتا ہے، میں چاہوں تو ابھی کہ ابھی تمہاری ذات کو تہس نہس کر سکتا ہوں، اور کروں گا بھی، ہمارے درمیان تم ایک ضد کو لے کر بیٹھنا چاہ رہی ہو ناں کہ تم اپنے منہ سے کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی، تو نہ بتاؤ، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، لیکن اپنے سامنے اکڑنے والوں کو میں صرف جھکا تا نہیں بلکہ اپنے پیروں تلے روند ڈالتا ہوں اور اس بات کی تکلیف ہر سانس کے ساتھ تمہیں اذیت لگے گی۔“

”میں پرواہ نہیں کروں گی، مرد عورت کو کمزور سمجھ کر متکبر بننے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، مگر عورت کو اصل میں جانتے نہیں ہیں، بیشک عورت کو مرد کی نفرت، حقارت بے بس کر سکتی ہے، مگر جب بات عورت کی عزت نفس اور رشتوں کے تقدس کی ہو تو وہی بے بس عورت مرد کو بے بس کر دیتی ہے، عورت کو مردوں کے معاشرے نے پست کرنا چاہا ہے، مگر اللہ نے عورت کو بہت مضبوط، صابر، شاکر بنایا ہے اور عورت اُسی اللہ کے بھروسے ہر عہد میں لڑ کر ثابت قدم رہی ہے، مجھے بھی میرے اللہ پر اعتماد ہے، میں آپ کو آپ کے ہر وار کے سامنے ثابت قدم ملوں گی۔“ وہ مضبوط لہجے میں پُر عزم تھی۔

”دیکھا جائے گا ذیروز!“ مراد کو اہلہ وہ متاثر نہیں کر سکی تھی۔

☆.....☆.....☆

”علی! میں بہت مجبور ہو کر واپس تمہارے پاس آئی ہوں۔“ مستبشرہ تھک ہار کر اُس کے سامنے کھڑی تھی، ایک لمبی مسافت طے کرنے کے بعد دل کے ہاتھوں نہ نہ کرتے بھی اُس شخص کے سامنے کھڑی تھی، جس کی محبت کو اُس نے ٹھکرایا تھا اور اب جس کی محبت نے اُس کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔

”کیوں مستبشرہ! اب کیوں؟“ جبکہ وہ واقعی حیران تھا، مستبشرہ آج اتنے عرصے بعد اُس کے سامنے تھی اور اُس وقت جب وہ اُسے بھولنے کی مکمل تیاری کر چکا تھا۔

”تم خوش نہیں ہوئے مجھے پھر سے اپنے سامنے دیکھ کر؟“ وہ اُلٹا اُس سے سوال کرنے لگی۔

”اب کیسی خوشی مستبشرہ! اب کیسی خوشی؟ تم نے تو خوشی نام کے لفظ تک سے میرے ذہن کو خالی کر دیا تھا، اب میں کیسے اور کیا کہوں تمہیں، پھر سے سامنے دیکھ کر؟“ وہ ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا، مستبشرہ یک دم نادامی ہوئی۔

”کچھ بھی کہو علی! مجھے برا بھلا کہو، میرے کیسے کی سگینی کو میری بد نصیبی کہو، جو کہنا ہے کہو، مگر کہو، میں شرمندہ ہوں میں اپنی شکست کا اعتراف کرتی ہوں، میں اپنی ہار تسلیم کرتی ہوں، مجھے اپنے عمل پر پچھتاوا ہو رہا ہے، تمہارا یادوں نے مجھے توڑ دیا تھا علی! میرے کہے کو میرے منہ پر واپس مار دیا ہے، مجھے تمہارے سامنے کھڑا کر دیا، میں تمہاری گناہ گار ہوں، مجھے معاف کر دو!“ بالآخر وہ بکھر گئی تھی، بُری طرح شکست خوردہ ہو کر اُس کے سامنے آئی۔ ”اف کر گئی تھی۔“

”یوں مت کہو مستبشرہ! پلیز خود کو سنبھالو۔“

ردا اناجسٹ 202 اکتوبر 2012ء

”مجھے اب تم نے سنبھالنا ہے علی! تمہاری محبت نے مجھے سنبھالنا ہے اب، پلیز مجھے سمیٹ.....!“ وہ اُس کے سامنے گڑ گڑائی تھی۔

”اب بہت دیر ہو گئی ہے مستبشرہ!“ وہ دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔

”نہیں علی! کوئی دیر نہیں ہوئی۔“ علی کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں نمبر آئی تھیں۔

”تم نے جانے سے پہلے خود کہا تھا اب ہماری راہیں جدا ہوں گی۔“ یک دم علی نے کھنور پن کا مظاہرہ کیا، مستبشرہ سے محبت کے باوجود اُس کا لہجہ سخت اور تلخ ہو گیا تھا۔

”مجھے تمہی داماں مت کر علی!“

”تم نے بھی مجھے یوں ہی مایوس کیا تھا۔“

”تم مجھ سے بدلہ لو گے..... اپنی محبت سے بدلہ لو گے؟“ وہ بے یقین ہوئی۔

”میت نہیں پاگل پن تھا وہ سب، جس کا اظہار میں نے تم سے کیا تھا، مگر اب جب میں خالی ہاتھ ہوں تو تمہیں بھی کچھ نہیں دے سکتا۔“ وہ صاف اور سپاٹ بولا۔ اس لمحے کا اُس نے بڑی شدتوں سے انتظار کیا تھا، جب پھر سے مستبشرہ اُس کے سامنے ہو، مگر آج جب وہ اُس کے سامنے تھی تو نادانستہ طور پر وہ مستبشرہ کے لیے انجان بن گیا تھا۔

”میں تمہاری محبت میں یہاں واپس آئی ہوں علی! اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر، میں نے یونیورسٹی سے تمہارا ایڈریس لے کر بہت مشکلوں سے تمہیں ڈھونڈا ہے، اور تم تو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے، پھر اب کیوں پتھر دل بن کر میرا امتحان لے رہے ہو؟ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔“

”نہیں مستبشرہ! محبت میں کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا، کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہوتی، بس وقت گزاری ہے محبت..... تم نے بھی یہی کہا تھا، دنیا کے مسافر خانے میں محبت کا کوئی مول نہیں ہے، ہم انسان بے قدرے ہیں، خود غرض ہیں، اپنے سوا کسی کا نہیں سوچتے، میں نے بھی محبت کو ایک پوٹلی میں باندھ کر بہتے دریا میں پھینک دیا ہے، وقت ایک جیسا نہیں رہتا، بنا کسی کا خیال کیے ہر احساس سے لاپرواہ تنہا گزر جاتا ہے، اور میں خود کو اُس وقت کی قید سے باہر نکال لایا ہوں، جب میں تمہاری محبت میں بے بس تھا، اب میں خود کو تم سے بہت دور کرنا چاہتا ہوں، تمہاری یادوں سے آزاد ہو کر اپنے لیے جینا چاہتا ہوں۔“ علی بے لچک انداز میں اُس سے قطع تعلق کر رہا تھا، اپنی انا کے ماتھوں مجبور ہو کر اُسے دوبارہ سے دل میں بسانے کے بجائے اُسے اپنانے سے انکار کر رہا تھا۔

”لیکن میں تمہارے ساتھ جینا چاہتی ہوں علی! تم سے جھوٹے پیار کا ناک میں نے خوشی کے لیے نہیں کیا تھا، میں اپنے بابا سے کیا وعدہ نبھانا چاہتی تھی، اُن کا اعتبار جیتنا چاہتی تھی، مگر مجھے تمہاری محبت نے مات دے دی، بابا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، میری آنکھوں میں رقم تمہارے لیے محبت کو دیکھ کر انہوں نے اپنا وعدہ واپس لے لیا تھا، اب کی بار میں سچے دل سے تمہاری طرف آئی ہوں، میں تمہاری زندگی.....!“

”اب میری زندگی میں تمہاری کوئی جگہ نہیں مستبشرہ! میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں تمہیں بھولنے جا رہا ہوں، تم بھی مجھے بھول جاؤ، تمہارا کہنا بالکل سچ تھا، علی اور مستبشرہ کم از کم اس جنم میں ایک نہیں ہو سکتے، میں تم سے دور، بہت دور تمہیں بھولنے جا رہا ہوں مستبشرہ! جہاں نہ تمہاری یادیں میرا تعاقب کریں گی، نہ میں اپنی یادوں کو تمہاری اور بڑھنے دوں گا، مجھے ابھی کہنا بھی جانا ہے، اب نہ میرے پاس تمہارے عمل کی تلافی کا وقت ہے نہ میرے پاس رکنے کا وقت بچا ہے، میں اپنی اُس محبت کے لیے تم سے معافی کا خواستگار رہوں گا، جو تمہیں واپس یہاں میرے پاس لائی ہے، مگر میں ایک نہیں کر سکتی، اپنا خیال رکھنا مستبشرہ! میرا جانا ضروری ہے۔“ علی کے دل پر اُس نے پہلے کاری ضرب

ردا اناجسٹ 203 اکتوبر 2012ء

لگائی تھی اور اب علی گویا اُس تمام دکھ و اذیت اور طال کا مداوا کرنے کے لیے تمام حساب بے باق کر دیا تھا، مستبشرہ کو انکار کر کے اُسے دل سے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، مگر اس وقت اُس کے دل، دھڑکن، جذبات، خواہشات اور احساسات پر دماغ حاوی تھا۔ وہ مستبشرہ جمال سے عشق کے باوجود بے حس، خود سُر بن گیا تھا، اُس کی آنکھوں میں اُمید کی کرن کی کوئی رقی باقی نہ تھی، جو وہ نرم پڑتا۔

”شاید اسے ہی مکافات عمل کہتے ہیں۔“

”تم اپنی دنیا میں واپس چلی جاؤ مستبشرہ جمال! کیوں کہ میری دنیا میں اب محبت کی گنجائش باقی نہیں رہی، مجھے اب محبت پر یقین نہیں رہا، مجھے تم پر یقین نہیں رہا، میں ایک بار کے بعد بار بار سنا نہیں چاہتا، میں موت سے پہلے اپنی زندگی، اپنی سانسوں کے سامنے تمہاری وجہ سے فل اسٹاپ نہیں لگا سکتا، میں یہاں سے جا رہا ہوں، تم بھی واپس چلی جاؤ۔“ وہ قطعیت سے کہتا واپسی کے لیے مڑ گیا تھا، مستبشرہ جمال کو اُسی کے کھیل میں مات دے کر، اُسے تہی داماں چھوڑ کر، کچھ پل وہ وہیں ساکت کھڑی علی کی باتوں کو سچ جھوٹ کے ترازو میں تولتے ہوئے قسمت کے اس وار پر بے یقین تھی، جامد قدموں کے ساتھ دل کی دھڑکن اُسے بیٹھتی محسوس ہو رہی تھی، آنکھوں میں اشکوں کی روانی کا تسلسل تیز رفتاری سے جاری ہو گیا تھا۔ جنہیں ہاتھ کی پشت سے صاف کرتی وہ بے بسی سے بچتا چاہ رہی تھی، جیسی اُسے اپنے اندر انجانی سی طاقت محسوس ہوئی تھی۔ شاید یہ طاقت اُس کی محبت کی طاقت تھی، جسے محسوس کرتے ہی وہ سرعت سے آگے کی طرف بڑھتی تھی، جہاں دور سے علی آیان گیلانی کی پشت دکھائی دے رہی تھی، وہ اُس تک ایک ہی جست میں پہنچنا چاہ رہی تھی، مگر اُس کی راہ میں آنا فانا لوگ جھنڈ کی طرح آگئے تھے، اُس کے لیے یک دم آگے بڑھنا ناممکن ہوا تھا۔ یہی ناممکن اگلے لمحے علی کو کھونے کے ذریعے اُس کی آنکھوں میں پانی بھر لایا تھا۔

☆.....☆.....☆

دسمبر کا مہینہ اپنے جو بن پر تھا، ہوا میں چھائی خشکی سردی کو بڑھانے میں محسوس ہو رہی تھی، دھوپ کی شدت میں کم اثر معلوم ہو رہی تھی۔ مہروش اپنے گرد شمال لپیٹے لان کے بیچوں بیچ کرسی سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے پڑ سوچ انداز میں بیٹھی تھی، دل کی ہر دھڑکن پر دھند چھائے جا رہی تھی، گزشتہ عرصے میں دیکھے ہر سنے خوشگوار احساس پر دھیرے دھیرے برف جمتی جا رہی تھی، بہت سوچنے کے بعد وہ ایک نقطے پر پہنچی تھی۔

زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر لوٹ آئی تھی، دعوتوں وغیرہ کے سلسلے اختتام کو پہنچے، مراوج آفس جانا اور شام 4 بجے کے بعد گھر واپس آ جانا، مہروش نے مہندی کا رنگ اُترتے ہی گھر کے کاموں میں پہلے پھپھو کا ہاتھ بنانا شروع کیا پھر مراد کے تمام کام اپنے ذمے لیے، کچن کے کاموں سے لے کر گھر کی صفائی اور کپڑے دھونے اور استری کرنے تک کے کام پھپھو کے منع کرنے کے باوجود خود کرنے شروع کیے، بلکہ اپنی مصروفیت کا شاندار بہانہ ڈھونڈا، فارغ رہ کر وہ نہ تو مراد کو سوچنا چاہتی تھی نہ اپنی بے بسی کا رونا، رونا چاہتی تھی، جو گزر گیا وہ بس گزر گیا تھا، اب وہ مراد کی چال کو مکمل آزادی دے کر اپنا مزید مذاق نہیں اڑانا چاہ رہی تھی، مراد کا کھل کر مقابلہ اُس کے بس کی بات نہ تھی، نہ وہ ایسی کوئی بے وقوفی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، بند کمرے میں خاموش رہنا بھی بے سود تھا، مراد منصور کو متواتر سننا اور برداشت کرنا اُس کے اعصاب پر بھاری گزرتا، اُس نے کم از کم کمرے کی حدود کے اندر اُلٹا سیدھا جیسا بھی سکی بس اب مراد کو جواب دینا تھا، مراد کے اندر چھپے غصے کی انتہا وہ دیکھنا چاہتی تھی، اُسی کی زبان سے اُس کے کیے کا اعتراف کروانا چاہتی تھی، کلثوم پھپھو کی نظر میں اُسے اُسی کے ہاتھوں لانا چاہتی

تھی، اپنی بے بسی دبانے کے لیے سب کے سامنے خوشی و انبساط کا لبادہ اوڑھ کر مراد کی نام نہاد اعلیٰ ظرفی کا مجید کھولنا تھا اُس نے اب۔ اپنی زندگی کے رنگ پھیلنے کے لیے دل و دماغ اُسے بہت اجنبی، بہت پرایا لگنے لگا تھا۔ مراد سے اپنی دلی وابستگی اُسے دم توڑتی محسوس ہوتی تھی، وہ تمام حساسیات جو وہ شروع سے اس رشتے کو نبھانے کے لیے سنبھالے رکھے تھی، وہ اس بے حس، مطلبی، دھوکے باز شخص کی وجہ سے لا پرواہی میں بدل گئی تھیں، وہ فیصلہ کرنا چاہتی تھی، مراد کے بے درپے وار سپہ کردہ شاید ساری زندگی کا ارادہ ہر گز بھی نہیں رکھتی تھی، امانت میں خیانت وہ چاہتی نہیں تھی، مگر اُس کی امانت میں سو جن چاہتوں کے سمندر کی قدر اور احساس مراد منصور کو نہیں تھا، پھر وہ کیوں سستی ساو تری بنتی؟ چپ چاپ رہ کر وہ مزید اپنی تضحیک نہیں کروا سکتی تھی۔

”مہروش بیٹا! یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ ہوا چل رہی ہے، بیمار ہو جاؤ گی، اٹھو شاہا! اندر آ جاؤ۔“ خیالوں، سوچوں کی دنیا سے اُسے پھپھو کی آواز باہر لائی تو اُس نے آنکھیں دا کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، وہ واپس چلی گئیں، مانی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے ایک نگاہ آسمان پر ڈالی، جہاں ہوا کے ساتھ ساتھ بادل بھی جمع ہو گئے تھے، بارش کا امکان بھی تھا، وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں چلی آئی اور ایک مرتبہ پھر فرصت سے سوچنے لگی۔

”میرا انتقام آپ کی طرح بھانک تو نہیں ہوگا مراد منصور! لیکن میں اپنی معمولی سی کوشش سے آپ سے بدلہ لوں گی، میں اب ہر وہ عمل و فعل کروں گی جو آپ کی طبیعت پر گراں گزرے، جو آپ کو پسند نہیں، جس سے آپ کو غصہ آئے۔“ اس کی نگاہیں دیوار پر آویزاں مراد کی قد آدم تصویر پر جمی تھیں۔

”آپ وقت کے بہت پابند ہیں، کام میں آپ کوتاہی برداشت نہیں کرتے، آپ ہمیشہ ہر وقت سوئڈ بونڈ رہنا چاہتے ہیں ناں، مگر اب نہیں، میں آپ کو وقت کی پابندی بھلا دوں گی، آپ کے کام خود بخود بگڑیں گے۔“ اپنی سوچ میں اُس نے پوائنٹس (Points) ترتیب دینے شروع کیے۔

”آپ صفائی پسند بھی بہت ہیں، ہر چیز آپ کو جگہ پر اور ترتیب سے چاہئے ہوتی ہے، مگر آج کے بعد سب کچھ آپ کو بے ترتیب نظر آئے گا، یہ کمرہ گندہ ملے گا، اُسی طرح جس طرح آپ کی سوچ گندی ہے۔“ سنجیدگی سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

”آپ کی موسٹ فیورٹ چائے، جو آپ کی روٹین میں ایک ضرورت ہے، چائے آفس کی ساری تھکن اُتار دیتی ہے، یہی کہنا ہے ناں آپ کا؟ مگر اب آپ اعتراف کریں گے کہ چائے آپ کی تھکن مزید بڑھاتی ہے، میں چائے کو اُسی طرح آپ کے لیے عذاب کر دوں گی، جس طرح آپ نے میری زندگی کو اپنی ذات کی بدترین پر چھائی سے کیا ہے۔“ وہ مراد منصور کے وار سے اندر تک گھائل تھی، زخمی لہجے میں سوچتے وہ کھڑکی کے پاس آئی اور کھڑکی کے ہٹ وا کر کے باہر دیکھنے لگی، ہوا کے خوشگوار جھونکے تسلسل سے اُس کے چہرے سے ٹکراتے ہوئے بکھرنے لگے۔

”وقار بھائی سے نفرت ہے ناں آپ کو؟ تو اُسی نفرت کو سب کے سامنے لانے کے لیے میں بار بار وقار بھائی کو آپ کے سامنے کھڑا کروں گی، وقار بھائی کے ذریعے ہر موڑ پر آپ کی اعلیٰ ظرفی کا امتحان لوں گی۔“ اس کی سوچ میں قطعیت تھی اور سوچنے کا انداز دو ٹوک تھا، اس کا دل مراد نے مردہ کیا تھا، اور اب وہی مردہ دل مراد کے لیے کٹھور بنا تھا۔

”اور میں.....!“ وہ توقف کے لیے رُکی۔

”مجھ سے جو اُمید آپ نے لگا رکھی ہے، میں آپ کی وہ اُمید خاک میں ملا دوں گی۔“ وہ نخوت سے بڑبڑائی۔

(جاری ہے)

سحرانجم

افسانہ

ملاقات کے نہیں تھے تالیاں نہیں تھے

جن سے مل کر زندگی ہی عشق ہو جائے وہ لوگ آپ جسے لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہے ہیں دل رو رہا ہے اور لب مسکرا رہے ہیں یہ کہانی نہیں ہے یہ کوئی قصہ بھی نہیں



بھالی محصوم لڑکی جو ماں باپ کے ذل کا سکون دادا دادی نانا نانی چچا ماسوں کوں تھا جو اسے دل کی گہرائیوں سے پیار نہ کرتا ہوا اور خالہ اس کی تو جان ہی اس میں تھی۔

”لکھ رہی ہوں جو وہ کاتب تقدیر نے بھی لکھا ہو تیری زندگی کا ہر دکھ میری زندگی کا حصہ ہو“ یہ وہ شعر تھا جو اس کے کالج لائف کے پہلے سال کی کامیابی پر انہوں نے کہا تھا اور ثانیہ بھی تو ہر رشتے کا دل سے احترام کرتی تھی ہر ایک سے مسکرا کر ملتی ہر ایک کی خوشی میں خوش رہتی بھائی بہنوں پر جان نچھاور کرتی ہر کزن کو اپنے بہن بھائیوں کی طرح پیار کرتی اس لئے

ہے یہ تو صرف ایک سچائی ہے ایک سچ اور حق ہے ایک ایسا سچ جو انسانی فطرت کا آئینہ دار ہے اور ایک ایسی حق بات جس کا اختیار خود اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے جس کا استعمال مرد کرتا ہے اور پل صراط کے اس راستے پر چلنا عورت کو پڑتا ہے۔ جی ہاں آپ صحیح سمجھے دوسری شادی جو کرتا تو مرد ہے لیکن عورت کو مظلومیت کا اشتہار بنا دیتا ہے یہ احساس دے کر کہ وہ اس پر ایک سوتن لے آیا ہے اور یہ دکھ عورت کو زندگی سے بے زار کرنے کے لئے کافی ہے۔

ثانیہ کی شادی بھی کیا شاندار شادی تھی ثانیہ بھولی



تو وہ سب کی ثانیہ آتی تھی پھر ثانیہ کی شادی معمولی کیسے ہو سکتی تھی ہر چھوٹا بڑا اپنے ہاتھوں میں خوشیوں کے پھول لئے اس کی خوشیوں میں شریک تھا اور سب کے مسکراتے چہرے دیکھ کر ایک شرمیلی مسکراہٹ اس کے چہرے پر جگمگا رہی تھی اور تقدیر؟

تقدیر شاید اس کی مصیبت پر مسکرا رہی تھی کہتے ہیں ناں کہ ماں باپ بیٹی کو سب کچھ دے سکتے ہیں سوائے نصیب کے اور نصیب میں سکھ ہوں یا دکھ انسان کو اٹھانا ہی پڑتے ہیں۔

ثانیہ بھی اس محبت بھری چھاؤں سے رخصت ہوتے ہوئے نہیں جانتی تھی کہ زندگی کے کس پر فریب راستوں پر قدم رکھ رہی ہے وہ تو ساس کو ماں مندوں اور دیوروں کو بہن بھائی اور شوہر کو مجازی خدا مان کر اپنی جنت کو ستوارنے کے لئے چاہتوں بھرپور سے سبک قدم اٹھاتی اپنی خوابوں کی جنت میں داخل ہوئی تھی۔

”بہو تو بڑی پیاری ہے۔“ جو بھی اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھتا بے اختیار کہہ اٹھتا۔

”ہاں تو پیاری کیوں نہ ہوگی آخر کو ہمارے خاندان کی لڑکی ہے۔“ ساس فخر سے مسکرا کر کہتی۔

”ہاں بھائی خاندان کی لڑکی کی تو بات ہی الگ ہے۔“ لوگ ہاں میں ہاں ملاتے۔

”اے بہنو! خاندان کا فخر بن کر آئی ہو تو خاندان کو بھانا بھی سیکھ لو یہ نندیں نہیں تمہاری بہنیں ہیں ان کی خوشیوں کا خیال اب تمہیں ہی رکھنا ہے۔“

”جی اماں! آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گی۔“ ثانیہ نے سر جھکا کر جواب دیا۔

”ارے اب پہلے جیسا ماحول کہاں رہا ہم تو جب بیاہ کر آئے تھے تو اپنا چھوٹا منوٹا زیور یونہی مندوں کو خوش کرنے کے لئے دے دیا تھا۔“ کوئی اور ہوتا تو پوچھتا بڑا زیور تھا ہی کیا آپ کے پاس چھوٹا منوٹا ہی بڑی مشکلوں سے دیا گیا تھا ہمیں سب پتا ہے مگر یہ تو ثانیہ تھی جس کی

نظروں میں رشتوں کی قیمت ان گہنوں سے کہیں زیادہ تھی وہ گئی اور چپ چاپ اپنی انگوٹھی لاکٹ اور بالیاں لے کر آئی اور مندوں میں بانٹ دیں۔

”ہائے بھابی! یہ کتنا اچھا جوڑا ہے۔“ چھوٹی نند نے اس کا پسندیدہ سوٹ اس کے سوٹ ٹیکس سے نکالتے ہوئے کہا۔

”ارے بھئی تو لے لو آخر کو مندوں کا بھی کوئی حق ہوتا ہے ہمارے خاندان کی تو یہ رسم ہے بھابی جب سوٹ کیس کھولتی ہے تو ایک ایک جوڑا سب مندوں کو دیا جاتا ہے۔“ ساس نے فخر سے خاندانی رسم بتاتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں باجی، معنی گڑیا تم لوگوں کو جو بھی سوٹ پسند ہو لے لو۔“ ثانیہ نے مسکرا کر کہا۔ اور سب مندوں نے اچھے اچھے جوڑے اٹھائے وہ نندیں جو ثانیہ کے ساتھ تھیں اور ثانیہ سے بڑی بھی تھیں ثانیہ کی بیٹی بن گئیں اور ثانیہ ایک شفیق ماں کی طرح ان کی خدمت میں مصروف ہو گئی بقول ساس کے۔

”خاندانی لڑکی کی یہی پہچان ہے کہ جس گھر میں آئے اسی گھر کی ہو کے رہے۔“ اور ثانیہ بھی اپنے گھر کے عیش و آرام اپنے لوگوں کی محبتیں بھول کر صرف ان لوگوں کی خدمت میں مصروف ہو گئی جنہیں اس نے اپنا بنایا تھا جس کے گھر ماسی کپڑے دھوئی استری کرتی تھی وہی صفائی کرتی برتن دھوئی آج ایک گھر کو اپنا گھر بنانے کے لئے تن من دھن سے صبح سے رات تک مصروف رہتی۔

”ارے اماں! آج تو بہت ہی تھک گیا۔“ جمال نے اسکوڑکی چابی ڈرینک ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ارے بیٹا! آخر گیا کہاں تھا۔؟“ اماں نے جمال کا سر اپنے گھٹنے پر رکھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”کہاں کہاں خاک چھانتا پھرتا ہے میرا لال

دیکھو تو کیسا کمزور ہو رہا ہے ارے ثانیہ میاں سارا دن کا تھکا ماندہ آیا ہے کچھ چائے پانی کا بھی پوچھ لیا کرو بس ہر وقت اپنے سولہ نگہار میں مست نہ رہا کرو۔“ ثانیہ کو کنگھا کرتے ہوئے دیکھ کر اماں نے جل کر کہا۔

”جی اماں! ابھی لائی۔“ ثانیہ نے جلدی سے اپنے ہاتھ دھو کر چائے کا پانی چڑھایا۔

”ارے بیٹا! کیوں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا ہے رنگ تو دیکھو کیسا جھلس گیا ہے۔“ اماں نے بیٹے پر واری صدقے ہوتے ہوئے کہا۔

”ارے اماں! اب بڑے گھر کی لڑکی لائی ہو تو اس کے خمرے اٹھانے کے لئے بھی تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ناں! ایک دوست نے ایک جاب کے بارے میں کہا تھا اس کا پتا کرنے گیا تھا۔“ جمال نے پانی کا گلاس رکھتے ہوئے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ارے کا ہے کی امیر ہے چند جوڑے کپڑے اور چند برتن لانے سے کوئی امیر نہیں ہو جاتا۔“ اماں نے ثانیہ کے لاکھوں کے جہیز کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ثانیہ نے سوچا کہ بول دے۔

”میری لائی ہوئی چیزیں ہی گھر میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں ورنہ اس گھر میں تھا ہی کیا۔“ لیکن ثانیہ کے لبوں پر تو شرافت کی مہر تھی وہ کبھی کیا سکتی تھی سوائے آنسو بہانے کے۔

☆.....☆.....☆

”ارے تمہیں کیا ہوا ہے۔؟“ ثانیہ کی سوچی ہوئی آنکھیں دیکھ کر جمال نے کہا۔

”کچھ نہیں بس سر میں درد ہو رہا تھا۔“ ثانیہ نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”کوئی بات ہوئی ہوگی جب ہی تمہارے سر میں درد ہوا ہے میں ابھی اماں سے پوچھتا ہوں۔“

”نہیں نہیں پلیز آپ کچھ نہیں کہنا میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ ثانیہ نے جمال کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

”پلیز ثانیہ! تم اماں کی باتوں پر دھیان نہ دیا کرو دیکھنا میں جلد ہی تمہارے لئے ایک شاندار گھر لوں گا جہاں صرف ہم اور ہمارے بچے رہیں گے۔“ جمال نے ثانیہ کی طرف مسکراتے ہوئے کہا۔

جمال کی تھوڑی سی محبت تھوڑی سی توجہ اس کے سارے دن کی تھکن بھلا دیتی اور وہ دوسرے دن پھر ایک نئے جوش ایک نئے جذبے کے ساتھ گھر کے کام میں مصروف ہو جاتی اور جمال تو تھا ہی لفظوں کا کھلاڑی کس کو کس طرح بے وقوف بنانا ہے لفظوں کے جال میں پھانس کر دوسروں کو بے وقوف بنانا جمال کا پسندیدہ شوق تھا اماں کے پاس جاتا تو اس طرح سر جھکا کر بات کرتا کہ اماں سمجھتیں کہ سب سے زیادہ چاہنے والا وہی ہے وہ ہر دم اسے دعائیں دیتیں اور اپنا لاڈ لایٹا کہتیں بہنوں سے ملتا تو اس طرح پیش آتا جیسے ان کا مان بڑھانے کے لئے ہی دنیا میں آیا ہے بھائی جان کہتے بہنوں کا منہ سوکھ جاتا اور بیوی بیوی تو تھی ہی اس کے بہلاؤں پر زندہ ہر رات وہ ایک نئے انداز سے اپنی چاہت اس پر لوٹاتا اور ہر صبح اماں بہنوں کے سامنے اتنا معصوم بن جاتا جیسے ماں اور بہنوں کا حکم بجالاتی لڑکی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو لیکن ثانیہ کے لئے تو جمال کا ساتھ ہی بہت تھا۔

جمال کی ماں اور بہنوں کو خوش رکھنے کے لئے اس نے کیا نہیں کیا اپنی ماں بہن بھائی غرض رشتہ داروں اور ہر اس شخص کو جو اس کی خوشیوں پر جان نچھاور کرنے کے لئے تیار تھے بھلا کر صرف اور صرف جمال کی خوشی پر راضی بہ رضا رہی یہ سوچ کر کہ شوہر تو مجازی خدا ہے پھر وہ کیوں ناں اپنے مزاج کو اپنے شوہر کے مزاج کے مطابق ڈھال لے اور جب مجازی خدا کو اندازہ ہو گیا کہ ایک لڑکی اس کے لئے اپنی زندگی وارنے کے لئے بخوشی راضی ہے تو وہ بھی مجازی خدا سے نعوذ باللہ خدا بن بیٹھا اور ثانیہ اپنی مصیبت میں گم ہر دکھ قبول کرتی رہی اور جب اسے اپنی اس وفا کا صلہ قدرت نے اولاد کی

”ارے بھوہم نے بھی بچے پیدا کئے ہیں کوئی
انوکھی تم ہی بچہ جننے نہیں جا رہی ہو جو پلنگ پر چڑھ کر بیٹھ
گئیں سارا سارا دن کام کاج میں لگے رہتے تھے محال
تھی جو کوئی گلاس بھر کر پانی بھی دے دیتا یہ تو تمہاری
خوش قسمتی ہے کہ چار چار نندیں خدمت کو موجود ہیں
بھی میاں کو سرہانے بٹھا کر کہہ دیتی ہو کہ بیڈریسٹ
کو کہا ہے۔“

”نہیں، نہیں اماں! بس میں ابھی اٹھنے ہی والی تھی۔“ ثانیہ نے گہرا کرپلنگ سے اترتے ہوئے کہا۔

”اماں! کے تجربے سے سیکھو جو اماں کہہ رہی ہیں وہ ہی کرو۔“ جمال نے اماں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا، بس پھر کیا تھا ثانیہ بھی اور گھر کے کام دھندلے اور ایسے میں ہند کی شادی کا شور اٹھا۔

بیابان کے چکر میں اماں نے دین رات ایک کر دیئے
 ثانیہ کو تو سانس لینے کی فرصت نہ تھی، آرام خاک کرتی،
 بھاگ دوڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ثانیہ جو دینی عینشن اور کام کے
 بوجھ تلے دبی ہوئی تھی اپنی اولاد سے ہاتھ دھو بیٹھی وہ بچہ
 جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھا، اماں کے
 مشوروں کو ماننے کے چکر میں اس کے پاس آنے سے
 پہلے ہی اس سے دور ہو گیا۔

”آج کل کی لڑکیاں سنتی کہاں ہیں ڈاکٹروں کے
چکر میں پڑی رہتی ہیں بھی تو یہ دن دیکھنا پڑتے ہیں۔“
اماں نے اپنا قصور ثانیہ کے کھاتے میں ڈالتے ہوئے
معصوم انداز میں کہا۔

”جمال کیا ہو گیا ہے آپ کو آپ مجھ سے صحیح طرح سے بات کیوں نہیں کر رہے۔“ گھر والوں کے رویوں سے گھبرا کر ثانیہ نے جمال کے سائے میں پناہ چاہی۔

”اگر تم نے اماں کے مشوروں پر عمل کیا ہوتا تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“ جمال نے منہ پتا کر کہا۔

”چلیں اس مرتبہ معاف کر دیں اگلی مرتبہ اماں جو کہیں گی میں وہی کروں گی۔“ چانیہ نے بے قصور

ہوتے ہوئے بھی سارا قصور اپنے نام کا لیتے ہوئے کہا، جبکہ وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر کی بار بار ہدایت کے باوجود نہ وہ اپنی غذا کا دھیان رکھ پاری تھی اور نہ ہی آرام کا۔

کیونکہ بقول اماں کے نند تو بیٹی کے برابر ہوتی ہے اور بیٹی کی شادی میں ماں کو جب ہی آرام ملتا ہے جب بیٹی رخصت ہو کر اپنے گھر چلی جائے۔

”اماں! میں اب نہیں جاؤں گی ساجد کے گھر، اس کو میرا تو کوئی خیال نہیں، ہر وقت اپنے بہن بھائی کے نخرے اٹھاتے میں لگا رہتا ہے۔“ ثانیہ کی نندرشانے اٹھلا کر اماں کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

”کیا ساجد کی یہ مجال کے میز پر بیٹی کے سامنے کسی اور کو اہمیت دے کر دے آئے تو دوا سے ایسے کان کھینچیں گی کہ دماغ درست ہو جائے گا، میری ناز و پلی بیٹی ہے کوئی کاٹھ کناڑ نہیں جسے ایک طرف ڈال کر بھول جائے۔“ اماں نے رمشا کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ اور ثانیہ حیرت سے اس ماں کو دیکھ رہی تھی کہ یہ بیٹی ماں ہے جس نے بہو کو تو پہلے دن ہی یہ کہہ کر کہ اگر اپنا گھر آباد رکھنا چاہتی ہو تو کسی کے سامنے اس گھر کی کوئی برائی نہ کرنا کہ اس گھر کی عزت میں ہی تمہاری عزت ہے اس گھر کی کوئی بات گھر سے باہر گئی تو سمجھ لینا کہ تمہاری بھی کوئی جگہ اس گھر میں نہ ہوگی۔

”باہر نہ جائے گھر سے کوئی نھر کی بات
عورت کو اس وقار نے برباد کر دیا“

اور ثانیہ تو ان کی اس بات سے اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس کا کوئی بھی دکھ اس کے ماتھے پر شمع بن نہ سکا۔ لیکن وہی ماں داماد کو اپنے بہن بھائیوں سے دوہٹے بول بولنے کی بھی سزا دینے کے در پر تھی داماد بھی وہ جو

اس کا اپنا بھتیجا تھا جو اپنے ماں باپ کے دنیا سے چلے
 جانا کے بعد اپنے بہن بھائیوں کا سب سے بڑا آسرا
 تھا لیکن بد قسمتی سے اس عورت کو اپنا جیون ساتھی نہ ملا جو

اسے تو اپنا سمجھتی تھی، لیکن اس کے بہن بھائی اسے ایک آنکھ نہ بھاتے، بیوی اور ساس کو خوش رکھنے کے چکر میں وہ بہن بھائیوں سے نظر چراتا تو ضمیر کا بوجھ اسے ایک پل سکون نہ لینے دیتا، بہن بھائیوں کا اگر خیال رکھنا چاہتا تو بیوی منہ پھلا کر میکے میں جا بیٹھتی، جہاں اس کی بہمدرد ماں، بہن، بھائی سب ہی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے، روز روز کی اس لڑائی سے تنگ آ کر ایک دن اس نے رمشا کو طلاق دے دی اور رمشا اپنی بیٹی کے ساتھ مظلوم کردار بن کر دوبارہ اس گھر میں آ گئی، اور سارے گھر کے لوگ اس کی دلجوئی میں لگ گئے۔ اور پھر ثانیہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مرتبہ پھر کرم کی بارش ہوئی، جب ڈاکٹر نے ثانیہ کو ماں بننے کی خوشخبری سنائی اور اس مرتبہ ثانیہ نے ڈاکٹر کے ہر مشورے پر عمل کیا، ہر لمحہ اپنے رب سے اپنی خوشیوں کے لئے دعا مانگتی رہی اور پھر جب اللہ تعالیٰ نے ایسا کرم کیا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی، جب دو جڑواں بچے اس کی گود میں آ گئے تو بے اختیار اس کا سراپے رب کے حضور جھک گیا۔

ہر وہ شخص جو اس کے دکھوں پر رنجی تھا، آج اس کی خوش بختی پر نازاں تھا ہاں دکھ تھا تو فقط اتنا کہ وہ ساس سندس جن کی اس نے اتنی عزت کی اتنی محبت کی ان سے کہ اپنے میکے کو بھلا دیا، یہ سوچ کر کہ میرے اپنے تو اب یہی لوگ ہیں ان ساس سندوں نے یہ کہہ کر اپنے گھر سے نکال دیا کہ ہمارے بیٹے کو ہم سے الگ کر دیا ہے، تم نے کیونکہ بیٹا اب ماں بہنوں کے ساتھ ساتھ بیوی کو بھی تھوڑی سی توجہ دینے لگا تھا، جو اس کے بچوں کی ماں بننے والی تھی اور ثانیہ تو تھی ہی جمال کی بیوانی، اس کی توجہ پا کر تو وہ خود کو بھی بھول گئی، پھر بچوں کی ذمہ داری اور جمال کی ناز برداریاں کرتے کرتے چانک اسے احساس ہوا کہ آج کل جمال کچھ زیادہ ہی ذی رہنے لگا ہے۔

”جمال! آج آپ پھر دیر سے آئے“ آپ کو معلوم
ہے گھر کے کام کے علاوہ مجھے بچوں کو بھی دیکھنا

پڑتا ہے آج پھر حنا جھولے سے گر گئی۔ ثانیہ نے جمال سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو میں کیا کروں کیا سب کام دھندے چھوڑ کر
میں گھر میں بیٹھ جاؤں.....؟“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا، لیکن کیا بچوں کی ذمہ داری صرف میری ہے، آپ کا کوئی فرض نہیں بنتا ہے۔“

”دماغ خراب کر دیا تم نے میرا اس گھر میں آنا ہی فضول ہے۔“ جمال نے ایک ہاتھ سے ثانیہ کو دھکا دیا، بچوں کی واکر کو ایک لات ماری اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا، یہ بھی نہیں دیکھا کہ بیڈ کا کونا لگنے سے ثانیہ کے اچھے سے خون نکل آیا ہے۔

”کیا ہو گیا ہے جمال! تمہیں ایسی مجھ سے کیا خطا لگ گئی ہے جو تم مجھ سے یوں دور دور رہنے لگے ہو میں نے تو کبھی تمہاری کسی بات سے نافرمانی نہیں کی، جب سب تم نے کہا میں نے تمہاری ماں اور بہنوں کی ہر طرح سے خدمت کی، تمہاری اور تمہارے بچوں کی دیکھ بھال میں نے اپنی ذات کو فراموش کر دیا اب ایسا کیا کروں جو تمہاری خوشی کا باعث بن سکے۔“ ثانیہ نے سر دسے بے حال ہو کر اپنا سر تکیے پر رکھا۔

جمال کے لئے ثانیہ اس کی پسند کا کھانا پکانے کے
جلدی جلدی خود بھی تیار ہوئی، اور بچوں کو بھی تیار کیا
جمال کا انتظار کرنے لگی، وہ جانتی تھی کہ جب غصہ ختم
کا تو جمال کو بچوں کی یاد ستائے گی، 11 بجے سے
بچے تک وہ فون کر کر کے جمال کو مناتی رہی، تب کہیں
بچے کے قریب گاڑی کا ہارن سنائی دیا، بچے تھک کر
گئے تھے لیکن جمال کی محبت نے ثانیہ کی نیندیں اڑا
لیں۔

”آپ جلدی سے فریش ہو جائیں میں نے آپ پسند کا کھانا بنایا ہے۔“ ثانیہ نے مسکرا کر کہا۔

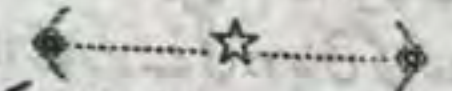
”ٹھیک ہے نکالو کھانا میں ابھی آرہا ہوں منہ دھو
جمال نے منہ بنا کر کہا۔ ثانیہ نے جلدی جلدی

کھانا گرم کر کے ٹیبل پر رکھا اور اس کا انتظار کرنے لگی۔
”تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا کیا؟“
جمال نے بروسٹ کا پیس اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے
کہا۔

”میں بھلا آپ کے بغیر ایک نوالہ بھی اپنے حلق
سے اتار سکتی ہوں۔“ ثانیہ نے پیار سے جمال کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔
”کھانا تو بہت خریدار تھا اب اگر گرین فی بنا
لاؤ۔“ جمال نے اپنے کمرے کی طرف جاتے
ہوئے کہا۔

”جمال! بس آپ اسی طرح خوش رہا کریں۔“
چائے کی پیالی جمال کو تھماتے ہوئے ثانیہ نے کہا۔
”تم میری خوشی کے لئے کیا کر سکتی ہو؟“
جمال نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
”ارے ہم تو جان بھی دے دیں آپ کہہ کر تو
دیکھیں۔“

”ہوں..... یاد رکھنا اپنی اس بات کو۔“ جمال نے
مسکرا کر کہا۔
”آپ کی خاطر تو ہم ہر آزمائش سے گزر جائیں
گے۔“ ثانیہ نے اپنا سر جمال کے کندھے پر ٹکاتے
ہوئے کہا۔



”کیا بات ہے آپ اتنا پریشان کیوں رہتے
ہیں؟“ ثانیہ نے جمال کو سوچوں میں گم صوفے پر
آنکھیں بند کر کے بیٹھے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔
”ہزار پریشانیاں ہوتی ہیں کام و خندوں کی اب کیا
بندہ دو منٹ گھر میں سکون سے بیٹھ بھی نہیں
سکتا۔“ جمال نے جڑ کر کہا۔
”نہیں نہیں میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی۔“ ثانیہ نے
گھبرا کر کہا۔

”اچھا سنو! مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے کیا تم
اپنے بھائی سے لا سکتی ہو؟“ جمال نے کہا۔

”کتنے پیسے؟“

”تمہارے پاپا کی جائیداد میں تمہارا بھی تو کچھ
حصہ ہے۔“

”ٹھیک ہے میں کل جاؤں گی بھائی کے پاس آپ
پریشان نہ ہوں۔“ ثانیہ نے کہا۔

اور پھر تو یہ سلسلہ ہی چل نکلا جب بھی جمال کو
ضرورت ہوتی پیسوں کی وہ ثانیہ کو میکے چھوڑ آتا اور ثانیہ
کے میکے والے اس کی خوشی کے لئے اس کی ضرورتوں کو
پورا کرتے رہتے تھے اور جمال کی خوشی ثانیہ کی زندگی کا
حاصل تھی۔

جب ثانیہ اپنے گھر سے پیسے لاتی تو چند دن بہت
سکون سے گزرتے جمال ثانیہ کی نازیداریاں کرتا
بچوں کے لئے خوب شاپنگ کرتا اور ثانیہ خوش ہو جاتی
کہ جمال کو اس کا کتنا خیال ہے اور پیسے تم ہوتے ہی
جمال کا رویہ ایسا بدلتا جیسے پہنچتا بھی نہ ہو روز روز
پیسوں کی ڈیمانڈ سن کر اس کے بھائی اور بھالی بھی
اس سے بےزار رہنے لگتے تھے مگر وہ بھی کیا کرتی وہ یہ
سب اپنے لئے نہیں جمال کی خوشی کے لئے کر رہی تھی۔

ثانیہ تو وہ تھی جو جمال کی عزت بڑھانے کے لئے
اپنے ہر دکھ کو اپنے من میں اتار کر اور اپنے ہوتوں پر فنی
سجا کر اپنے میکے سے ملی کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی
ساس تندوں کا اس کے ساتھ کیا رویہ ہے ایک ہی
خاندان ہونے کی وجہ سے سب ہی اس کی ساس
اور تندوں کی عادت کو پہنچاتے تھے مگر ثانیہ ان لوگوں کی
اتنی تعریف کرتی کہ لوگ مجبوراً انہیں اچھا سمجھنے لگے کہ
میکے کا ہر فرد تو اس کو خوش دیکھنا چاہتا تھا لیکن یہ تو کسی
کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جمال جس نے اپنے
بہن بھائیوں کی خوشی کے لئے ثانیہ کو ان کا غلام بنا کر
رکھا تھا آج اپنی خوشی کے لئے ان سب کو برا بھلا کہہ کر
سب سے الگ کر کے اپنی کس خواہش کی تکمیل کرنا چاہتا
ہے ثانیہ تو اس بات پر خوش تھی کہ آخر اس کے شوہر کو اس
کی محبت اور خدمت کا احساس ہو ہی گیا جب ہی تو اس

نے ثانیہ کے لئے ایک علیحدہ گھر کا انتظام کر دیا جس
میں وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آرام سے زندگی
گزارے گی مگر۔۔۔؟

”کیا بات ہے جمال! آپ ہر وقت کسی سوچ میں
گم رہتے ہیں اب ایسی کون سی پریشانی ہے جس کی وجہ
سے آپ کا دل نہ خیر میں لگتا ہے نہ آپ بچوں پر توجہ
دیتے ہیں مجھ سے کہیں شاید میں کوئی حل نکال سکوں۔“
ثانیہ نے چائے کا کپ جمال کو دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں ثانیہ! بس پریشانی کا حل صرف
تمہارے ہی پاس ہے مگر ڈرتا ہوں کہ تمہیں بات
ناگوار نہ گزرے۔“ جمال نے مکاری سے مسکراتے
ہوئے کہا۔

”ارے تو کہیں ناں ہم تو جان دینے والوں میں
سے ہیں آپ کہہ کر تو دیکھیں۔“ ثانیہ نے مسکرا کر کہا۔
”سوچ لو یہ جان کا نہیں روح کا سودا ہے۔“ جمال
نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں ہاں آپ کہیں تو پھیلیاں کیوں بھجوا رہے
ہیں۔“ ثانیہ نے حیران نظروں سے جمال کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو سنو! وہ جو میرے آفس میں ایک لڑکی کام
کرتی تھی ناں بشری۔“ جمال نے ایک لمحے کے
لئے ثانیہ کی طرف دیکھا۔

”ثانیہ! وہ میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے میں
اس کے بغیر نہیں رہ سکتا پلیز پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش
کرؤ میں تمہارا اور بچوں کا پورا خیال رکھوں گا۔“ جمال
نے ثانیہ کے ہاتھ کو تھام کر کہا۔

لیکن ثانیہ اس قابل کہاں تھی کہ جمال کی باتوں کو
سن سکے سمجھ سکے وہ تو حیران نظروں سے جمال کی
طرف دیکھ رہی تھی قیامت دنیا پر نہ کسی لیکن اس کے دل
پر گزری جی تھی وہ کتنی بھی اس سے تو کیا۔۔۔؟ یہ امتحان
اُس کے طرف سے بھی بڑا تھا۔

”پلیز میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو مجھے

کام سے جانا ہے رات میں آؤں گا۔“ جمال نے ثانیہ
کے ہاتھوں کو چھکی دیتے ہوئے کہا مگر وہ تو ایسے دیکھ رہی
تھی جیسے اسے پہچانتی ہی نہ ہو اس کی زبان خاموش تھی
بس آنسو بھری آنکھوں سے اس نے ایک نظر جمال کی
طرف دیکھا اور سر کو جھکا لیا۔

”کیا میری محبت میری وفا میں کوئی اثر نہ تھا۔“ اس
کا دل جھپکے سے رو پڑا۔

”نہیں، نہیں میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی میں
جمال کو رو دوں گی۔ بھلا وہ مجھے چھوڑ کر دوسری لڑکی کو
کیسے اپنا سکتا ہے! کیوں ثانیہ! کیوں کیا تم بھول گئیں کہ
جمال صرف تمہارا شوہر نہیں ایک مرد بھی ہے اور مرد کی
فطرت کو اس کا رب خوب جانتا تھا اس لئے تو اس نے
بھی مرد کو ایک ساتھ چار بیویوں کو رکھنے کی اجازت دی
ہے۔“ مگر اس نے تو کبھی جمال کے بارے میں کسی سے
بھی کچھ کہا ہی نہ تھا پھر وہ آج اپنی زبان کیسے کھولتی۔

زندگی کے اس کڑے امتحان میں وہ حیران پریشان
اپنے بچوں کو گود میں لئے ہوئے گئے دنوں کے بارے
میں سوچ رہی تھی۔

”ہاں ثانیہ! ہاں آج تقدیر تمہیں اس موڑ پر لے
آئی ہے جب تمہیں اپنے دل کو اپنے ہی قدموں تلے
روند کر جمال کے خوابوں کے مگر کو آباد کرنا ہے تم نے
تو ہر پل ہر قدم جمال کا ساتھ دیا ہے تو کیا آج اس
امتحان میں پوری نہ اترو گی اور جب جمال کا دل ہی
تمہارے سوا کسی اور کی خواہش کر بیٹھا ہے تو کیا تمہاری
محبت اس کی خوشی کی راہ میں دیوار بنے گی یہی ہے
تمہاری محبت۔ ہوں..... تو جمال تم نے کہا ہے ناں کہ
میں کیا تمہاری خوشی کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتی۔

تو اب تم دیکھنا کہ میں تمہاری خوشی کے لئے
کیا کرتی ہوں۔۔۔؟“

”ہمیں کہیں نہ کہیں تو پچھڑ ہی جانا تھا
یہ حادثہ بھی میری زندگی میں آنا تھا
وہ ایک شخص مجھے ساری عمر ترسے گا

سحرانجم کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی غزل

دریچوں سے جھانکتی وہ لڑکی
عجب دکھوں سے بھری ہوئی ہے
کہ اُس کے آنگن میں پھولوں پر
ایک نیلی مٹی مری ہوئی ہے
کبھی اذانوں میں کھوئی کھوئی
کبھی نمازوں میں روئی روئی
وہ ایسے دنیا کو دیکھتی ہے
جیسے اُس سے ڈری ہوئی ہے
دور دور سے مہکی مہکی سانس
وظائف پڑھتی ہوئی وہ آنکھیں
کہ ایک شام اُمید اُس میں
کئی برس سے رُکی ہوئی ہے
وہ دکھوں کی چادر میں لپیٹی لپیٹی
وہ کالے کپڑوں میں سمٹی سمٹی
محبت اُس نے شاید
میری طرح کی ہوئی ہے

افشاں علی کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم

”شرط“

تعلق توڑنا چاہے
جو تُو مجھ کو چھوڑنا چاہے
تو میری شرط اتنی سی ہے
تمہیں جو دے چکی ہوں میں
مجھے لوٹا دو وہ سب کچھ

میرے نغمے وہ چاہت کے
وہ سب تجھے محبت کے
وہ بھری ڈائری میری
وہ ساری شاعری میری
کبھی وہ پھول اور پتیاں
وہ میٹھی پیار کی ریتیاں
کہو لوٹا سکو گے تم؟؟
میرے وہ قیمتی لمحے
جو تجھ کو سوچتے گزرے
وہ پل جو اک قیامت تھے
جو تیرا رستہ دیکھتے گزرے
خدا کو بھول کر وہ دن
جو تجھ کو بوجھتے گزرے
کہو لوٹا سکو گے تم؟؟
حیا کی چاندنی دے دی
جیا کی راگنی دے دی
لبوں کی چاشنی دے دی
حناء کی روشنی دے دی
تجھے تو زندگی دے دی
تو پھر وہ زندگی میری
کہو لوٹا سکو گے تم؟؟
جو اگر ممکن ہو ایسا تو
تعلق توڑ لینا تم
بس میری شرط اتنی سی ہے.....!!

عانیہ نیازی کی ڈائری سے

ناصر کاظمی کی غزل

ترے آنے کا دھوکا سا رہا ہے

والے جمال کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ اس نے
سارے خاندان کے سامنے انہیں رسوا کیا، وہ تو اس
سارے کھیل کا ذمہ دار ثانیہ کو ٹھہرا رہے تھے کہ جس نے
اجازت دے کر جمال کو اس راہ پر چلنے پر مجبور کیا اور
ثانیہ سب لوگوں کی باتیں مسکرا کر سنتی رہی تھی کیونکہ اس
نے اپنے رب کے حکم کو مانا تھا، اپنے شوہر کی خوشی کو
مقدم جانا تھا اور پھر جب ایک عورت سے اس کے
شوہر کی خوشی وابستہ تھی، تو وہ اس کی راہ میں دیوار کیوں
بنتی، اس نے تو ہر قدم پر اپنے شوہر کا ساتھ دینے کا وعدہ
کیا پھر بھلا وہ اپنے وعدے سے کیسے مکر تی چاہے اس
وعدے کو پورا کرنے کے لئے اس کو سولی پر ہی کیوں نہ
لٹکنا پڑے۔

کیسے چپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں
جسم کی ٹھنڈی سی

تاریک سیاہ قبر کے اندر
نہ کسی سانس کی آواز نہ سسکی کوئی
نہ کوئی آہ نہ جنبش نہ ہی آہٹ کوئی

ایسے چپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں
ان کو دفنانے کی زحمت بھی اٹھانا نہیں پڑتی
آج اس سے پیار کرنے والی ہر آنکھ اشکبار تھی مگر
ثانیہ مسکرا رہی تھی اس کی خالہ جو اس کی دوست بھی تھی
ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ جمال کے سونگڑے
کردیتیں اور ثانیہ کے بھی ہاتھ اور پیر کاٹ کر کے وہ
جمال کے ان ٹکڑوں سے بھی دور رہ سکے، مگر وہ جانتی
تھیں کہ ثانیہ پھر بھی جمال کے پاس جائے گی اور اپنی
روح اس میں ڈال کر اسے زندہ کر دے گی اور
خود مر جائے گی، پھر بھلا وہ جمال کے لئے کوئی بدو عا بھی
کیسے کرتیں کہ جمال کے نصیب میں تو ثانیہ تھی جو اس کی
ہر بدو عا کی راہ میں دعا بن کر کھڑی تھی اور وہ اپنی ثانیہ
کے لئے صرف دعا ہی تو کر سکتی تھیں کہ اس کو دعا دینے
کے لئے ہی تو وہ زندہ تھیں۔

نصیب اس کے کہ اس نے مجھے گوانا تھا
”جمال! کب چلنا ہے بشری کے گھر.....؟“
ثانیہ نے کھانے کی ٹیبل پر جمال کو کھانا پیش کرتے
ہوئے کہا۔

”کیا ثانیہ! تم نے مجھے بشری سے شادی کی
اجازت دے دی ہے؟“ جمال نے حیرت سے ثانیہ کی
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں اس میں حیران ہونے کی کیا ضرورت
ہے میں خود چلوں گی تمہارے ساتھ بشری کی ماں سے
بات کرنے کے لئے۔“

”نہیں..... میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس طرح ہو
سکتا ہے۔“ جمال نے پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھا۔

”ارے..... ہو کیا نہیں سکتا“ جب ایک بات کا حق
آپ کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے آپ اس کے قابل ہیں کہ
دونوں بیویوں کو سپورٹ کر سکتے ہیں تو پھر میں آپ کی
خوشی میں دیوار کس طرح بن سکتی ہوں.....؟“ ثانیہ نے
مسکرا کر کہا۔

”ثانیہ! تم نے آج ثابت کر دیا کہ محبت کرنے
والی بیوی اللہ کی دی ہوئی ایک نعمت ہے دیکھنا تمہیں مجھ
سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی۔“ جمال نے ثانیہ کے
ہاتھ تھام کر کہا۔

”اچھا“ اچھا مجھے چھوڑیں اور جا کر بشری کو یہ
خوشخبری سنائیں۔“ ثانیہ نے مسکرا کر کہا۔
”بھینکس۔“ جمال نے ثانیہ کی طرف مسکرا کر
دیکھتے ہوئے کہا۔

اور پھر ثانیہ نے نہ صرف بشری کی ماں اور بھائیوں
کو اس رشتے کے لئے راضی کیا، بلکہ بشری کو اپنے
ہاتھوں سے تیار کر کے جمال کی دلہن بنا کر اپنی خوشی اپنے
ہی گھر میں لے کر آگئی اور اس کے ہنستے ہوئے چہرے
کے پیچھے چھپے ہوئے دکھ کو کوئی نہ پہچان سکا۔

لوگ حیرت سے اس وفا کی دیوی کو دیکھ رہے تھے
جس نے محبت کی ایک نئی مثال قائم کی تھی جمال کے گھر

اشعار

عاشیہ نیازی..... ربوہ
کتنی دلکش ہے اس کی خاموشی
ساری باتیں فضول ہوں جیسے
نوربانو..... کوئٹہ
بارشوں کے اداس موسم میں
خود کو دیکھوں تو یاد آئے کوئی
کاش اک بار یوں بھی ہو جائے
میں پکاروں تو لوٹ آئے کوئی
مباحر..... ہارون آباد
کھو جاتی ہواؤں میں تیری آخری تحریر
دل کو تیرے اقرار پہ ایمان تو رہتا
بھر ملنے کا وعدہ ہی بڑی بات ہے خاور
پھر کون ملا ہے مگر احسان تو رہتا
بسمہ علی..... سکھر
کوئی فلسفہ نہیں عشق کا، جہاں دل جھکے وہیں سر جھکا
وہیں زانو موڑ کر بیٹھ جا، نہ کوئی سوال جواب کر
اُم فروغ..... کراچی
ہم خود ہی جدائی کا سبب تھے
اس کا ہی قصور سارا کب تھا
اب اور کے ساتھ ہے تو کیا ہوا
پہلے بھی کوئی ہمارا کب تھا
عشقی مرتضیٰ..... سیالکوٹ
ہے اختیار میں تیرے تو یہ معجزہ کردے
وہ میرا نہیں اُسے میرا کردے
ثناء حیات..... پشاور
کی سے کون پوچھے کیا ہوا ہے
جسے دیکھو وہ پھر ہو گیا ہے

وہ ہر چیز میں کسی کو ڈھونڈتا ہے
وہ پاگل سا کچھڑ کر ہو گیا ہے
دھنک ناز..... کراچی
جسے مانگا تھا میں نے ہر دُعا میں
وہ بن مانگے کسی کو مل گیا ہے
نور ملک..... کراچی
جس طرح رنج میں آنکھوں میں نمی کا ہونا
ایسا ہوتا ہے محبت میں کسی کا ہونا
تیرا سورج کے قبیلے سے تعلق تو نہیں
یہ کہاں سے تجھے آیا ہے سب ہی کا ہونا
حناعلیٰ..... ملتان
ساتھ چھوڑ کے بھی ہم سے جدا مت ہونا
وفا چاہئے آپ سے بے وفا مت ہونا
روٹھ جائے ساری دنیا ہم سے
مگر آپ ہم سے کبھی بھی خفا مت ہونا
سریرہ عابد..... کراچی
تسخیر کر رہا ہوں زمانے کی گردشیں
غم کو سکھا رہا ہوں مناجات عید کی
گم صم ہے کائنات ستارے ہیں دم بخود
دل کو سنا رہا ہوں میں کافی فرید کی
فرزانہ شوکت..... کراچی
حسن بڑھادے ذات کا وہ غم اچھا لگتا ہے
اُس کی آنکھ میں ہلکا سا غم اچھا لگتا ہے
بڑی بڑی رنجشوں کی باتیں اس کو یاد نہیں
اور ذرا ذرا سی بات پر برہم اچھا لگتا ہے

اس جرم میں تو تیری جدائی قبول ہے
تو یار ہے تو اتنی کڑی گفتگو نہ کر
تیرا اصول ہے تو میرا بھی اصول ہے
لفظوں کی آبرو کو گنواؤ نہ یوں عدیم
جو مانتا نہیں اُسے کہہ فضول سے

رابعہ منیر کی ڈائری سے

افتخار عارف کی غزل

سر بام بھر کا دیا بجھا تو خبر ہوئی
سر شام کوئی جدا ہوا تو خبر ہوئی
میرا خوش خرام بلا تیز خرام تھا
میری زندگی سے چلا گیا تو خبر ہوئی
مرے سارے حرف تمام حرف عذاب تھے
مرے کم سخن نے سخن کیا تو خبر ہوئی
کوئی بات بگڑ گئی تو پتہ چلا
میرے بے وفائے کرم کیا تو خبر ہوئی
مرے قصہ گو نے کہاں کہاں سے بڑھائی بات
مجھے داستان کا سرا ملا تو خبر ہوئی

حناعلیٰ کی ڈائری سے

ایک خوبصورت نظم

یہ ہم تسلیم کرتے ہیں
تمہیں فرصت نہیں ملتی
ہمارے واسطے تم کو
کوئی ساعت نہیں ملتی
ہماری سوچ کے محور
کبھی اک پل تو سوچو تم
تمہیں ہم یاد کرتے ہیں
اور اتنا یاد کرتے ہیں
کہ خود کو بھول جاتے ہیں

☆.....☆.....☆

دیا سا رات بھر جلتا رہا ہے
عجب ہے رات سے آنکھوں کا عالم
یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے
سنا ہے رات بھر برسا ہے بادل
مگر وہ شہر جو پیسا رہا ہے
وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا
جو پچھلی رات سے یاد آ رہا ہے
کیسے ڈھونڈو گے ان گلیوں میں ناصر
چلو اب گھر چلیں دن جا رہا ہے

شائلہ ملک کی ڈائری سے

سید و صی شاہ کی نظم

تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا
بے سبب تو نہ تھیں تیری یادیں
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا
ضبط کا حوصلہ بڑھا لینا
آنسوؤں کو چھپا لینا
کانپتی ڈولتی صداؤں کو
چپ کی چادر سے ڈھانپ کر رکھنا
بے سبب کبھی کبھی ہنستا
جب بھی ہو بات کوئی غمی کی
موضوع گفتگو بدل دینا
بے سبب تو نہیں تھیں تیری یادیں
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا

صباحی کی ڈائری سے

عدیم ہاشمی کی غزل

پھر ہے تیرے ہاتھ میں یا کوئی پھول ہے
جب تو قبول ہے تیرا سب کچھ قبول ہے
پھر ٹوٹنے دے دیا ہے نیا فاصلہ مجھے
سر پر ابھی تو پچھلی مسافت کی دھول ہے
تو دل پہ بوجھ لے کے ملاقات کو نہ آ

اس ماہ میں

اس ماہ کے اقتباس

”لیکن جب قدرت چاہتی ہے سارے دروازے ہوجاتے ہیں سلسلے ملتے جاتے ہیں اور جب مقدر میں جدائیاں لکھ دی جائیں تو ساری تدابیر ہر طرف کے در بند ہوجاتے ہیں خواہ وہ کوئی ہو، زندگی کے لمحات صرف کاتب تقدیر کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور وہ لکھا ہوا وہی لمحہ ہوتا ہے جب خداوند کسی بھی کام کے ہوجانے کا ارشاد فرماتے ہیں، لمحہ بشریت ٹوٹ کر بکھر جانے یا ٹوٹ کر جڑ جانے کے عمل کو بھی ہم اسی کی رضا سے جانتے ہیں ورنہ خاک ہو کر واپس اپنے ہی لبادے میں اٹھ کر روز قیامت کا تصور ہوتا اور ہم حیوانات کی سی صفت عریاں ہوتے لیکن نہیں! انسان ہی کو اس نے اشرف المخلوقات بنایا، ہم کتنا بھی اس کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش کریں لیکن.....! یارب! یہ کیا ظلم ہے اور اک وہمیاں دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جاسکے ہماری عقل اور فہم کو اس وقت تک تالا لگا ہوتا ہے جب تک اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں۔“

”بچی کلیاں“ سے اقتباس، صالحہ محمود انتخاب: عانیہ نیازی..... ربوہ

خاموشی

”یہ راز عجیب راز ہے، انسان کی شدہ رگ سے زیادہ قریب ہے، راز کی تلاش کسی بیرونی سفر کا نام نہیں، یہ راز اندر کا سفر ہے، انسان کے اندر سے یہ راز ملتا ہے، اور خاموشی میں ملتا ہے اور ملنے کے بعد خاموشی کر دیتا ہے، ایسی خاموشی جس پر گویائی نثار ہو، انسان کا اصل ساتھی، اصل رہبر اس کا اپنا ذوق ہے، اس کی اصل منزل اس کا اپنا

آپ ہے، اپنے من میں ڈوبنے کی دیر ہے، گوہر مراد حاصل ہوجاتا ہے۔ آواز حجاب ہے، خاموشی کاشفِ راز ہے، باطن کا سفر، اندرونِ بینی کا سفر، من کا سفر، دل کی گہرائیوں کا سفر، رازِ ہستی کا سفر، دیدہ وری کا سفر، چشمِ پیرا کا سفر، حقِ بینی، حقِ یابی کا سفر، خاموشی کا سفر ہے۔

واصف علی واصف کی کتاب ”قطرہ قطرہ قلمزم“ سے انتخاب: سمیرا انور..... جھنگ

اس ماہ کی کرنیں

☆ آپ کسی پر جھنجھلاہٹ طاری کر دیں وہ اخلاق کی کوئی حد ضرور پھلانگے گا، شدت اس پر منحصر ہے۔

☆ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پرکھنا اور لوگوں پر اعتبار کرنا محض اس لیے نہ چھوڑ دیں کہ ان میں سے کچھ نے آپ کو مایوس کیا ہے کوئی نہ کوئی شخص اور کوئی نہ کوئی پہلو آپ کا ضرور ہے۔

☆ کاغذ پر زندگی کے نقوش مکمل طور پر کبھی نہیں اُتارے جاسکتے، بالکل اس طرح جس طرح کپڑے کا پرنٹ کاغذ پر اُتاراجائے تو اس کا تاثر بدل جاتا ہے۔

☆ کاش کا لفظ آپ کی کوتاہی کو ظاہر کرتا ہے۔

☆ ہر شخص دنیا کو تبدیل کرنے کا سوچتا ہے لیکن خود کو بدلنے کا نہیں۔

☆ اگر آپ کا دماغ سوچتا، سمجھتا، فیصلہ کرتا اور ان تینوں کے نتائج کو یاد رکھتا ہے تو آپ بالکل ٹھیک ہیں۔

آتم فروزا..... کراچی

اس ماہ کا قلم

☆ لفظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر صرف بولنے سے پہلے تک، بولنے کے بعد انسان اپنے لفظوں کا غلام بن

اس ماہ کی غزل

راہوں پہ نظر رکھنا ہونٹوں پر دعا رکھنا
آجائے کوئی شاید دروازہ کھلا رکھنا
احساس کی شمع کو اس طرح جلا رکھنا
اپنی بھی خبر رکھنا اس کا بھی پتہ رکھنا
اک بوند بھی اشکوں کی دامن نہ بھگو پائے
غم اس کی امانت ہے پلکوں پہ سجا رکھنا
بھولوں میں اگر اے دل تو یاد دلا دینا
تہائی کے لمحوں کا ہر زخم ہرا رکھنا
لوگوں کی نگاہوں کو پڑھ لینے کی عادت ہے
حالات کی تحریریں چہرے سے بچا رکھنا
کچھ ایسے قاتل ان سے برتاؤ ہے اپنا
وہ بھی نہ نما مانے دل کا بھی کہا رکھنا

ثناء قیوم..... بہاولپور

اس ماہ کی ہری مرچیں

☆ کیبل کے سائے میں پلنے والے محمد بن قاسم یا شیو سلطان نہیں بلکہ شاہ رخ اور عامر خان بنیں گے۔

☆ جس شادی کی سووی نہ بن رہی ہو اس شادی میں شریک لڑکیاں ایسے لگتی ہیں جیسے صدیوں کی پیار ہوں۔

☆ عورت ایک جھوٹا آنسو بھی بہا دے تو مرد قربان ہونے کو تیار ہوجاتا ہے، پھر بھی صعب نازک کو شکوہ رہتا ہے کہ مرد وفادار نہیں۔

☆ عورت کو زبان درازی کا طعنہ دینے والے اس کی ایک لمحے کی خاموشی پر تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔

☆ بھائی کے پاس بہن کے لئے وقت نہیں جبکہ دوسرے کی بہن کے لئے وقت ہی وقت ہے۔

☆ مرد ہر حال میں رعب ڈالنا چاہتا ہے خواہ باپ ہو، بھائی ہو یا خاوند۔

نور بانو..... کوئٹہ

دل کی ایک خواہش تھی کہ میں تم سے ملوں اور تم میری ہو جاؤ، مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب ہم دونوں پہلی دفعہ ملے تھے، میں نے تمہاری طرف دیکھا مگر تم اس دن منہ موڑے کھڑی تھیں، میں تمہاری ایک ہی جھلک کا دیوانہ ہو گیا تھا اور میں نے دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ میں تمہیں پا کر ہی رہوں گا۔

میں نے گھر جا کر ابو سے بات کی مگر انہوں نے ٹال دیا تو میرا دل ٹوٹ گیا، میں تمہاری چاہت کا دیوانہ تھا، تم روزانہ وہاں کھڑی ہوتی تھیں اور میں وہاں سے گزرتا ہوا تمہیں دیکھتا تھا، میں نے اپنے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا، آخر کار ہزار کوشش کے بعد ابو مان گئے اور وہ خود تمہیں دیکھنے کے لئے گئے، ابو نے تمہیں دیکھا تو انہوں نے ہاں کر دی اور ہم کچھ ہی دنوں بعد تمہیں اپنے گھر لانے کے ارادے سے وہاں سے نکل آئے، آخر وہ دن بھی آ گیا جب ہم دونوں ملنے والے تھے اس دن ابو، امی اور بہن کتنے خوش تھے، مگر میری خوشی ان سب سے زیادہ تھی، کیونکہ میں نے تمہیں پانے کے لئے بہت صبر کیا اور آخر تم میری ہوئی گئیں، اے میری پیاری ”کار“ اگر آج تم میرے ساتھ نہ ہوتیں تو میری زندگی میں خوشی کے اتنے رنگ نہ ہوتے۔

نبیلہ ملک..... کراچی

اس ماہ کا شعر

ملا کر ہمیں اکثر کہ جی نہیں لگتا جانِ جاں
تمہارے رابطے سے زندگی وجود میں ہے
نوشین مدر..... لاہور

اس ماہ کی مزاحیہ غزل

ہمیں کہیں کہ نہ اس نے رکھا
تو اس میں بھی رکھ رکھاؤ ہے گا
اسے جو ہم سے لگاؤ ہے گا

رقیب کو اس پہ تاؤ ہے گا
وہ کسی پینے کو آرہے ہیں
کہیں یہاں آدھ پاؤ ہے گا
گرانی کوٹھے چڑھی ہوئی ہے
نرخ ہے کوئی نہ بھاؤ ہے گا
نہ اب چلو گے تو کب چلو گے
ہمارا بھی چل چلاؤ ہے گا
گلی میں تنہا بلا رہا ہے
یہ اس کے تبا کا داؤ ہے گا
غریب جیدی کی فاتحہ پر
بغیر بوٹی پلاؤ ہے گا

شاعر:- امیر شاہ خان (جیدی)
انتخاب: روشنی فاطمہ..... کراچی

اس ماہ کی نظم

کئی بے قرار آنسو
آنکھوں سے بہہ نکلے تھے
آج کیا ہوا مجھ کو؟

اس طرح سے پہلے تو میں کبھی ٹوٹا نہ تھا
اس سفر زندگی میں کئی موڑ دیکھے تھے
کئی درد کے لمحے، کئی سوگ کی راتیں
کئی روگ کی باتیں
ہنس کے ہم نے سہیلی تھیں
آنکھیں تب بھی پُپ تھیں
دل گر چڑھتا تھا

پھر!!!

آج کیا ہوا مجھ کو؟
اس طرح سے پہلے تو میں کبھی ٹوٹا نہ تھا
پر تب کی بات اور بھی شاید
اب کے خواب ٹوٹا ہے!!!

مذتوں جسے میں نے آنکھوں میں بسایا تھا
ہاں میرا وہی سپنا
مجھ سے آج بھٹوٹا ہے

تب کی بات اور بھی شاید
اب کے خواب ٹوٹا ہے!!!

نائب نور..... ملتان

اس ماہ کے اقوال و زریں

☆ کوئی آئینہ انسان کی اتنی سچی تصویر پیش نہیں کر سکتا،
جتنی کہ اس کی گفتگو۔

☆ لاکھوں کو دوست بنانا کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بات
یہ ہے کہ ایک ایسا دوست بناؤ جو تمہارا اس وقت ساتھ
دے، جب لاکھوں تمہارے مخالف ہوں۔

☆ لوگوں کو دعا کے لیے کہنے سے زیادہ بہتر ہے، ایسے
اعمال کرو کہ لوگوں کے دل سے آپ کے لیے دعا نکلے۔

☆ اچھا دوست چاہے جتنا بھی برا بن جائے، کبھی اس
سے دوستی مت توڑنا، کیوں کہ پانی چاہے جتنا بھی گندا
ہو جائے، آگ بجھانے کے کام آتا ہے۔

☆ کامیابی حوصلوں سے ملتی ہے اور حوصلے دوستوں
سے ملتے ہیں، دوست مقدروں سے ملتے ہیں اور مقدور
انسان خود بناتا ہے۔

علیہ نور..... کراچی

اس ماہ کی اچھی بات

اگر کوئی تم سے ناراض ہو اور اُسے اس بات کا غرور ہو
کہ تم اُسے منالو گے، تو اُس کے غرور کو ٹوٹنے مت دینا۔
شازیہ علی..... گجرات

اس ماہ کا لطیفہ

مریض: ”میں بہت خوش رہتا ہوں، خیمہ سکون سے
آتی ہے، زندگی میں امن ہی امن ہے، ہر کام میں دل لگا
ہے، کوئی پریشانی نہیں، ایسا کیوں ہے ڈاکٹر صاحب؟“
ڈاکٹر: ”میں آپ کی بیماری سمجھ گیا ہوں جیسا کہ!
آپ کی زندگی میں دنا من She کی شہید کی ہے۔“

بسم علی..... سکھ

☆.....☆.....☆



حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ
نے ارشاد فرمایا:

”قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے مرتبے میں کم وہ
شخص ہوگا جس کی فحش گوئی اور بد زبانی کے ڈر سے لوگوں
نے اس کو چھوڑ دیا ہوگا۔“ (بخاری، مسلم)

دھنک ناز..... کراچی

شیطان کا سامان تجارت

حضرت عیسیٰ نے دیکھا کہ شیطان چار گدھوں پر سامان
تجارت لادے ہوئے جا رہا ہے، آپ نے پوچھا:
”اے مردود! یہ کیا لے جا رہا ہے؟“

شیطان نے کہا: ”یہ مال تجارت ہے، ایک گدھے پر قلم،
دوسرے پر خیانت، تیسرے پر مکر و فریب اور چوتھے پر
حسد لادنا ہوا ہے۔“

مخبر خدا نے پوچھا: اس مال کا خریدار کون ہے؟“
شیطان نے کہا: ”عظیم حکمرانوں اور بادشاہوں کے کام کی
چیز ہے، وہ اس کو خریدتے ہیں، خیانت تاجروں کے ہاتھ
فروخت کرتا ہوں، مکر و فریب عورتوں کا پسندیدہ مال ہے
اور حسد کی علماء کے ہاں بہت مانگ ہے، میرے تمام مال
کے کاہک موجود ہیں۔“

عانیہ نیازی..... ربوہ

خلافت راشدہ کا انصاف

حضرت علی کا دور خلافت ہے، دار الخلافہ مدینے سے
کوٹے میں منتقل ہو چکا، شریع اسلامی مملکت کے چیف
جسٹس ہیں، امیر المومنین علیؓ اور ایک یہودی کا تنازع ان
کی عدالت میں پیش ہوتا ہے، امیر المومنین کی زرہ کہیں

پڑی تھی اور اس یہودی کے ہاتھ لگ گئی۔ امیر المومنین کو
پتہ چلتا ہے تو وہ اس سے زرہ کا مطالبہ کرتے ہیں، مگر
یہودی کہتا ہے کہ زرہ میری ہے، چنانچہ دینے سے انکار کر
دیتا ہے۔ امیر المومنین عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں،
چیف جسٹس شریع فریقین کے بیان لیتے ہیں، یہودی
اپنے بیان میں کہتا ہے کہ زرہ میری ہے اور اس کا ثبوت یہ
ہے کہ میرے قبضے میں ہے۔ چیف جسٹس شریع،
امیر المومنین سے اپنے دعوے کے ثبوت میں گواہ پیش
کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ دو گواہ پیش کرتے ہیں: حسینؓ اور
قمرؓ۔ چیف جسٹس شریع کہتے ہیں کہ قمرؓ کی شہادت تو قبول
کرتا ہوں، لیکن حسینؓ کی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔
امیر المومنین کہتے ہیں آپ حسینؓ کی شہادت کو مسخرہ کرتے
ہیں! کیا آپ نے رسول اللہؐ کا ارشاد نہیں سنا کہ حسنؓ اور
حسینؓ جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔ چیف جسٹس کہتے
ہیں سنا ہے مگر میرے نزدیک باپ کے حق میں بیٹے کی
شہادت معتبر نہیں۔ دوسرا شاہد نہ ہونے کی وجہ سے امیر
المومنین کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔ امیر المومنین نے تو کوئی
آرڈیننس جاری کرتے ہیں اور نہ کسی قانون کی پناہ
ڈھونڈتے ہیں بلکہ اس فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے
ہیں۔ یہودی اس فیصلے سے بے حد متاثر ہوتا ہے، وہ دیکھتا
ہے کہ ایک شخص صاحب اختیار ہونے کے باوجود اس کی
زرہ اس سے چھیننا نہیں بلکہ عدالت کے دروازے پر
دستک دیتا ہے۔ عدالت بھی اس کے ساتھ کوئی امتیازی
سلوک نہیں کرتی۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں یکساں حالت
میں عدالت کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ امیر المومنین جج
کا فیصلہ بے چوں و چراں تسلیم کرتا ہے۔ عدالت اور

امیر المومنین کا منصفانہ کردار اس کے دل میں کھب جاتا ہے۔ وہ وہیں پکار اٹھتا ہے کہ زرہ امیر المومنین کی ہے اور جس دین کا ماننے والا قاضی، امیر المومنین کے خلاف فیصلہ صادر کرتا ہے اور امیر المومنین اس فیصلے کو بلا حیل و حجت مان لیتا ہے وہ یقیناً سچا ہے۔ امیر المومنین اس یہودی کے اسلام لانے پر اتنے مسرور ہوتے ہیں کہ بطور یادگار اپنی زرہ اسے دے دیتے ہیں۔

بسمہ علی..... سکھر

جاہل کی چھ علامتیں

جاہل چھ علامتوں سے پہچانا جاتا ہے۔

(۱) بے موقع غصہ

جاہل آدمی، انسان سے جانور بلکہ بے جان چیز پر بھی غصہ کرتا ہے۔

(۲) غیر مفید گفتگو

مجھدار آدمی کچھ فضول باتیں نہیں کرتا، یہ صرف جاہل کا کام ہے۔

(۳) بے موقع دینا

کسی کو کچھ دینا جس سے آخرت کا یا دنیاوی فائدہ نہ ہو جہالت ہے۔

(۴) ہر ایک سے راز کھول دینا

راز کی بات ہر کسی سے کہہ دینا نقصان سے خالی نہیں۔

(۵) ہر کسی پر بھروسہ کر لینا

ہر کسی پر بھروسہ کرنے والا پچھتااتا ہے۔

(۶) دوست و دشمن کی تمیز نہ کرنا

لباس خضر میں سینکڑوں رہزن پھرتے ہیں، دنیا میں رہنا ہے تو کچھ تو پہچان پیدا کر۔

ریحانہ..... ملتان

قیمتی موتی

☆ نہ کسی کے ساتھ محبت کرنے میں جلدی کرو اور نہ عداوت کرنے میں عجلت سے کام لو۔

(حضرت عبدالقادر جیلانی)

☆ مومن ہو یا کافر، کسی کی دل آزاری نہ کرو، اس لیے کہ کفر کے بعد بھی سب سے بڑا گناہ ہے۔

(حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی)

☆ جس کام کو میں سب کاموں سے مؤخر جانتا تھا وہ مقدم کام تھا، یعنی والدہ کی رضامندی۔

(حضرت بایزید بسطامی)

☆ راہ دور ویشی چلنا اور بات ہے اور ذخیرہ جمع کرنا اور بات ہے، درویش بن یا ذخیرہ جمع کر۔

(حضرت قطب الدین بختیار کاکی)

رقیہ بلال..... کوئٹہ

سخن فہم

کالج میں ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا: ”کیا تم امتحان میں پاس ہو گئے؟“

”وہ دراصل بات کچھ یوں ہے کہ.....“

”ٹھیک ہے میں سمجھ گیا، میں بھی فیل ہو گیا ہوں۔“ دوست نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

شمالیہ ملک..... کراچی

تعاون

بیٹے کی پچیسویں سالگرہ پر باپ نے اس سے کہا: ”بیٹا! تم اب جوان ہو گئے ہو، میں چاہتا ہوں تم میرا کچھ بوجھ بٹاؤ۔“

”ضرور ابا جان! آپ بتائیے میں کیا کروں؟“ بیٹے نے سعادت مندی سے کہا۔

”بیٹا! تمہاری پیدائش کے وقت ہم نے اسپتال اخراجات کے لئے بینک سے کچھ قرضہ لیا تھا، میں چاہتا ہوں کہ اس کی آخری تین قسطیں تم ادا کرو۔“

سونیہ خان..... بھکر

جدید محاورے

☆ میاں مارے ایک بار، بیگم مارے بار بار

☆ چینی چلاتی کا نام بیوی ہے

☆ خدا بیگم کے پاس قبر نہ بنوائے

☆ ساس بیگم گھر نہیں، اس کو کسی کا ڈرنیٹ

☆ کنوارہ روئے ایک بار، بیاہاروئے بار بار

زینب بشر..... سیالکوٹ

اُف یہ ٹینشن!

کیا ہے یہ ٹینشن؟ کہاں سے آئی ہے یہ ٹینشن؟ کس نے بنائی ہے یہ ٹینشن؟ اگر ہم سے کوئی یہ پوچھے کہ مرثی پہلے آئی تھی یا انڈا؟ تو ہمارے لئے جواب دینا ذرا مشکل ہو گا لیکن اگر ہم سے یہ پوچھا جائے کہ دنیا پہلے بنی تھی یا ٹینشن تو ہم فٹ سے جواب دیں گے ”ٹینشن“

اجی دور کہاں جاتے ہیں، ذرا اپنے ارد گرد نظر دوڑائیے، جو غریب لوگ ہیں، ان کو اس بات کی ٹینشن ہے کہ بیوی بچوں کا کہاں سے پورا کر س، شرافت اور ایمانداری سے پیٹ مشکل سے ہی بھرتا ہے، جو بہت دولت مند ہیں ان کو اس بات کی ٹینشن ہے کہ دولت کو کیسے دگنا چوگنا کیا جائے اس ٹینشن کے مارے ان کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے، ہمارے طلباء کو بھی دیکھ لیجئے، سارا سارا سال پڑھائی کی ٹینشن، سال کے آخر میں امتحان کی ٹینشن، امتحان کے بعد نتیجہ کی ٹینشن اور نتیجے کے بعد، اگر وہ نا قابل دید ہو تو اسے دوسروں کو بتانے کی ٹینشن!

اس نری ٹینشن سے تو گھر کی چار دیواری میں بیٹھی عورتیں بھی نہیں بچ سکتیں۔ ہر روز ایک ہی ٹینشن! پتہ ہے کیا؟ ”اجی سینے! آج کیا پکاؤں؟“ اس طرف سے بیزاری سے لبریز جواب ملتا ہے۔ ”باہر کی ٹینشن کیا کم ہے کہ اب پکانے کی ٹینشن بھی میں سلجھاؤں، ہونہہ.....!“

جو لوگ ذرا پڑھ لکھ گئے ہیں اور اچھی اچھی ڈگریاں لئے بیٹھے ہیں، انہیں روزگار ڈھونڈنے کی ٹینشن نے گھیرا ہوا ہے۔ ان کو کوئی بتائے کہ آجکل

ماڈرن دور ہے، سفارش اور رشوت کا زمانہ ہے، یہ لوگ ڈگریاں ہاتھوں میں لئے کس معجزے کے منتظر ہیں؟ ارے میاں وہ دن گئے، جب خلیل خاں فاخستہ اڑایا کرتے تھے۔

☆ ساس بیگم گھر نہیں، اس کو کسی کا ڈرنیٹ

☆ کنوارہ روئے ایک بار، بیاہاروئے بار بار

☆ ساس بیگم گھر نہیں، اس کو کسی کا ڈرنیٹ

☆ کنوارہ روئے ایک بار، بیاہاروئے بار بار

☆ ساس بیگم گھر نہیں، اس کو کسی کا ڈرنیٹ

☆ کنوارہ روئے ایک بار، بیاہاروئے بار بار

☆ ساس بیگم گھر نہیں، اس کو کسی کا ڈرنیٹ

☆ کنوارہ روئے ایک بار، بیاہاروئے بار بار

ٹینشن کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ کہیں بھی، بالکل مفت دستیاب ہے، جیسے ڈرائیور حضرات کو ٹوٹی ہوئی سرکوں کی ٹینشن، کسان کو بارش نہ ہونے کی ٹینشن لڑکیوں کو اپنے لیے بالوں کی ٹینشن، عاشقوں کو محبت میں ناکامی کی ٹینشن، کنواروں کو شادی کی ٹینشن! آخر اس ٹینشن کا کیا حل ہے؟ جیتے جی تو شاید یہ مسئلہ حل نہ ہو شاید مرنے کے بعد.....!

ارے نہیں جی، مرنے کے بعد بھی ایک ٹینشن ہے کہ ”دوزخ میں جائیں گے یا جنت میں؟“ اُف میرے خدا یا.....!!!!

☆ ایس امتیاز احمد..... کراچی

”کہاوتیں“

☆ جب کتا ہو تو پتھر نظر نہیں آتا، اور جب پتھر ہو تو کتا نظر نہیں آتا۔ (پاکستانی کہاوت)

☆ عسلی عورت اور ٹپکنے والا گھر یکساں ہوتے ہیں۔ (ہندوستانی کہاوت)

☆ سستی چیزیں اچھی نہیں ہوتیں اور اچھی چیزیں سستی نہیں ہوتیں۔ (چینی کہاوت)

☆ عمدہ دوائی اکثر کڑوی ہوتی ہے۔ (جاپانی کہاوت)

☆ بالکل نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ (جرمن کہاوت)

☆ بھیڑ کو باپ نہیں، صرف گھاس یاد آتی ہے۔ (روسی کہاوت)

☆ مچھلی اور مہمان سے تین دن بعد بد بو آنے لگتی ہے۔ (امریکی کہاوت)

☆ روشنی فاطمہ..... کراچی

ضرورت

شاخ جب تک درخت پر لگی رہتی ہے وہ اس کا حصہ ہوتی ہے، لیکن جیسے ہی وہ اس سے ٹوٹ کر گر جاتی ہے وہ اس سے جدا ہو جاتی ہے، پھر وہ صرف سوکھی لکڑی رہ جاتی ہے، جسے لوگ اپنی ضرورت کے لیے

بھر جاؤں نہ کہیں ایک دن ہواؤں میں ڈرتا ہوں
میں اپنے آپ کو رکھوں کہاں شعروں کی صورت
سر محشر اگر چاہو تو پڑھ دینا خرم سے
مجھے بھی ساتھ لے جانا وہاں اپنے شعروں کی صورت
میں شاعر ہوں میں ہونٹوں پہ کہانی بن کے بیٹھوں
میں آنکھوں میں ساؤں کا جوان کے شعروں کی صورت
یہ مجھ سے ہوگئی سرزد طلسماتی فسون کا
حقیقت سے نکل آیا گماں شعروں کی صورت
وہ جب بھی چاہتا ہے پوچھ لیتا ہے مجھ سے کوئی مدد
میرے دل میں ہے میرا راز داں شعروں کی صورت
جنوں تھا یہ سمندر کو اپنی غزل سمجھے
یوں ناؤ پر لگایا بادباں شعروں کی صورت
پروفیسر ڈاکٹر واجد گیلانی

غزل

آنچل میں سجا لینا، تم دل میں بسا لینا
جب یاد ستائے تو خوابوں میں بسا لینا
زلفوں کو تو لہراؤ، میرے دل پہ ستم ڈھالنا
تم چاہے مجھے کچھ نہ دو، پر مجھ سے وفا لینا
آنچل پہ ستارے ہیں ہونٹوں پہ تبسم لینا
میرے پیار کے گیتوں کو تم دل میں چھپا لینا
معلوم نہیں تجھ کو، مجھے تم سے محبت لینا
کاجل میری الفت کا آنکھوں میں چھپا لینا
یہ میری تمنا ہے تم ساتھ میرے رہنا
میرے پیار کی شمع کو بس دل میں بسا لینا
امتياز کہے تم سے تم ایک ہو لاکھوں میں
میں پیار سے جو دیکھوں، آنکھیں نہ پڑا لینا
ایس۔ امتیاز

دعا
اے خدا مجھ کو اپنے جلوہ نور سے
اس قدر فیضیاب کر دے
کہ جب تک میں اٹھا کر دیکھوں
تو ہی تو نظر آئے
تو نے ہی تو دنیا کی ہر شے کو ہے پیدا کیا
مجھ کو چاند جیسا محبوب
اور ستاروں جیسے دوست عطا کیے
تو ہی تو ہے دونوں جہانوں کا مالک و رب
مجھ بندہ پروردگار بھی
اب سارے گناہوں سے آزاد کر دے
تو جلوہ افروز سے اپنی رحمت کی
اس قدر بارش کر دے
کہ مجھ گناہ گار کو ان موتیوں میں
پور پور ڈبو دے

اے خدا لاٹو ہی تو ہے ہر شے پر
قادر و قدرت رکھنے والا
اب مجھ کو بھی اپنے نظر کرم کے لائق کر دے
تو میری زندگی کو اس قدر سنوار دے
کہ میرے دل میں ایمان کی روشنی تازہ کر دے
اے خدا! ہر چیز تو ہے تیرے بس میں
تو مجھ کو میرے خواب میں دیکھے گئے
مدینے جانے کی تعبیر عطا کر دے (آمین)

مدیحہ اعجاز حسین

غزل

میں جب بھی لکھتا ہوں اپنی داستاں شعروں کی صورت
اُبھر آتا ہے آنکھوں میں جہاں اپنا شعروں کی صورت

منہ میں لے لیا اور دل و جان سے اس کی پرورش کی۔
تھوڑے ہی دنوں میں یہ قطرہ ایک قیمتی موتی بن گیا۔ اور
بادشاہ کے تاج کی زینت بنا۔

امیرین حیدر۔ اسلام آباد

اچھی عادات

☆ ایک روز خلیفہ ہارن الرشید نے لوگوں سے کہا کہ اگر
تم نیک انسان بننا چاہتے ہو تو بچوں جیسی عادات اپنالو۔
لوگوں نے پوچھا، ”وہ کیسے؟“
خلیفہ نے کہا، بچوں میں سات عادات ہوتی ہیں جو
اگر بڑوں میں ہوں تو وہ ولی اللہ بن جائیں۔ عادات یہ
ہیں۔
☆ رزق کا غم نہیں کرتے۔
☆ انکسٹل کرکھاتے ہیں۔
☆ لڑتے جھگڑتے ہیں تو دل میں کینہ نہیں رکھتے۔
☆ لڑائی کے بعد جلد صلح کر لیتے ہیں۔
☆ اپنے بڑوں سے ڈرتے ہیں۔
☆ ذرا سی دھمکی سے رونے لگتے ہیں۔
☆ دشمنی کا جامہ مستقل نہیں پہنتے۔

صدق علی۔ فیصل آباد

نیم حکیم

☆ ایک سردار کی ٹانگ نیلی ہوگئی، حکیم صاحب بولے: ”زہر
پھیل گیا ہے، ٹانگ کاٹنی پڑے گی۔“
تین دن کے بعد سردار جی کی دوسری ٹانگ بھی نیلی ہوگئی۔
حکیم صاحب: ”یہ بھی کاٹنی پڑے گی، زہر کافی پھیل گیا
ہے، دونوں کاٹ کر پلاسٹک کی ٹانگیں لگا دیں گے، آپ
بالکل بھی پریشان نہ ہوں سردار جی!“
آٹھ دن کے بعد پلاسٹک کی ٹانگیں بھی نیلی ہو گئیں۔
حکیم صاحب: ”اب سمجھ آیا سردار جی! تمہاری دھوتی کا
رنگ اترتا ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“

ام فرواد۔ کراچی

☆☆☆

استعمال کر لیتے ہیں۔

سمیر انور۔ جھنگ

مہکتی کلیاں

☆ انسان کی آزمائش جتنی بڑی اور مشکل ہوگی، انعام
بھی اتنا بڑا ہوگا۔
☆ اگر نیک اور مخلص بننا چاہتے ہو تو شبنم کے قطرے کی
طرح شفاف ہو جاؤ۔
☆ سب سے نادان شخص وہ ہے، جو چھوٹی چیز کی خاطر
بڑی چیز کھودیتا ہے۔
☆ دو حریص ایسے ہیں جن کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی،
ایک علم اور دوسرا دنیا کا۔
☆ ہم میں سے اکثر کے نزدیک حقیقی زندگی وہ ہے جسے
ہم خود بسر نہیں کرتے۔
☆ کامیابی کا دار و مدار آپ کی محنت یا دوسروں کی
جہالت پر ہے۔

نوشین مدثر۔ لاہور

نیک فطرت آدمی

☆ ایک شخص نہایت خوش خلق اور نیک سیرت تھا۔ وہ
بُروں کو بھی بھلا کہتا تھا کیونکہ اپنی نیک فطرتی کی وجہ سے
اس کی نظر ان کے عیبوں پر نہیں جاتی تھی۔ جب اس نے
دنیاے فانی سے کوچ کیا تو کسی نے خواب میں دیکھا اور
پوچھا کہ ”مرنے کے بعد تیرا حال کیا ہوا؟“ اس نے ہنستے
ہوئے جواب دیا کہ ”الحمد للہ مجھ پر کوئی سختی نہیں کی گئی
کیوں کہ میں نے بھی کبھی کسی کے ساتھ سختی نہ کی تھی۔“

سمیر افضل۔ سرگودھا

قیمتی موتی

☆ بارش کا ننھا قطرہ بادل سے ٹپکا۔ جب اس نے سمندر
کی چوڑائی دیکھی تو شرمندہ ہوا اور دل میں کہا کہ سمندر کے
سائے میری حیثیت کیا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے تو میں
منہ ہونے کے برابر ہوں۔ جب اس نے اپنے آپ کو
حقارت سے دیکھا تو ایک سپی (صدق) نے اس کو اپنے

لطم

یہ چاہت بھی کیسا جذبہ ہے
دل بے اختیار ہی
کسی کو چاہنے لگتا ہے
میں نے بھی اپنے دل میں
تمہارے لئے چاہت محسوس کی ہے
جب بھی آئینے میں
خود کو دیکھتی ہوں
میری آنکھوں سے تیری یادیں
نمی کی صورت دل پر گرتی ہیں
میرے دل میں اب بھی
تمہارے لئے چاہت موجود ہے
جب بھی میں تنہا ہوتی ہوں
صرف تمہاری ہی سوچوں میں
خود کو قید پاتی ہوں

سمیرا تیموری

لطم

دن رات تمہیں یاد کرتا ہوں
تیرے ہی خیال میں رہتا ہوں
اپنی صبح شام تیرے نام کرتا ہوں
تم سے ملنے کو جب دل کرتا ہے
بند کرتا ہوں آنکھیں اپنی
جی بھر کر تیرا دیدار کرتا ہوں
ہر وقت احساس تیرا ہوتا ہے
مہکتی ہیں تنہائیاں
نام لے کر جب تیرا خود سے کلام کرتا ہوں
میری آنکھوں کی نمی ہو تم
میری زندگی ہو تم
زندگی سے بڑھ کر تجھے نام دیا ہے
اپنا سب کچھ ہی تیرے نام کیا ہے
نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر
اس کا اظہار کرتا ہوں

تم ہو میری جان
میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں

ذیشان سلطان

بیاد ماضی

وہ لمحے ماضی کے، گزر گئے جو لمحوں میں
چند یادیں سہانی، کچھ تلخیاں یادوں میں
وہ میرے ماضی کے کسی حسین گوشے میں
وصل و فراق کی رعنائیوں کو چھوڑ آئی ہیں
وہ شب و روز کی ملاقاتیں
وہ چھپ چھپ کر ملنا، اور دو دلوں کا ملاپ
باتوں کا سلسلہ، آنکھوں میں خمار
سہانے لمحے، جسم و جان کا وصال
رگوں میں شعلے لئے، حیا کی آمیزش
وہ عہد و بیان، محبت کے لمحات
ایک خواب کی طرح دھندلا گئے
وہ لمحات اور تمہاری یادوں کی تنہائی
وہ جلوے میں کس میں تلاش کروں
میں وہ باتیں، کس سے کہوں
وہ یادیں میں کہاں سے لوٹاؤں.....

سلیم بیک ہمدانی

غزل

بہت دنوں کے بعد آج پھر اُداس ہوئے ہیں
غم جو تم نے دیئے ہیں آج پھر تازہ ہوئے ہیں
بہت کوشش کی تجھے بھول جانے کی مگر
لاکھ کوشش کے پھر ناکام ہوئے ہیں
دیوانا وار تیری دیوانگی کا شکار ہوئے ہیں
لمحہ فراغت میں آج پھر تیرے ساتھ ہوئے ہیں
سوچ میں ڈوبے کچھ بہت گہرا سوچ رہے ہیں
دل کے زخموں کو الفاظ میں لکھ دیئے ہیں
ناز اپنی قسموں سے پھر وعدہ خلاف ہوئے ہیں
تیری یاد میں کھو کر آج پھر سیراب ہوئے ہیں

صائمہ ناز

لطم

میں اپنے کمرے کی اُداس فضا میں بیٹھی
درتے تھے سے باہر جھانکتی ہوں
باہر کی رنگین دنیا میں
ہواؤں کی فضاؤں میں محبت رقصاں ہے
شوخ و چنچل چہرے چمک رہے ہیں
پلکوں پہ تمناؤں کی کہکشاں اُتری ہیں
لڑکیوں کے سرخ و صبح رخسار
شر میلے پن سے ٹٹمار رہے ہیں
آوارہ بادل جیسے اس گھڑی
میری بے بسی پہ مسکرا اٹھا
میں گھبرا کے کھڑکی بند کرتی ہوں
دل دردوں سے بوجھل ہوتا جا رہا ہے
آنکھوں کے بھیکے کنارے اب یوں بس
سمندر سے ہوئے جا رہے ہیں
میرے وجود سمیت کمرے کی
ہر شے ہم کلام ہوتی ہے
اے میرے ویلنٹائن!
کاش ہماری محبت کے بیج
جدائی کا پھول نہ کھلا ہوتا

ایمان علی

تیری آنکھیں

تیری آنکھیں
شرارت سے چمکتی جگنوؤں کی طرح
امیدوں سے بھری کچھ پانے کی طرح
تیری آنکھیں
دیکھتی ہیں جب مجھ کو
چمکتی ہیں ایسے زندگی کی طرح
جب مسکراتی ہیں یہ آنکھیں
جیسے روشن صبح کی طرح
تیری آنکھیں
جب ہوتی ہیں اُداس

ایسے جیسے شام کی طرح
جب ڈھونڈتی ہیں مجھ کو
بے تاب چاہت کی طرح
تیری آنکھیں
جب نظر بھر کے دیکھتی ہیں مجھ کو
چمکتی ہیں ایسے آسمان کے چاند کی طرح
تیری آنکھیں
چاہتوں کی کونہیں جب ان میں لپکتی ہیں
گنتی بے تاب لگتی ہیں محبتوں سے پورے ہنگم
دھڑکنوں کی طرح
تیری آنکھیں
تیری آنکھیں
ہاں کس قدر پیاری مجھ کو
تیری یہ خوبصورت آنکھیں
تیری آنکھیں.....!!

لطم

سنو اے جان.....!!
انا کا ڈھونگ رچا کر.....
آخر تم کب تک.....
یوں خود سے جھوٹ بولو گے.....
تمہیں مجھ سے محبت نہیں.....
میری ضرورت نہیں.....
سنو.....
تمہاری یہ سرد مہری.....
بے رخی.....
مجھے کہیں کانہ چھوڑے گی.....
تمہارا خفا خفا سار ہنا.....
ہنس ہنس کے سب سہنا.....
مجھے مار ڈالے گا.....
سنو.....!
اے ہمسفر.....

اے جان.....
یہ انا چھوڑ بھی دوںاں.....
ایک بار پھر سے.....
تجدید وفا کروںاں.....
کہ.....

تمہیں مجھ سے محبت ہے.....
تمہیں میری ضرورت ہے.....

سیر اغزل

دیکھا میں نے کیا کمال کیا

وہ جو ہستی گاتی لڑکی تھی
وہ جو خواب سجاتی لڑکی تھی
اُس لڑکی کو میں نے مار دیا
دیکھا میں نے کیا کمال کیا
وہ جو ہر مشکل سے لڑ جاتی تھی
وہ جو دکھ سہہ کر بھی مسکراتی تھی
اُس کو جیتے جی میں نے مار دیا
دیکھا میں نے کیا کمال کیا
اب آنکھ میں اُس کے نہ آنسو کوئی
نہ ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکان کوئی
تھر کے روپ میں اُس کو ڈھال دیا
دیکھا میں نے کیا کمال کیا

سحر انجم

غزل

اک سلگتا گمان چھوڑ گیا
زخم اپنا نشان چھوڑ گیا
لے گیا تیرا اپنے ساتھ کبھی
میرا قاتل گمان چھوڑ گیا
بات کوئی نہ کی محبت سے
خ لچہ زبان چھوڑ گیا
مجھ سے چھڑا جب ہم سفر میرا
عمر بھر کی تھکان چھوڑ گیا

حال پوچھانہ جس کا ٹونے کبھی
آج تیرا جہان چھوڑ گیا
تھا محبت پہ جس کی ناز حکیم
وہ بھی آخر مکان چھوڑ گیا

حکیم خان حکیم

نظم

اے عمر رواں آہستہ گزر
کیا جلدی ہے کچھ دیر بھر
کچھ خواب سہانے بنے دے
نقدیر سے پنے پختے دے
جوبات کئی ہے آنکھوں تک
ہونٹوں سے بیاں وہ کرنے دے
وہ ٹھٹھا کا ہے دلیر پہ کیوں؟
کیوں رات سلگتی آہوں میں؟
صبح کا اُجالا زہریلا
اور شام دھندلی راہوں میں
ہے چاند بھی سنا بادل میں
پُر کیف فضا پر فلی سی!
کوئی آہ مچلتی ہے لب پر
کوئی حرف کھلکھتا ہے دل میں
اک اُبھی ڈور ہے ہاتھوں میں
دم بھر کو اُسے سلجھانے دے
اے عمر رواں آہستہ گزر
کیا جلدی ہے کچھ دیر بھر
ایسا نہ ہو ہم کھوجائیں
صحرا کی مسافت ہو جائیں
آواز نہ کوئی رستہ رو کے
نہ دامن کوئی زنجیر کرے
لہجہ نہ کوئی اسیر کرے
کوئی یاد نہ ہم کو زیر کرے
اے عمر رواں آہستہ گزر
ایسا نہ ہو ہم کھوجائیں

سیماسحر

نظم

میری باتیں کچھ ان کہی
جو کہنا چاہوں
دل میں مچلتے خیال
الفاظ ڈھونڈے
جو کوئی تو سمجھے
کیسے کہوں
وہ ملے کب مجھے
جو چاہے مجھے
لیکن سوچوں کبھی تنہائی میں
کہ کہیں وہ عام نہ ہو
جسے دنیا کی بھیڑ میں ڈھونڈنا پڑے
کاش وہ ایسا خاص ہو
جس کی اپنی پہچان ہو
جس کا حوالہ ہو میرے لئے
جو دنیا کے لئے بہت خاص ہو
لیکن
اس کے لئے صرف میں خاص ہوں

حمیرا سلمان سومرو

غزل

دکھ صدمات میں خوش رہتا ہوں
ہجر کی رات میں خوش رہتا ہوں
چاند ستاروں سے ہے نفرت
کالی رات میں خوش رہتا ہوں
تیرے نام برستی ہے جو
اُس برسات میں خوش رہتا ہوں
عادی ہوں میں تنہائی کا
اپنی ذات میں خوش رہتا ہوں
اشک ہیں میرے جیون ساتھی
غم کے ساتھ میں خوش رہتا ہوں
ڈرتی ہے مجھ سے موت حکیم

میں آفات میں خوش رہتا ہوں

حکیم خان حکیم

غزل

اُجڑے ہوئے لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں
ہر شخص کے اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں
کوئی جا کے جہاں میں نہیں ہے آتا
خوف کے سائے کتنے مہیب ہوتے ہیں
خیالوں میں آ کے جو مٹتے نہیں کبھی
وہ کتنے پیارے میرے حبیب ہوتے ہیں
تھک ہار کے سو جاتا ہوں آخر کار
جذبے زندگی کے کتنے قریب ہوتے ہیں
جب بھی آئے گا گزرے دنوں کا خیال جاوید
زاویے حسن کے بھی پھر کتنے عجیب ہوتے ہیں

محمد سلیم جاوید

نظم

محبت چار حرفوں کا صحیفہ ہے
محبت "م" سے ہے مرگ
"ح" سے حادثہ بھی ہے
یہ "ب" سے بے کلی بھی ہے
اور "ت" سے تاج کانٹوں کا
اگر یہ مرگ ہے تو مرگ سے کس کو مفر سوچو
جو اس کو حادثہ جانو
تو اس سے کون بچ پایا
ہے اگر جو "ب" سے بے کلی تو
یہ بے کلی سانسوں پر حاوی ہے
اگر ہے تاج کانٹوں کا
تو جس پر بھی بجا ہے
وہ سرتن پر نہیں رہتا
محبت خون میں ڈوبا ہوا ایک دشت ہے
یہ گہری اُداسی ہے
محبت ہے دُعا جیسی
محبت کر بلا سی ہے

ہمارے پیارے نبی کا جہاں نام نکھا ہو، اور وہ حصہ رحمت اور پرنور نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ افسانے ناولٹ بہترین تھے، سب نے ہی بہت اچھا لکھا، اور سب کی محبتوں سے عید کے رنگوں میں سجاوڑا پہلے ہی اور حنا کی خوشبو سے بھر پور تھا اور یہ سب بھی آپ کی ٹیم کی وجہ سے ہے، ایسے ہی ہمیں خوش رنگ پہنچاتے رہیں اور دعائیں لیتے رہیں۔ شکریہ! افشاں علی

محببتوں اور اپنائیت، اُلفت و خلوص کی چاشنی لبالب ڈوبا سلام محبت سوئیٹ سی، پیاری سی اور اپنی سی صالحہ آپی! رڈا کے تمام اسٹاف ممبرز اور تمام قارئین تہہ دل سے قبول ہو۔ سب سے پہلے تو آپی! میں آپ بہت مشکور ہوں کہ اتنی غیر حاضری کے باوجود آپ مجھے یاد رکھا اور میرے سندیے کو جگہ دی۔ زینت اونچی نیچی پگڈنڈیوں میں زندگی کے دھاگوں کے ساتھ کچھ اس طرح اُبھی رہی کہ سلجھاتے سلجھاتے اتنا عرصہ غائب رہی، پر انشاء اللہ ہم اب رڈا کی بزم محفل میں یونہی حاضر ہوتے رہیں گے، اس اُمید کے ساتھ کہ آگے سندیے میں ہمیں جگہ ضرور دیں گی۔ جولائی کے شمارہ گوشہ آگہی میں آپ نے خاص عید نمبر کا ذکر کیا، تر سے ایک ایک دن اور ایک ایک لمحہ ہم اس خاص نمبر کو اپنے دسترس میں پانے کے لئے گن رہے تھے، اور جب بالآخر انتظار کی سوئیاں اپنی جگہ کچھ پلوں کے لئے گئیں اور اگلے ہی پلِ تمبر کا خاص اور منفرد سا شمارہ ہمارے ہاتھوں میں آیا ہم نے فوراً اس پر دھاوا بول دیا اور امرت کی طرح گھول کر گھٹ پینا سوری پڑھنا شروع کر دیا۔

غم نذیر..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

السلام وعلیکم! سوئیٹ اپنا! اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گی، رڈا کے تمام اسٹاف کو میرا سلام۔ اُمید ہے وہ سب بھی خیریت سے ہوں گے، ٹھیکس اپنا! ”میری عید تم ہو“ شائع کرنے کا۔ پتہ ہونے کے باوجود اپنا نام رڈا میں دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑی تھی۔ شازیہ مصطفیٰ اور سباس گل کو شادی کی ڈھیر ساری مبارک باد، اللہ پاک آپ کو اتنی خوشیاں دے کہ کوئی غم آپ کو چھو کر نہ گزرے آمین! سوری..... لیٹ مبارک باد اس لیے کیونکہ میرے ایگزام ہو رہے تھے، اس لیے سندیہ لکھ نہیں پائی۔ اپنا! ”رگ جاں سے جو قریب تھے“ ہمیشہ کی طرح بہت شہر جا رہا ہے، شازیہ مصطفیٰ، انعم خان اور نانکھ طارق بہت زبردست لکھ رہی ہیں۔ سباس گل کا ”اعتبار عشق“ ایک عمدہ تحریر تھی۔ باقی سارے افسانے بھی بے حد اچھے تھے۔ رڈا ایک بہت اچھا ڈائجسٹ ہے، میرا بلکہ سب کا فورٹ ہے، میری دعا ہے اللہ پاک اسے مزید ترقی دے آمین! تمام قارئین سے ریکویسٹ ہے کہ ”میری عید تم ہو“ پڑھ کر ضرور بتائیے گا کیسا لگا آپ کو یہ ناول؟ اپنا! اپنا بہت سارا خیال رکھیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا، انشاء اللہ پھر ملیں گے سندیے میں، اب اجازت چاہوں گی۔ اللہ حافظ!

تبسم فیاض..... کراچی

السلام وعلیکم! صالحہ آپی! کیسی ہیں آپ؟ اور رڈا کی ٹیم اس دفعہ عید نمبر بہت زبردست رہا، سارے سلسلوں میں، میں سب سے پہلے گوشہ آگہی پڑھتی ہوں، کیونکہ اس میں کوئی نہ کوئی مقصد اور لوگوں کے لئے بہترین پیغام ہوتا ہے اور رڈائے جنت کی تو بات ہی اور ہے،

اظہار سکون ہوتا ہے
اظہار سکوت توڑتا ہے

تبسم فیاض

بے بی

موسم کی پہلی بارش تھی
اور میں
تم سے جدا ہو رہا تھا

روحان دانش

وہ پاگل سی لڑکی

اک پاگل سی لڑکی
وہ من موہنی صورت والی
وہ کالی غزالی آنکھوں والی
وہ دلوں کو لکھانے والی
وہ ہڈت پسندی لڑکی
دل کا درد نہ کسی کو سناتے والی
لیکن.....!

شام ہوتے ہی
سورج ڈھلتے ہی
اس کی آنکھوں میں
درد سا سم آتا
دیواروں سے لپٹ کر
تکیے پہ سر رکھ کر
وہ پاگل سی لڑکی
سبکیوں میں رویا کرتی
اک غم تھا جو اس کی زندگی
کا اثاثہ بن بیٹھا
وہ محبت جیسی ”دل دل“
میں قدم ڈال بیٹھی

سمیرا انور

☆☆☆

یہ روح کو سیراب بھی کرتی ہے
اور محبت صحرا سی پیاسی بھی ہے
محبت چار حرفوں کا صحیفہ ہے
پر یہ سالوں پر محیط ہے

افشاں علی

اظہار

اظہار سکون ہوتا ہے
اظہار سکوت توڑتا ہے
اظہار سے کسی چہرے پہ
حیا کے رنگ کا لانا
اظہار سے کسی بھرے دل کا
ہلکا ہو جانا
اظہار سے ہے ہر دھند کا
منظر چھٹ جانا
اظہار نام ہے دوسروں میں
محبت کا جگانا
اظہار ہے گرم جذیوں کا
شعندہ پھوار سے پھلانا
اظہار ہے تنہائی میں
خوب صورت سوچ کا آنا
اظہار سے کسی روٹھے ہوئے
سامی کو منانا
اظہار سے حسیں لمحوں کا
امر ہو جانا
اظہار ہے وہ دل کی کلی کا
پھول بن جانا
اظہار سے کسی ٹوٹے ہوئے
دل کا جو جانا
اظہار سے کسی بنجر دل کا
باغ بن جانا
اظہار ہے نئی رت، حسیں موسم
اور اچھی سوچ کی نوید کا لانا

ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور ہیروں سے چمکتے۔ کتے الفاظوں سے لکھا گیا آپ کا گوشہ آگئی خوب رہا، روئے جنت تو واقعی جنت رہا، پھر باری آئی ہمارے رگ جاں سے قریب یعنی آپ کے ناول ”رگ جاں سے جو قریب تھے“ کی۔ بہت ہی اچھے اور منفرد سے انداز میں ناول اپنی رفتار طے کر رہا ہے، اب دیکھتے ہیں آگے ولید ہاؤس میں کیا نیا ٹوٹس آنے والا ہے۔ ”تم میرے ہو کر رہو“ اور ”چاہت دل کی چاہت“ کے بعد ”اعتبار عشق“ میرا فوری ناول رہا۔ ”رگ جاں سے جو قریب تھے“ ابھی مکمل نہیں ہوا ناں؟ ”کبھی عشق ہو تو پتہ چلے“ ہائے واقعی، جب عشق ہوگا تو پتہ لگے گا بہت کچھ، ابھی تو ہم پڑھ کر سب پتہ لگاتے ہیں (ہاہاہا...) یہ ناول بھی دیر دیر سے منزل کی طرف گامزن ہے۔ ”سانس، سڑک اور سکوت“ اور انیم خان کے سلسلے وار ناول بھی زبردست رہے۔ ”میری عید تم ہو“ کی اشارتنگ بھی اچھی رہی اور اینڈ بھی۔ افسانے تقریباً سب ہی اچھے تھے۔ رڈا کی ڈائری سے سنگھار تک سب کچھ خاص الخاص رہا۔ آخر میں اس امید کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ میرا یہ خط بھی سندیسے کی زینت ضرور بنے گا، کیونکہ ”رڈا“ ہمارا ہے، ہمارے لئے ہی سجا ہے، تو کیسا سجا اور مہکا ہے، یہ بتانا بھی تو ہمارا فرض ہے نا جی..... یوں ہی سدا مہکتا رڈا ہمیں ملتا رہے۔ (آمین!)

فرزانہ عمر دراز..... کراچی

پُر خلوص اور شفیق صالحہ آبی! اینڈ رڈا اشاف السلام وعلیکم! خدا کی پاک ذات سے امید ہے کہ آپ سب بخیر ہوں گے، بہت عرصے بعد اس پیاری محفل میں شریک ہو رہے ہوں، یقین ہے آپ سب لوگ ناراض نہیں ہوں گے، اب آتی ہوں رڈا کی طرف، تو جی سرورق بہت اچھا لگا، گوشہ آگئی میں آپ کی باتیں ہمیشہ ہی دل کو بھاتی ہیں، روئے جنت کو پڑھ کر تو جو باتیں معلوم نہیں ہوتیں وہ بھی بہت اچھے طریقے سے سمجھ میں آ جاتی ہیں بلکہ پڑھتے ہوئے بہت مزہ آتا ہے۔ سلسلے وار ناول

میں مجھے آپ کا ناول ”رگ جاں سے جو قریب تھے“ بہت پسند ہے، اس کی ہر قسط پڑھ کر بے چینی ہو جاتی ہے (بھی اگلی قسط پڑھنے کی اور کیا) ناول جی! آپ کی کہانی بھی بہت زبردست چل رہی ہے، کچھ ماہ سے عاطف اور زہنب کا کردار بہت اچھا چل رہا ہے، یہ بات نہیں ہے کہ سارہ اور شیث کا اچھا نہیں چل رہا، بھئی! ان کا کردار تو اپنی مثال آپ ہے، انم خان اور شاز یہ جی! آپ کے ناول بھی بہت زبردست طریقے سے آگے بڑھ رہے ہیں، وہ ابھی پڑھ رہے ہیں، اس لیے ان پر ابھی تبصرہ نہیں کر سکتی، نیکسٹ منٹھ لازمی کروں گی، اس کے علاوہ مستقل سلسلے تو ہر ماہ کے بیٹھ ہوتے ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ بیٹھ ہی رہیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اب اجازت چاہتی ہوں، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ رڈا کو ہمیشہ ترقی اور کامیابی عطا فرمائے۔ (آمین!)

عانیہ نیازی..... ربوہ

السلام وعلیکم! سوئیٹ ایسا! کیسی ہیں آپ؟ ہو پ سو، آپ ٹھیک ہوں گی، بہت سی دعاؤں کے ساتھ سندیسے کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں، آبی! رڈا کا عید نمبر 2 بہت زبردست رہا، اس بار قمر و ش آبی میری فوریٹ رائٹرز میں سے ہیں اور ان کا مکمل ناول دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا، ہم نے دل جمعی سے پڑھنا اشارت کیا ہی تھا کہ اینڈ میں جا کر جاری ہے دیکھ کر دل اداں ہو گیا کہ اب پورا منٹھ ویٹ کرنا پڑے گا مابدولت کو۔ ”رگ جاں سے جو قریب تھے“ نہایت خوبصورتی سے آگے بڑھ رہا ہے، پلیز آبی! رڈا کے ساتھ کچھ بھی نرا مت کیجئے گا، ورنہ ہمیں بہت دکھ ہوگا، انم آبی! آپ نے علی آبان کے ساتھ اچھا نہیں کیا، اس کی اداں ہم سے نہیں دیکھی جاتی، ناول آبی! آپ کے ناول کے تو کیا کہنے، خاص کر شیث صاحب تو چھا گئے، اس بار کی قسط میں، اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے، انم نذیر کے ناول کا پی پی اینڈ بہت اچھا لگا، آخر کار رڈا والنون کی عید بھی ہو ہی گئی۔ افسانوں میں سب نے ہی اچھا لکھا

ویلڈن..... مستقل سلسلے رڈا کے ہمیشہ کی طرح نہایت خوبصورت اور معلوماتی تھے۔

نور بانو..... کوئٹہ

ڈیر آبی! قارئین اینڈ رڈا اشاف السلام وعلیکم! امید کرتی ہوں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ سب ٹھیک ٹھاک ہوں گے، پچھلے ماہ ہم غیر حاضر تھے، مگر اس ماہ اپنی تشریف آوری کے ساتھ رڈا کی محفل میں اپنا حصہ ڈالنے آگئے ہیں۔ سلسلے وار ناول بہت اچھا جا رہا ہے ”رگ جاں سے جو قریب تھے“ آبی! ونڈر فل، کتنا پیارا لکھتی ہیں آپ، اتنا خوبصورت سا بنا دیتی ہیں کہ سحر سا طاری ہو جاتا ہے، ”میری عید تم ہو“ انم نذیر نے اپنی پہلی تحریر سے ہی ہم سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی ہے، بہت اچھی کاوش تھی ان کی۔ ”سانس سڑک سکوت“ نہایت خوبی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ”اس دل میں بے ہوشم“ انم آبی! آپ کا ناول کچھ ست رونی کا شکار ہے، پلیز کہانی کو تیزی سے آگے بڑھا سکیں۔ ”بند قبا کھلنے لگی“ سعدیہ عابد نے اپنی پہلی ہی قسط سے چونکا دیا، اشارت اچھا لگا، یقیناً آگے بڑھ کر ناول حریہ ہماری توجہ کا مرکز رہے گا، رڈا کے مستقل سلسلے تو ہوتے ہی زبردست ہیں، رڈا میری تہائی دور کر دیتا ہے اور رڈا امیرا بہترین دوست ہے جو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے، بہت سی دعاؤں کے ساتھ اجازت، اگلے ماہ تک کے لیے۔

حناعلی..... سیالکوٹ

السلام وعلیکم آبی! تمام رڈا اشاف، تمام پڑھنے اور لکھنے والوں کو محبت بھر اسلام۔ رڈا اس ماہ کی 30 تاریخ کو ملا، ٹائٹل بہت پسند آیا، خاص کر ماڈل کی آنکھوں کا میک اپ بہت خوبصورت تھا، معمول کی طرح سب سے پہلے گوشہ آگئی میں آپ سے ملاقات ہوئی اور ان کی سحر انگیز باتیں ہمیشہ کی طرح دل میں اتر گئیں، پھر رڈا کے جنت سے دل کو منور کیا، اس کے بعد چپ لگا کر آبی کے ناول کی طرف بڑھے۔ آبی! ناول بہت تیزی سے آگے

بڑھ رہا ہے، میرے فوریٹ کردار رڈا اور ارج ہیں۔ شاز یہ جی! ”کبھی عشق ہو تو پتہ چلے“ کا عنوان ہمیں بے حد پسند ہے اور آپ کے ناول پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ ناول آبی! آپ کے ناول کے لیے تو ہمیں الفاظ نہیں ملتے، تعریف کے لیے، اشارت سے اب تک دلچسپی کا ہنوز وہی عالم ہے۔ آپ کا انداز تحریر اپنے اندر بھر پور گہرائی لیے ہوئے ہے جو ہم جیسے قارئین کو متوجہ کیے بغیر نہیں رہتا، اللہ کرے زور و کرم اور زیادہ۔ قمر و ش آبی! کافی ٹائم بعد آپ کی تحریر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پلیز جلدی سے کوئی سلسلے وار ناول لکھیں ناں آپ، ہمیں بہت پسند ہیں۔ افسانوں میں ویسے تو سب نے اچھا لکھا، مگر بیٹ عائشہ الیاس، سیدہ طوبی کے افسانے لگے کہ ان میں ایک فصاحت اور اخلاص کا پہلو تھا جس کی ہم سب کو ضرورت ہے۔ آخر میں اپنے ملک کے لیے اور آپ سب کے لیے بہت ہی دعاؤں کے ساتھ اجازت اللہ حافظ!

شفیق پروین..... کراچی

السلام وعلیکم! میرا نام شفیق پروین ہے، مجھے پڑھنے اور پڑھانے کا بہت شوق ہے، افسانے اور ناول اس وقت سے پڑھتی ہوں، جب سے میں نے اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھا ہے، شاید ناول لکھنے کا شوق بھی اسی وقت سے پیدا ہوا۔ آج میں خود پڑھاتی ہوں اور اتنے سالوں میں ناول لکھنے کی خواہش میرے دل میں جنون کی حد تک پہنچ چکی ہے، یہ کہنا میرے لیے غلط نہ ہوگا۔ ذہن کے پردے پر لکھی کہانیوں کو کاغذ میں اتارنے کے لیے کتنی بار قلم اٹھایا، لیکن بہت نے ساتھ نہیں دیا، آج بہت بہت کر کے پہلی بار ایک ناول تحریر کیا ہے، ممکن ہے اس میں بہت سی غلطیاں ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اگر میری غلطیاں قابل قبول ہوں تو برائے مہربانی میری تحریر کو اپنے ڈائجسٹ کی زینت بننے کا موقع دیں تاکہ میں دوبارہ وہ غلطیاں کرنے سے محتاط رہوں گی، کیونکہ اب میں ناول لکھتی رہوں گی۔ بہت سی دعاؤں

گوشہ چشم

نوربانو..... کوئٹہ
سوئٹ نوربانو! آپ کی غیر حاضری ہمیں محسوس تو
ہوئی، مگر آپ کی مصروفیت کا سوچ کر رہ گئے۔ قارئین کی
آراء تبصرے اور مشوروں سے ہی ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ
ان کو کیا پسند ہے اور وہ کیا پڑھنا چاہتے ہیں، اس لیے ہم
کہتے ہیں کہ سندسہ ضرور لکھیں، اپنا بہت خیال رکھیے گا۔
شفیق پروین..... کراچی
سوئٹ شفیق پروین! آپ کا سندسہ بعد آپ کی تحریر
ہمیں موصول ہوا، آپ کے افسانے کو ابھی ہم نے پڑھا
نہیں ہے، مگر پھر بھی کیوں کہ ہمارا وعدہ ہے کہ رڈا پڑھنے
لکھنے والوں کو ایک موقع ضرور دیتا ہے تو انشاء اللہ آپ کی
تحریر قریبی اشاعت میں شامل ہوگی اور اچھا لکھنے کے لیے
وسیع مطالعہ ضروری ہے۔ اس لیے آپ تمام راسخ کو
پڑھیں اور پھر اپنا لکھنے کا سفر جاری رکھیے۔
فاطمہ مقبول..... لہ
سوئٹ فاطمہ! آپ کی تحاریر ہمیں موصول ہوگئی
ہیں، مگر کچھ تاخیر سے، اس لیے اس ماہ تو نہیں، مگر قریبی
اشاعت میں ضرور ہم آپ کو شامل کریں گے، مگر ساتھ ہی
ہم آپ سے یہ بات بھی کہیں گے کہ اچھا لکھنے کے لیے
مطالعہ بہت ضروری ہے، جو قلم میں روانی اور لفظوں کے
چناؤ میں خوبصورتی بخشتا ہے، ہمیں امید ہے کہ آپ آئندہ
ہماری اس بات کو ذہن میں رکھ کر لکھا کریں گی۔
شاہین سجاد..... صوابی
سوئٹ شاہین! آپ کی تحاریر ہمیں موصول ہوگئی
ہیں، مگر کچھ تاخیر کے ساتھ۔ انشاء اللہ قریبی اشاعت میں
آپ شامل ہوں گی، اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

انعم نذیر..... ٹوبہ ٹیک سنگھ
سوئٹ انعم! آپ کا سندسہ اور نظم رڈا میں اس بار
شامل ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ آپ آگے بھی رڈا کا حصہ
بنی رہیں گی، اپنا خیال رکھیے گا۔
افشاں علی..... کراچی
سوئٹ افشاں! آپ کی محبتوں اور خلوص کا بے حد
شکریہ۔ آپ کا دوسرا ناول بھی ہمیں موصول ہو گیا ہے۔
انشاء اللہ قریبی اشاعت میں شامل ہوگا۔ بھرپور تبصرے
کے ساتھ آپ کی شرکت ہمیں بے حد اچھی لگی۔
تبسم فیاض..... کراچی
سوئٹ تبسم فیاض! آپ نے ہماری محنت کو سراہا،
آپ کے لیے بے حد شکریہ، یہ سب آپ سب کے تعاون
کا نتیجہ ہے کہ رڈا ہر دفعہ عزیز ہو گیا ہے، امید ہے آپ آگے
بھی ہمیں اپنی قیمتی آراء سے آگاہ کرتی رہیں گی۔
فرزانہ عمر دراز..... کراچی
سوئٹ اینڈ لوئی فرزانہ! آپ کا دعاؤں اور محبت کی
چاشنی سے بھر اسندسہ موصول ہوا اور ساتھ ہی آپ کا
ناول بھی۔ انشاء اللہ قریبی اشاعت میں شامل ہوگا۔
روشن ہاشم..... کراچی
سوئٹ روشن! کیسی ہیں آپ؟ بہت عرصے بعد آپ
کی آمد ہوئی جو کہ ہمیں بے حد اچھی لگی، امید ہے کہ آپ
آگے بھی اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ رڈا میں شامل
ہوں گی اور زندگی دکھوں اور خوشیوں کا امتزاج ہے۔ آپ
ہر پل خود کو معروف رکھا کریں، تنہائی سب سے بڑی
آداسی ہے، بہت سی دعائیں آپ کے لیے، اپنا بہت سا
خیال رکھیے گا۔

تیمور سے منگنی کروادی آپ نے اور ہمیں سب سے زیادہ
غصہ حمدان پر آ رہا تھا کہ وہ اتنی اچھی لڑکی کو کیوں نظر انداز
کر رہا ہے، صرف غربت کی وجہ سے، آپ! پلیز اریشما
اور حمدان کی شادی ضرور کروائیے گا، تیمور تو مجھے زہر لگتا
ہے، اریشما کو خاک پسند آتا ہے۔ ”میری عید تم ہو“ واہ!
انعم نذیر جی! کیا فلمی اسٹائل میں سہی اتنے عرصے بعد
آپ نے ذوالنون، زارہ کو آ خر ملوا ہی دیا، آپ کی پہلی
کاوش پر ہم آپ کو ڈھیروں مبارک باد پیش کرتے ہیں،
امید ہے آپ آگے بھی ہمارے لیے لکھنے کا سفر جاری
رکھیں گی۔ ”دلوں کے ملن“ قمرش آبی کا مکمل ناول جتنا
خوبصورت نام اتنا خوبصورت انداز تحریر، سید ابھاج عالم
کا بھرپور تحفظ بھرا ساتھ یقیناً انابیہ کے لیے خوش آئند
ہوگا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ”بند قبا کھلنے
لگی“ حنین کی خود سری ہمیں تو ایک آنکھ نہیں بھائی
سندسہ جی! ”سائنس سڑک سکوت“ میں شیٹ کا فیصلہ
ہمیں بھی اچھا لگا کیونکہ سارہ نے اس کے لیے سب کچھ
کیا ہے، اور اگر شیٹ اس کی خاطر جاب چھوڑ چکا ہے تو یہ
ان دونوں کے لیے اچھا ہے، مگر یہ کیا نالہ آپ! سارہ
کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ..... یقین کریں، میرے تو روٹھے
کھڑے ہو گئے تھے، میں خوش ہو رہی تھی کہ چلیں جی
اب تو سارہ کی ناز بھی پار لگنے کو ہے کہ اس کے ساتھ اس
حادثے نے ناول کو پھر ایک دلچسپ موڑ پر پہنچا دیا ہے،
دیکھیں اب آگے کیا ہوتا ہے۔ انعم آبی! پلیز کہانی کو
آگے بڑھائیے ناں، بہت ہی سلور فائر ہے۔ افسانے
اس بار سب کے سب بیٹ تھے، افسانہ لکھنا ویسے بھی
ایک مشکل کام ہے، کم لفظوں میں پوری حکایت بیان کرنا
اتنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ اوہ..... آپ! لکھنے لگی تو قلم
رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا، ایسے نہ ہو کہ طویل سندسہ
دیکھ کر آپ اسے رڈی کی ٹوکری کی نذر کر دیں، سو میں
اپنا قلم نہیں پر روکتی ہوں، اس امید اور یقین کے ساتھ
کہ آپ میرا سندسہ ضرور رڈا میں شامل کریں گی۔

☆ ☆ ☆

کے ساتھ اجازت۔
کوثر بانو..... لاہور
ڈیزر آپ! بہت عرصے بعد سندسہ کی محفل میں
شامل ہو رہی ہوں، مگر پڑھتی ہر ماہ تھی کہ اس کے بنا
لائف کچھ لڑکی کی لگتی تھی۔ میری دعا ہے کہ رڈا یوں
ہی دن و گنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے آمین! آپ! رڈا
میں شامل تمام ناول، ناولٹ اور افسانے میرے
فیورٹ ہیں، وجہ یہ ہے کہ ہر راسخ کا ایک اپنا منفرد انداز
ہوتا ہے لکھنے کا، جو کہیں نہ کہیں قاری کو ضرور متاثر کرتا
ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجھے رڈا میں شامل ہر تحریر دل سے
پسند آتی ہے اور رڈا کی ہر راسخ میری فیورٹ ہے، کیونکہ
وہ اپنے قیمتی نام سے ہمارے لیے نام نکال کر اتنا
خوبصورت لکھتی جو ہیں، آپ کو اور آپ کے ادارے کو
کامیاب عید نمبرز کی ڈھیروں مبارک باد! عید نمبر 1 اور
عید نمبر 2 دونوں ہی زبردست و بہترین تھے، قمرش کی
آمد کافی نام بعد ہوئی، مگر ایک خوبصورت انداز میں،
اوکے آپ! اب اجازت، اپنا خیال رکھیے گا۔
صباحر..... ہارون آباد
آداب آپ! خوش رہیں، شاد و آباد رہیں، میرے
سامنے خوبصورت اور جاذب نظر رڈا کا سرورق جگمگا رہا
ہے، فہرست پر ایک نظر ڈالتے گوشے آگہی کی طرف
آئے، جہاں صالحہ آپ کی میٹھی میٹھی نصیحت آموز باتیں
دل میں اتر گئیں۔ روئے جنت نے ہمیشہ کی طرح دل و
روح کو منور اور تر و تازہ کر دیا۔ اب بات ہو جائے کچھ
سلسلے وار ناولز کی، تو سب سے پہلے میں جس کی بات
کروں گی وہ ہے ”وہ جو رگ جاں سے قریب تھے“ کی،
تو آپ! ناول بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، بس
ہمیں صبا نامی سے ڈر رہا ہے کہ وہ نجانے کیا کریں رومی
کے ساتھ، بیسمنٹ میں تو بند کر ہی چکی ہیں، نجانے آگے
اور کیا کیا وہ رومی کے ساتھ کرتی ہیں، ہماری سب
بہر دیاں رومی کے ساتھ ہیں۔ ”کبھی عشق ہو تو پتہ چلے“
شازیہ آپ! اریشما کے ساتھ اچھا نہیں کیا آپ نے،

دوستوں کے نام پیغام

روشنی فاطمہ کے نام

مائی لولی اینڈ سوئیٹ روشنی فاطمہ! تمہارا شادی کا رڈ ہاتھوں میں ہے اور ذہن میں تمہارا معصوم سا چہرہ بار بار آ رہا ہے اور ساتھ ہی دل سے ڈھیروں دعائیں نکل رہی ہیں، ہماری دعا ہے کہ خدا تمہیں زندگی کی ڈھیروں خوشیاں عطا کرے اور تم یونہی سدا ہنستی مسکراتی اور آباد رہو، اپنے ہمسفر کے ساتھ۔

روشنی فاطمہ کے نام

قارئین! آپ سب کی پیاری اور ہر دلچیز رائٹر روشنی فاطمہ ستمبر کو پتا دیس سدھار گئیں، ادارہ ان کو اس نئے سفر پر بہت سی دعائیں پیش کرتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ سفر ان کے لیے پھولوں بھری رہ گزر ثابت ہوگا۔ روشنی! اپنا وعدہ یاد رکھیے گا کہ آپ رڈا کے ساتھ اپنا سفر آگے بھی جاری رکھیں گی۔

نورین ملک..... کراچی

سوئیٹ دوستوں کے نام

السلام علیکم! بہاروں اور پھولوں کی طرح مسکراتی رہو، اور جھرنوں کی طرح ٹھکھلاتی رہو، چونک گئی ناں کہ اتنی محبت سے کون تمہیں یاد کر رہا ہے؟ تو بھی! اٹ ازمی، یور اسمارٹ، کیوٹ اینڈ لولی فرینڈ، زرش! اور کون، اب حیرانی سے کھلے منہ بند کر لو، ار یہ اور مونا اور دیکھ لومیرا سر پرانز..... کیسے رڈا کے ذریعے تمہیں اگیزم میں A گریڈ لینے پر مبارکباد دے رہی ہوں۔ ہاں جی، اب یقین آیا کہ مابدولت صرف کہتے ہی نہیں کر کے بھی دکھاتے ہیں؟

سب سے منفرد انداز میں کیا ہے ناں وٹن تم دونوں کو؟

مدیریت، لاہور

پیاری دوست نایاب کے نام

اس کی سالگرہ پر ایک خوبصورت نظم

خوشی کا دن مبارک ہو

صبح جس دم میں جاگی ہوں

عجب منظر یہ دیکھا ہے

خوشی کا رقص ہے ہر سو

ہواؤں میں بسی ہے خوشبو

درختوں کے ہر پتے

خوشی سے لہلاتے ہیں

تویوں محسوس ہوتا ہے

یہ سب تالی بجاتے ہیں

پرندے چہچہاتے ہیں

یا شاید گنگناتے ہیں

کوئی تو بات ہے ایسی

ہر شے پر ہے یوں مستی

میرے دل میں ہوئی بلچل

مجھے کچھ یاد آیا ہے

کہ دن ہے یہ وہی شاید

چند سال پہلے جب

اسی دن کے کسی لمحے

جو تم دنیا میں آئی تھیں

یہ موسم اور ہوا میں سب

درختوں کے ہر پتے

پرندے اور فضا میں سب

خوشی سے کہہ رہے ہیں یہ
تمہیں یہ دن مبارک ہو
خوشی کا دن مبارک ہو
سالگرہ مبارک ہو

شاہین سجاد..... صوابی

شبانہ کے نام پیغام

السلام علیکم! سوئیٹ شبانہ سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، حیران نہ ہو، مائی ڈیز! میں تمہاری برتھ ڈے بھول سکتی ہوں کیا؟ پپی برتھ ڈے ٹو یو.....! میری ہزاروں دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، میری وٹن ہے اللہ پاک ہر سال تمہیں یہ دن دیکھنا نصیب کرے اور بہت سی خوشیاں عطا کرے آمین!

تمہاری سالگرہ پر دعا ہے ہماری

کہ روز مبارک ہزار آئے

تمہاری ہنستی ہوئی زندگی کی راہوں میں

ہزار پھول لٹائی ہوئی بہار آئے

احتم نذیر..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

زو ناش کے نام

مائی لولی اینڈ سوئیٹ جاؤ، زو ناش! آپ کو آپ کی پہلی سالگرہ پر بہت بہت پیار اور مبارکباد! خدا کرے کہ آپ ایسی ہزاروں سالگرہ مناؤ، اور خدا ہمیشہ تمہیں یونہی ہنستا، ٹھکھلاتا رکھے اور بلند نصیب کرے آمین!

رابعہ خیر..... سرگودھا

رڈا اشاف اور رائٹرز کے نام

بلاشبہ رڈا ایک مکمل اور جامع رسالہ ہے جس میں ہر ایک کی پسند اور نمیش کے حساب سے ناول، ناولٹ اور افسانے شامل ہوتے ہیں، میں دوستوں کے نام پیغام میں آپ سب کو بہت مبارکباد پیش کرتی ہوں، اتنا خوبصورت ماہنامہ نکالنے پر، اور رائٹرز کو اتنا اچھا لکھنے پر۔

ائم فروا..... کراچی

نورین آپی کے نام

مائی لولی آپی نورین کو سالگرہ کی ڈھیروں مبارکباد قبول ہو، دیکھیں آپی! سب سے ڈیفرنٹ اسٹائل سے آپ کو وٹن کیا ناں میں نے، آپ بھی یقیناً حیران ہوں گی، مگر دیکھ لیں اپنی نیل کا کارنامہ، آپ مجھے پیار سے نیل ہی کہتی ہیں ناں، پپی برتھ ڈے ٹو یو، اینڈ مئی مئی ریٹرن آف واڈے۔

نبیلہ ملک..... کراچی

بسمہ علی کے نام

السلام علیکم! ڈیز بسمہ! یقیناً تم ٹھیک ہو گی، دیکھو جناب ہو گئیں ناں حیران رڈا کے ذریعے آپ کو میں نے یاد کیا، اور آپ کو کمنگ عید کی بہت بہت مبارکباد، پلیزیار! سب ناراضی چھوڑ دو، فرینڈز میں تو سب چلتا ہے، اور دوستی کا اصول بھی یہی ہے کہ دوستوں کی غلطیوں کو درگزر کر دیا جائے، یار! پلیزی تم رابعہ کی بات کو بھول جاؤ، جو ہوا بس غصے میں ہو گیا، اب جانے بھی دو، اس لیے پلیزی پلیزی.....! عید پر تم میرے گھر ضرور آنا، پھر مل کر انجوائے کریں گے۔

کول علی..... سکھر

رائیل ظفر کے نام

مائی لولی سوئیٹ فرینڈ اینڈ کولیک کو میرا جانب سے شادی کی بہت بہت مبارکباد ہو، خدا کرے رائیل! کہ تمہارے لیے زندگی کا یہ نیا سفر ایک خوبصورت رو گزر ثابت ہو۔ 13 اکتوبر کو تم ہمیں چھوڑ کر اپنے پیتا کے سنگ اتنی دور لا ہو چلی جاؤ گی اور ہمیں بہت یاد آؤ گی، بہت اچھا نام گزرا تھا۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش اور آباد رکھے آمین!

شائندہ ملک..... کراچی

☆.....☆.....☆

ثریا اقبال



دیجی ٹیل اسپیکٹی

اجزاء

بند گوشت	250 گرام
گاجر	250 گرام
مٹر دانہ	250 گرام
تیل	آدھا کپ
کالی مرچ	2 کھانے کے چمچے (پسی ہوئی)
سفید زیرہ	50 گرام
ٹماٹر	4 عدد
لہسن۔ ادراک	2 کھانے کے چمچے (پسا ہوا)
گرم مصالحہ	1 کھانے کا چمچ
سرکہ	4 کھانے کے چمچے
اسپیکی	1 پیکٹ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب

☆ تمام ہری سبزیوں کو باریک کاٹ کر رکھ لیں۔

☆ ایک دیجی میں تیل گرم کریں اور تھوڑی سی کٹی ہوئی پیاز ڈال کر بگھار لیں اور پیاز لال ہونے پر سفید زیرہ، ادراک، لہسن پیسٹ، پسی کالی مرچ، گرم مصالحہ، نمک ڈال کر بھون لیں پھر اس میں دھک پانی ڈال کر مٹر دانہ ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر دم دیں تاکہ مٹر گل جائیں۔

☆ جیسے ہی دیجی میں پانی کم رہ جائے اور مٹر بھی گل جائیں تو اس دیجی میں تمام سبزیوں کو دھو کر ڈال دیں اور آنچ ہلکی کر کے دم پر چھوڑ دیں جب پانی خشک ہو جائے اور تیل الگ ہو جائے تو دیجی کو اتار لیں۔

☆ ایک دوسری دیجی میں پانی ابال لیں اور اس ابلتے پانی میں اسپیکٹی اور دو چائے کے چمچے نمک ڈال کر 8 منٹ تک ابال لیں ابلتے ہوئے اسپیکٹی پر سے ٹھنڈا پانی گزاریں اور تمام پانی پھر پھینک دیں۔

☆ اب اس اسپیکٹی کو سبزیوں کی دیجی میں ڈال کر مکس کر لیں اور ہلکی آنچ پر سبزیوں اور اسپیکٹی کو تھوڑا سا بھونیں پھر اس میں سرکہ شامل کر لیں۔

☆ لیجئے دیجی ٹیل اسپیکٹی تیار ہے۔ مزید ذائقے کے لئے چلی ساس ڈال کر نوش فرمائیں۔

لذیذ بند گوشت

اجزاء

بند گوشت	آدھا کپ
سفید زیرہ	1/4 چائے کا چمچ
ثابت مرچ	4 عدد
پیاز	1 عدد چھوٹی
نمک	حسب ضرورت

لہسن جوس

2 کھانے کے چمچ

ترکیب

☆ ایک ساس پن میں مکھن کو گرم کریں اس میں سفید زیرہ اور ثابت مرچوں کو ہلکا سا فرائی کریں۔

☆ اس مکھن میں کٹی ہوئی پیاز ڈال کر ہلکا سا فرائی کریں اور پھر بند گوشت بھی اور گاجر شامل کر دیں تین سے پانچ منٹ تک پکائیں۔

☆ آخر میں جوس اور نمک (اگر ضرورت ہو تو) شامل کر کے ایک منٹ پکا کر اتار لیں۔ گرم گرم پیش کریں۔

کھٹی ارووی

اجزاء

اروی	250 گرام
ہری مرچیں (لمبائی میں 2 عدد کاٹ لیں)	
ادراک (بایک کاٹ لیں) 2 ٹکڑے	
تل	1 کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن جوس	1 کھانے کا چمچ
گرم مصالحہ پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچ
تیل	فرائی کرنے کے لئے

ترکیب

☆ پکانے کے لئے لمبے سائز کی ارووی منتخب کریں انہیں ابال کر چھیل لیں اور ہر ارووی کے لمبائی میں 4 ٹکڑے کر لیں۔

☆ تیل گرم کریں اور اس میں ارووی کے ٹکڑوں کو ڈیپ فرائی کریں یہاں تک کہ وہ گولڈن اور کرسپی ہو جائیں۔

☆ ایک فرائی پن میں تھوڑا سا تیل ڈال کر گرم کریں اور اس میں ہری مرچ اور ادراک ڈال دیں۔

☆ تل کو پس کر اس میں لہسن جوس مکس کر کے پیسٹ بنالیں پھر اس میں پیسٹ کو فرائی پن میں ڈال کر اچھی طرح چلاتے ہوئے اس میں فرائی کی ہوئی ارووی ڈال دیں اور اچھی طرح مکس کریں تیار ہونے پر گرم مصالحہ چھڑک کر سرور کریں۔

کرپسی بینگن

اجزاء

بینگن	2 عدد
نمک	حسب ذائقہ
چاول پے ہوئے	2 چائے کے چمچے
آٹا	2 کھانے کے چمچے
سرخ مرچ پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچ
تھام	1/2 چائے کا چمچ
چاٹ مصالحہ	ذائقہ کے لئے
تیل	فرائی کرنے کے لئے

ترکیب

☆ بینگن کو گول سلائس کی شکل میں کاٹ لیں اور نمک لگا کر ایک طرف رکھ دیں۔

☆ تمام اشیاء کو اچھی طرح آپس میں مکس کر لیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر لپٹی بنالیں۔

☆ ایک فرائی پن میں تیل گرم کریں اور بینگن کے سلائس کو لپٹی میں اچھی طرح ڈبو کر فرائی کریں یہاں تک کہ گولڈن براؤن ہو جائیں۔

☆ چاٹ مصالحہ چھڑک کر سرور کریں کھانے والوں کو مزا آ جائے گا۔

☆☆☆☆

سنگھار

مساموں کو بند کرنے کے لئے

مکئی کا آٹا یا جو کا آٹا گرم پانی میں ملا کر لٹی
س اور کھلے ہوئے بڑے بڑے مساموں پر
ھے گھٹنے کے لئے لگا کر چھوڑ دیجئے پھر ٹھنڈے
پانی سے منہ دھولیں پھر عرق گلاب میں پھٹکری اور
انڈے کی سفیدی ملا کر کھلے اور بڑے مساموں پر
لگالیں تو وہ سکر کر بند ہو جائیں گے۔

بلیک ہیڈز کے لئے

پہلے چہرہ گرم پانی سے دھویئے پھر پندرہ منٹ
تک چہرے پر دودھ اسفنج کیجئے۔ روزانہ اس عمل
کے کرنے سے بلیک ہیڈز نکلتا بند ہو جاتے ہیں۔
ابن بھی بلیک ہیڈز کے خاتمے کے لئے بہترین
ثابت ہوتا ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ چار اونس پے
ہوئے بادام دو اونس گلسر لین سوپ اور ایک اونس
ملتان مٹی تھوڑے سے پانی میں حل کر کے محلول
بنالیں اور اسے چہرے پر آدھے گھنٹے کے لئے لگا
کر دھولیں بلیک ہیڈز کا خاتمہ ہو جائے گا۔

چہرے کے داغ دھبے

لیموں میں رنگت صاف کرنے کی خاصیت
ہوتی ہے اس لئے لیموں کا رس نکال کر روئی سے
چہرے کے داغ دھبوں پر لگا کر چھوڑ دیں اور جب

وہ خشک ہو جائے تو چہرہ دھولیں چند روز میں ہی چہرہ
داغ دھبوں سے صاف ہو جائے گا۔
کھانے کے چارچ کدو کش کی ہوئی مولی کے
لے لیں اور اس میں چند قطرے سرکہ ملا کر لٹی
بنالیں اور آدھے گھنٹے کے لئے چہرے پر لگانے
کے بعد منہ دھولیں داغ دھبے دور ہو جائیں گے۔
سخت قسم کے داغ دھبوں کے لئے بوریکس کے
سات دانے پانچ اونس لیموں کے رس میں ملا کر
رات کو سوتے وقت چہرے پر لگائیے اور صبح اٹھ کر
منہ دھولیں جلد داغ دھبوں سے پاک صاف
ہو جائے گا۔

دھوپ سے رنگت کی خرابی

تیز دھوپ ہو یا ہلکی اگر اس میں زیادہ دیر رہا
جائے تو چہرہ ہاتھ وغیرہ کی رنگت جل کر سیاہ ہو جاتی
ہے اس سے بچاؤ کے لئے یہ طریقہ اپنائیں۔
ایک گکڑی یا کھیرالے کر اسے چھیل لیجئے پھر کدو
کش کر لیں اور جو رس نکلے اس میں چائے کا نصف
چمچ گلسر لین اور اتنا ہی عرق گلاب ملا کر آمیزہ بنالیں
اس آمیزے کو دھوپ سے جلی یا سانولی رنگت پر
لگائیں آدھے گھنٹے کے لئے اور منہ دھولیں اس
سے چہرے کی رنگت نکھرتی ہے اور سیاہ داغ دھبے
بھی دور ہو جاتے ہیں کیونکہ اس آمیزے میں لیٹ

کی خاصیت بھی ہوتی ہے۔

خشک جلد کے لئے

نکھری سفید رنگت اچھی لگتی ہے اور جلد کی خشکی
دور ہونے سے رنگت بھی نکھرتی ہے اس کے لئے
مفید ٹونکے۔ لیموں کی ایک قاش ایک پیالی دودھ
میں بھگو دیجئے پھر اس دودھ کو آدھے سے ایک گھنٹے
کے اندر چھان کر چہرے پر لگائیے۔ جلد کی خشکی دور
ہو کر چہرے پر نکھار آ جائے گا۔ خشک جلد کو صابن
سے نہیں دھونا چاہئے۔ اسے کلینزنگ لوشن سے
صاف کرنا بہتر ہے اس سے جلد چمک اٹھتی ہے
کیونکہ اس کی خشکی دور ہو جاتی ہے۔

چہرے کی اسٹیمنگ

چکنی جلد والوں کو ہفتے میں دو بار بھاپ لینا
چاہئے جبکہ خشک جلد والوں کو ہفتے میں ایک بار
بھاپ لینا چاہئے۔ اس سے چہرے کا گرد و غبار
صاف ہوتا ہے اور مسام بھی چکنائی وغیرہ سے
صاف ہو کر چہرے کی جلد کو تازہ آکسیجن پہنچاتے
ہیں اس وجہ سے چہرے پر مہاسے نکلتا بھی بند
ہو جاتے ہیں مگر حساس اور نازک جلد کے لئے
بھاپ لینا مناسب نہیں۔

تروتازہ جلد کے لئے

اگر کسی پارٹی میں ایک دم جانا پڑ جائے اور آپ
اپنے چہرے کو نکھرا ہوا اور فریش بنانا چاہتی ہوں تو
ایک انڈے کی سفیدی کو خوب پھینٹ کر پندرہ
منٹ کے لئے چہرے پر لگا لیجئے جب وہ سوکھ جائے
تو گرم پانی سے چہرہ دھو ڈالیں آپ کے چہرے کی

جلد سکر جائے گی اور چہرے پر نکھار اور تروتازدگی
پیدا ہو جائے گی۔

آنکھوں کے نیچے کی جلد

آپ آنکھوں کے نیچے کی جلد کو چست اور ترو
تازہ بنانے کے لئے پینٹ برش سے آنکھوں کے
نیچے کے حصے پر انڈے کی سفیدی (پھینٹ کر)
لگالیں۔ جب وہ سوکھ جائے تو اس پر میک اپ
کر لیجئے آنکھوں کے نیچے کا حصہ یگ اور چمکدار
نظر آئے گا۔

پارٹی کے لئے خوبصورت چہرہ

اگر کسی خاص پارٹی کے لئے آپ اپنا چہرہ دکش
اور تھکن سے مبرا دیکھنا چاہتی ہیں اور آپ کے پاس
ٹائم بھی ہے تو اس بیونی پلان پر عمل کیجئے جو کہ دو
روزہ ہے۔

پہلے دن تو اپنے منہ کو دھونے کے بعد بھاپ
دیجئے پھر اسے نرم تولیے سے تھپتھا کر خشک کیجئے
پھر اس پر ایک چھندر کا رس ملیئے اور دس منٹ کے
لئے چھوڑ دیجئے۔ جب وہ سوکھ جائے تو اس پر
لیموں کا رس روئی سے لگائیے اور سوکھنے کے لئے
دس منٹ کے لئے چھوڑ دیجئے اس کے بعد چہرے
پر تازہ بالائی لگائیے اور ہاتھوں سے رگڑ کر منہ صاف
کیجئے تاکہ میل خوب نکل سکے۔ اب ٹھنڈے پانی
سے منہ دھو لیجئے۔

دوسرے دن منہ دھو کر چہرے پر کافور تیل پھر پانی
کی بھاپ دیں پھر چہرے پر گرم شہد کی تہہ چڑھا دیں
آدھا گھنٹے کے لئے۔ اس تہہ پر بالائی سے رگڑائی
کریں پھر ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں اس سے آپ

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ

آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ

لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

کی جلد ایک دم صاف ملائم اور چمکدار ہو جائے گی جس آئے گی۔
پرمیک اپ مزید نکھار پیدا کرے گا۔

چہرے کی سوکھی جلد

دھوپ میں چہرہ دیر تک کھلا رہنے سے اس کی جلد سوکھی سی ہو جاتی ہے بالکل چمڑے کی طرح۔ اس چہرے پر پگھلے ہوئے مکھن میں دودھ ملا کر لگانے سے جلد نرم پڑ جاتی ہے اور دلکش لگنے لگتی ہے اور اس پر مہاسے بھی نہیں نکلتے۔

چکنی جلد

چکنی جلد پر بلیک ہیڈز زیادہ پڑتے ہیں اور جراثیم کی بدولت سیاہ دھبے جلد پر چھوڑ دیتے ہیں۔ چکنی جلد کی صفائی کے لئے یہ طریقہ ہے۔

عرق اجمود، شہد، لیموں یا ادراک کا رس برابر مقدار میں لے کر آمیزہ بنالیں اور اسے چہرے پر بیس منٹ کے لئے لگا کر چھوڑ دیا کریں۔ اس سے جلد کی چکنائی کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد بھاپ دینے سے چکنی جلد کے مسام کھل جاتے ہیں اور بلیک ہیڈز وائٹ ہیڈز کو باہر نکال کر جلد کو اچھی طرح صاف کیا جاسکتا ہے۔

چکنی جلد کے لئے بہترین کلینزر ملتان میٹھی جو کا آنا اور بادام ہیں۔

کھلے مسامات

اگر چہرے پر بڑے اور کھلے مسامات ہوں تو پہلے گرم پانی میں تولیہ بھگو کر منہ پر پھیر پئے اس عمل کو تین بار کیجئے پھر برف کے ٹھنڈے پانی میں تولیہ بھگو کر چہرے پر دو تین بار پھیر پئے اس طرح جلد کے کھلے مسام بند ہو جائیں گے اور جلد تروتازہ نظر

مخلوط جلد

اگر آپ کی جلد مخلوط یا ملی جلی ہے کہ کہیں سے چکنی اور کہیں پر خشک تو چکنے اور خشک حصوں کا الگ الگ طریقے سے علاج کیجئے۔

چہرے کا رنگ روپ

آپ کے چہرے کا رنگ روپ آپ کی اصل شخصیت کی عکاسی کرتا ہے کہ آپ کیا کھاتی ہیں، کتنا سوتی ہیں اور کیسے احساسات رکھتی ہیں۔ اس لئے خود کو دلکش اور قابل احترام بنانے کے لئے اپنی غذا جذبات اور نیند کا خیال رکھیں۔

چہرے پر مچھلی کا تیل

مچھلی کا تیل داغ دھبوں کو دور کرتا ہے۔

چکنی جلد کے لئے ماسک

چکنی جلد کے لئے سب سے آسان اور سادہ ماسک انڈے کی سفیدی میں چند قطرے سرکہ یا لیموں کا رس ملانے سے بنتا ہے۔

خشک جلد کے لئے ماسک

خشک جلد کے لئے بہترین ماسک یہ ہے۔ انڈے کی زردی میں چند قطرے سرکہ اور چند قطرے روغن بادام یا مونگ پھلی کا تیل یا زیتون کا تیل ملا لیں پھر اس میں وٹامن E کا کپسول توڑ کر اس کا سفوف بھی شامل کر لیں اس ماسک کو چہرے پر آدھا گھنٹے لگا کر چہرہ دھولیں۔ جلد پر خوبصورت سا نکھار آ جائے گا۔

☆☆☆☆☆